بانی
سہام مرزا

ماہنامہ دوشیزہ کراچی

مدیر اعلیٰ ـــــــ منزہ سہام
مدیر ـــــــ زین ہاشمی
مدیر اعزازی ـــــــ رضوانہ پرنس
قانونی مشیر ـــــــ جی ایم بھٹو (ایڈووکیٹ ہائی کورٹ)
اکم ٹیکس ایڈوائزر ـــــــ مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹ)

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

خط و کتابت کا پتا
88-C II ـ فرسٹ فلور ـ خیابان
جامی کمرشل ـ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی ـ فیز 7 ـ کراچی
فون نمبر: 021-35893121 - 35893122
ای میل: pearlpublications@hotmail.com

مئی 2016ء
جلد:44 ☆ شمارہ:05
قیمت:60 روپے

☆ منیجر سرکولیشن: محمد اقبال زمان ☆ عکاس: موسیٰ رضا / مرزا محمد یاسر

باتیں ملاقاتیں

سلسلے وار ناول

مکمل ناول

ناولٹ

ناولٹ

افسانے

رنگ کائنات

دوشیزہ میگزین

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)......890 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ......5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا......6000 روپے

پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بٹی OB-7 ناپور روڈ۔ کراچی

Phone : 021-35893121 - 35893122

Email : pearlpublications@hotmail.com

ماہنامہ دوشیزہ کراچی ڈائجسٹ میں اشتہار کیوں دیا جائے؟

▶ ...... پاکستان کا یہ واحد رسالہ ہے، جس کا گزشتہ چوالیس (44) برس سے چار نسلیں مسلسل مطالعہ کر رہی ہیں۔

▶ ...... اِس لیے کہ جریدے میں شائع ہونے والے اشتہارات پر قارئین بھرپور اعتماد کرتے ہیں۔

▶ ...... اِس میں غیر معیاری اشتہار شائع نہیں کیے جاتے۔

▶ ...... پوری دنیا میں پھیلے اِس کے لاکھوں قارئین متوسط اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، جو مستند اور معیاری مصنوعات کی خریداری کو ترجیح دیتے ہیں۔

▶ ...... اِس لیے کہ دوشیزہ ڈائجسٹ کو گھر کا ہر فرد یکساں دلچسپی سے پڑھتا ہے۔

▶ ...... جریدے کے ہر شمارے کو قارئین سنبھال کر رکھتے ہیں۔

▶ ...... اِس جریدے کے بڑی تعداد میں مستقل خریدار ہیں، جو اندرون اور بیرون ملک پھیلے ہوئے ہیں۔

▶ ...... آپ کی مصنوعات کے اشتہار باکفایت اُن تک پہنچ سکتے ہیں۔

▶ ...... جریدے کی اعلیٰ معیار کی چھپائی آپ کے اشتہار کی خوب صورتی میں اضافہ کرتی ہے۔

شعبہ اشتہارات: دوشیزہ

88-C II فرسٹ فلور۔ خیابان جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7 کراچی

فون نمبر: 021-35893121 - 35893122

''آدھے ادھورے''

آدھے ادھورے فیصلے، جملے، لوگ سب بہت تکلیف دیتے ہیں یہ بات وہ لوگ بہتر سمجھ سکتے ہیں جو ہر لحاظ سے مکمل ہوں۔ کاش یہ بات ہمارا الیکٹرونک میڈیا بھی سمجھ پاتا۔ سیاست دانوں کے بخیے اُدھیڑتے ادھیڑتے وہ اس کھیل کے اتنے عادی ہوگئے کہ اب بربادی اور تباہی لانے والی بے سروپا افواہوں کو بھی خبروں کا درجہ دیا جاتا ہے۔

لوگوں کی ذاتی زندگی کو قبیح انداز میں ٹی وی اسکرین پر لاکر اُن کو تماشہ بنانا کسی طور بھی مناسب نہیں۔ پھر وہ لوگ جو دُنیا کے کونے کونے میں جا کر پاکستان کی نمائندگی کرتے ہیں ان کے بارے میں نیگیٹو خبریں پھیلاتے سے ملک اور قوم کا بھی نقصان ہوتا ہے۔ ہماری کرکٹ ٹیم بھی شاید اسی لیے روبہ زوال ہے اُن کی کارکردگی سے زیادہ اُن کی ذاتی زندگی پر سوالات اٹھائے جاتے ہیں اور پھر ہر چینل ایسی خبروں کو اپنا قومی فرض جان کر صبح شام چلانا شروع کر دیتا ہے...... کسی کی ذاتی زندگی میں نقب لگانا غلط ہے اُن کی خراب کارکردگی پر ضرور سوال اٹھانا چاہیے مگر اصلاحی پہلو کو مدنظر رکھنا بہت ضروری ہے......

ویسے بھی پاناما لیکس کے دھماکے دار انکشافات کے بعد تو شاید ہی کوئی پاکستان میں ایسا بچا ہو جو آرٹیکل 62 اور 63 پر پورا اترتا ہو...... سوائے غریب عوام کے...... لہٰذا میڈیا کو اس آدھے ادھورے کھیل سے باہر آنا چاہیے۔ کیونکہ آدھے ادھوروں کو مملکت خداداد میں تو ووٹ کا حق بھی حاصل نہیں۔

منزہ سہام

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کردینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کردیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جارہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔ مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آیئے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

دوشیزہ کی محفل

محبتوں کا طلسم کدہ' خوب صورت
رابطوں کی دلفریب محفل

دوشیزہ کی اس جگمگاتی اور روشن محفل میں آپ سب کا خیر مقدم ہے۔ گرمی اپنے جوبن پر ہے اور جب میں یہ سطریں لکھ رہی ہوں تب نظروں کے سامنے ٹی وی اسکرین بھی روشن ہے۔ جس پر طرح طرح کے سیاست دان آ کر اپنی مزاحیہ باتوں سے گرمی کی شدت میں مزید اضافے کا باعث بن رہے ہیں۔ لیکن ایک بات ضرور ہے ہمارے یہ سیاست دان بہت اچھی تفریح مہیا کرتے ہیں ان کو دیکھتے ہی کم از کم میرا غصہ کافور ہو جاتا ہے۔ پاکستان کی ترقی، عوام کی خدمت جیسے خیالات سن کر شیخ چلی کے لطیفے یاد آنے لگتے ہیں جو میں بہت شوق سے پڑھا کرتی تھی۔ کیا پتہ تھا جاگتی آنکھوں سے کئی شیخ چلیوں کا نظارہ ہوگا۔ بہر حال یہ سب تو اب ہماری اور آپ کی زندگیوں کا لازمی جزو ہے۔ تو اس حقیقت کو قبول کر کے خوش رہنے میں ہی سب کی بھلائی ہے۔ جلنے کڑھنے کا کیا فائدہ...... چلیے اب چلتے ہیں پہلے خط کی طرف

✉: طویل مدت کے بعد لندن سے تشریف لائی ہیں سعدیہ شیخ صاحبہ فرماتی ہیں۔ ڈیئر منزہ سہام! آپ سے بات چیت تو رہتی ہے مگر خط کے ذریعے محفل میں بہت عرصے کے بعد شرکت کر رہی ہوں۔ وجہ وہی کچھ مصروفیات اور کچھ دوشیزہ کا پابندی سے نہ ملنا تھا مگر اب میں نے دوشیزہ گھر پر لگوا لیا ہے لہٰذا محفل میں حاضر ہو رہی ہوں۔ افسانے، ناول اور ناولٹ سب بہت اچھے لگے باتیں ملاقاتیں کا جو سلسلہ ہے وہ مجھے بہت پسند ہے اور اب تو کافی عرصے سے بڑے زبردست اور مشہور لوگ نظر آ رہے ہیں۔ ہم تو یہاں لندن میں بیٹھے ہیں مگر پاکستان میں سب کے بارے میں جاننا بہت اچھا لگتا ہے۔ چٹ پٹی خبریں واقعی میں بہت چٹ پٹی ہوتی ہیں۔ یہاں خاص طور سے رفعت سراج اور نفیسہ سعید کی تحریر کے بارے میں لکھوں گی کہ کیا بات ہے۔ اللہ کرے زور قلم ہو اور زیادہ...... مینا تاج کا افسانہ بھی اچھا تھا۔ فرزانہ آغا تو ہمیشہ سے ہی بہت پسند ہیں۔ آپ لوگوں کی تصاویر اکثر دیکھتی ہوں سب بہت اچھے لگتے ہیں خوش باش...... نئے لہجے نئی آوازیں میں بھی بہت اچھی شاعری چھپتی ہے۔ منزہ میں جلد چند افسانے اور سچی کہانیاں ارسال کروں گی۔ دیکھ لیجیے گا اچھی لگیں تو شائع کر دیں مجھے خوشی ہوگی۔ منزہ آپ نے لکھنا کیوں چھوڑ دیا، لکھا کریں۔ آپ کی کتاب' کانچ کی عورت' میرے پاس ہے مجھے آپ کا

اندازِ تحریر بہت منفرد اور سچا لگتا ہے حالانکہ آپ کی شخصیت بہت سوئٹ سی ہے مگر تحریر بہت پختہ ہے۔اچھا منزہ جی اب اجازت دیں اگلے ماہ پھر حاضری لگاؤں گی۔

جواب: بہت ہی اچھی سعدیہ میں تو آپ کے خط کے جواب میں یہی کہوں گی کہ کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے...... بہت دنوں بعد آئیں مگر بہت اچھے تبصرے کے ساتھ...... وقت نکالا کریں دوشیزہ کی محفل میں سب اکٹھے ہوتے ہیں تو بہت مزہ آتا ہے۔ دوشیزہ سے جڑے تمام لوگ بالکل ایک خاندان کی مانند ہیں رابطے ٹوٹ جاتے ہیں تو بڑی شدت سے کمی محسوس ہوتی ہے۔ آپ بھی لکھتی رہیے اور میں بھی کوشش کروں گی کہ جلد ہی ایک اچھا سا افسانہ لکھ ڈالوں۔ آپ کی تحریر کا انتظار ہے۔

✉: یہ روشن اور گلابی سی آمد کسی اور کی نہیں بلکہ کراچی سے ہم سب کی پسندیدہ شگفتہ شفیق کی ہے، لکھتی ہیں۔ اصولاً اِس خط میں ہم کو دوشیزہ پر تبصرہ کرنا چاہیے کہ ماشاء اللہ اب ہر شمارہ پہلے سے بھی بہترین کی طرف گامزن ہے۔ چاہے وہ ناول ہوں یا افسانے۔ یا پھر محفل، ہر طرف منزہ خود دیکھ رہی ہیں اور جب مالی اپنے چمن کی اتنی دیکھ بھال کرتا ہے تو پھولوں کو کھلنے سے کون روک سکتا ہے سو دوشیزہ ماشاء اللہ اپنے جوبن پر ہے اور خوب بہار چھائی ہے اُس پر، حسبِ معمول دوشیزہ بہت خوب رہا۔ بہت مبارک باد پری۔ ہماری دوست منزہ سہام کی ہزار ہا خوبیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بہت کیئرنگ ہے اور اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلتی ہیں۔ سہام مرزا صاحب بے حد وضع دار اور رکھ رکھاؤ والے تھے۔ منزہ اُن کی ہی بیٹی ہے۔ اپنے والد کے رفقاء کی تعظیم کرنا اُن کو عزت دینا اور پیار کرنا اُن کا شیوہ ہے۔ ایک دن ہمارے پاس منزہ کا فون آیا کہ جناب **21** مارچ کو آپ کلینڈر پر مارک کرلیں۔ آپ میرے پاس اتوار کو ہیں ہوٹل **Moven Pick** میں کہ میں نیلوفر عباسی جی جو کہ امریکہ سے تشریف لائی ہوئی ہیں کہ اعزاز میں ایک ہائی ٹی ارینج کر رہی ہوں۔ سچ منزہ کو ناں کہیں یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ سو بیٹے کو راضی کیا کہ وہ بھی اُس دن اپنے دوستوں کے ساتھ بزی تھے۔ یہ ہمارا شوق ہے کہ ہم پھول ضرور لیتے ہیں۔ پھول لینا اور دینا ہماری بہترین ہابی ہے۔ تو پھول لیتے ہوئے چلے۔ ہوٹل پہنچے تو ہمارے دنیائے ادب کی کئی حسینائیں اور میزبان وہاں پہلے سے براجمان تھیں۔ اور مزید بہت لوگوں کا انتظار تھا۔ منزہ سے گلے ملے تو یاد آیا کہ اپنا اسپیشل خسین دیکے، تو ہم گاڑی میں ہی چھوڑ آئے ہیں تو فرخ کو فون کیا کہ پلیز اگر ممکن ہو تو ہم کو لا دیں۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بزی تھا لیکن میرے پیارے بیٹے نے ماں کو مایوس نہ کیا اور یوں پھول اپنے حقدار کے ہاتھ میں پہنچے۔ منزہ پنک شرٹ اور لائٹ گرین دوپٹے کے ساتھ بے حد حسین لگ رہی تھیں جس کی گواہی تصاویر دیں گی۔ باقی مہمانوں میں عابدہ رؤف جی، رفعت سراج جی، سیما مناف، رضوانہ پرنس، سکینہ فرخ، شائستہ عزیز، عقیلہ حق، صبیحہ شاہ، غزالہ رشید، سنبل، نسیم آمنہ، نگہت اعظمی، حمیرا راحت، سیما رضا ردا اور نیلوفر عباسی جی اور اُن کی بہن درشہوار شامل تھے۔ مجھے ایسا لگا کہ باقی فائیو اسٹار ہوٹلوں کے مقابلے میں **Moven Pick** کی ہائی ٹی بہترین ہے ہر لحاظ سے، بیٹھنے کی جگہ بھی بہت خوبصورت ہے اور اُن کا مینیو بھی۔ جب کھانے کا دور دورہ ذرا کم ہوا تو پھر نیلوفر عباسی جی نے (جو کہ میری فیوٹ اسٹار ہیں میں اُن کی بہت بڑی فین ہوں اور اسی طرح قمر علی عباسی میرے

دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

اپریل 2016 کا نتیجہ: قارئین نے مندرجہ ذیل تحریر کو پسند کیا ہے

یہ زخم خنجر کے نہیں — فرزانہ آغا

کباڑی کی جورو — مینا تاج

آپ کی نظر میں اس ماہ ''دوشیزہ'' کی بہترین تحریر کون سی ہے؟

دوشیزہ — مئی 2016

عنوان: ______

قلم کار: ______

نام: ______

پتا: ______

ماہنامہ دوشیزہ کراچی

پسندیدہ رائٹر ہیں) اپنی یادوں کی پٹاری کھولی اور سب کے اصرار پر بے شمار باتیں شیئر کیں کہ کس طرح اُن کی سہام مرزا صاحب سے انڈر اسٹینڈنگ شروع ہوئی تھی اور سہام مرزا کس قدر مہربان تھے۔ نیلوفر عباسی جی بے حد مربوط و دل نشین انداز میں باتیں سنا رہی تھیں کہ اُن کی یادداشتوں نے محفل کا رنگ دوبالا کر دیا۔ ساتھ ہی ہم سہام مرزا صاحب کی عظمتوں کے مزید معترف ہو گئے۔ تب منزہ بچی ہوا کرتی تھیں اور آج سہام مرزا کی جگہ وہ اردو ادب کے فروغ میں آگے آگے ہیں اور بڑی بھاری ذمہ داریاں اپنے بیٹوں کے ساتھ مل کے خوش اسلوبی سے نبھا رہی ہیں۔ 21 مارچ کی یہ خوبصورت شام اپنی تمام تر رنگینیوں کے ساتھ یادگار ٹھہری۔ منزہ آپ کو بے حد مبارک باد کہ ایک اور کامیاب پروگرام آپ کے کریڈٹ پر آیا۔ اللہ آپ کو بہت ہمت اور حوصلہ دے کہ آپ اسی طرح اردو ادب کی شمع کو روشن رکھیں (آمین)۔

ﮬ: بہت ہی پیاری شگفتہ آپ کی محبتوں کی تو میں قرض دار ہو گئی ہوں۔ اتنی محبت سے خط لکھا پھر گھر پر ڈراپ بھی کیا...... اللہ کرے دوشیزہ سے آپ کی محبت اسی طرح قائم رہے۔

✉: کراچی سے تشریف لائی ہیں مسز نگہت غفار کہتی ہیں، بہت پیاری سی منزہ جیتی رہو، سلامت رہو، شاد و آباد رہو (آمین) اس ماہ کا دوشیزہ منگوا نہ سکی لہٰذا بغیر تبصرے کے خط لکھ رہی ہوں اس میں تھوڑی اُن افسانوں کے بارے میں لکھوں گی جواب تک پوسٹ کر چکی ہوں۔ پچھلے سال اور اسی سال، رنگ زندگی 2015ء مئی میں، سزا 2015ء جولائی میں، ایسا بھی ہوتا ہے 2015ء ستمبر میں اور اب آپ میرا پاگل پن دیکھیں کہ لگا تار ڈالتی رہی ...... انتظار ...... انتظار اور صرف انتظار...... اب دیکھیں 2016ء اپریل میں پھر بہاریں میرے دامن میں حاضر کر رہی ہوں۔ دیکھیں جی منزہ بی بی ...... اب تو آپ کو ...... ماننا پڑے گا کہ نگہت باجی تو ...... بس ...... پیچھا نہیں چھوڑ رہی ہیں۔ چلیں جی ...... اب آپ جو چاہیں کہہ لیجیے ہم نے آپ سے کہا ہے کہ بھیج رہے ہیں تو بھیج رہے ہیں آگے اللہ مالک ہے۔ ایک نظم بھی ارسال کر رہی ہوں۔ اور ہاں آپ یوں کیجیے کہ اس کو عید کے موقع پر شائع کر دیں۔ ویسے آپ کی مرضی، اجازت جانے سے پہلے رخسانہ جی کو آپ کو آپ کی فیملی کو سب کو دوشیزہ فیملی کو جس بچی سے بات ہوتی ہے اُس کا نام بھول گئی ہوں اُن کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمتوں اور برکتوں کے سائے میں رکھے اپنی حفظ وامان میں رکھے (آمین)

ﮬ: نگہت جی مجھے تو ایسے لوگ بہت اچھے لگتے ہیں جو پیچھا نہیں چھوڑتے، آپ سے فون پر بات ہوئی تھی آپ کا ایک افسانہ اس شمارے میں موجود ہے۔ باقی بھی پڑھوں گی اور آپ کو مطلع کروں گی انشاء اللہ...... محفل میں پابندی سے آیا کریں اچھا لگتا ہے۔

✉: ہوشیار، خبردار دوشیزہ کی محفل کی شہزادی خولہ عرفان تشریف لا رہی ہیں، لکھتی ہیں اللہ تعالیٰ آپ کو اور رسالے کو دن دگنی رات چوگنی، صحت و ترقی عطا فرمائے آمین۔ منزہ آپ کی آمد سے ایک خوشگوار تبدیلی یہ آئی ہے کہ دوشیزہ جو آدھا مہینہ گزرنے کے بعد بھی بدقت بک اسٹالز پر دستیاب ہوتا تھا اب پہلا عشرہ اختتام پذیر ہوتے ہی جلوہ افروز ہو جاتا ہے اور جو تبصرہ ہم بچوں کی طرح پرچے سے ایک دن پہلے تیاری کرنے والی صورت میں جلد از جلد خط پوسٹ ہو جانے کے چکر میں لشتم پشتم تحریر کرتے تھے۔ اب لائق بچوں کی طرح اطمینان سے رسالے کی ورق گردانی کرنے کے بعد تحریر کرتے ہیں۔

اٹھائیسواں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ
وہ تقریب جس کا انتظار کیا جاتا ہے۔
وہ تقریب جس میں ملک بھر سے قلم کاروں کا
کارواں، اپنے محبت کرنے والوں کے روبرو
ہوتا ہے۔
قلم کاروں کے قلم کا حق ادا کرنے کی ایک ادنیٰ
سی کوشش۔
بہت جلد......
اٹھائیسویں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی تقریب
اپنے روایتی رنگ میں جلوہ گر ہوگی۔
"بس تھوڑا سا انتظار......"

رسالے کا سرورق دیکھ کر مشرقی عورت کی سادگی و معصومیت کا سا گمان گزرا پھر آپ کے اداریے نے اُس پر مہر ثبت کردی۔ آپ جیسے حقیقت شناس لوگ جانتے ہیں کہ آج ایک عام انسان کی زندگی کس قدر مسائل کا شکار ہے لیکن یہ بات بھی زخموں پر مرہم کا کام کرتی ہے کہ کچھ لوگ ان تکالیف کو محسوس کرنے والے ہیں جو اِن سے صرف نظر نہیں کرتے اور حکامِ بالا کو اُن کی بے حسی سے وقتاً فوقتاً آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ آپ جیسے جہاد با تعلیم کرنے والوں کو سلام ہے منزہ۔ اب محفل میں قدم رنجا فرماتی ہوں تو جناب عالی آپ سرپرائز بھی دیتی ہیں۔ تبصرہ کے جواب میں تحریر کرتی ہیں کہ امید پر دنیا قائم ہے اور ساتھ ہی نظم بھی شائع کردیتی ہیں۔ ویسے ایسے سرپرائز خوشیوں کا لیول بڑھا دیتے ہیں جزاک اللہ! میکال حسن اور ماورا حسین کے بارے میں معلوماتی فیچر اچھا تھا۔ اسماء اعوان کا لائف بوائے چٹکار دکھائے میں ایک بات کہنا چاہوں گی کہ اُن کو نت نئی کہانیاں بنانے میں ملکہ حاصل ہے۔ لیکن ہندی الفاظ سے ہمیں جدی پشتی بیر ہے مانا کہ اردو لشکری زبان ہے اور اپنے اندر بے پناہ وسعت رکھتی ہے مگر ہماری وسیع النظری وسیع القلبی، ہندی الفاظ دیکھتے ہی تنگ نظری اور تنگ دلی کا شکار ہوجاتی ہے اور چٹکار کا لفظ ہمیں کاٹنے کو دوڑنے لگتا ہے۔ معافی کے ساتھ۔ رفعت سراج جو جذبوں کی حسین الفاظ سے ترجمانی کرتی ہیں اپنے دامِ دل میں جملوں کی بے ساختگی کے ساتھ ثمر کے جذبوں کی بھرپور عکاسی کررہی ہیں۔ نگہت اعظمی کا ذرا سی بات بھی ہماری بظاہر معمولی باتوں کے سبب غیر محسوس طریقے سے ہونے والی بڑی تکلیفوں پر مبنی اچھی تحریر تھی۔ ام مریم کا رحمٰن رحیم سدا سائیں میں کہانی دلچسپ صورتحال اختیار کیے ہوئے ہے۔ دیکھیں امن کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ نزہت جبیں ضیاء کا 'میرے درد کی جو دوا ملے' اور مینا تاج کا 'کباڑی کی جورو' دونوں اچھی تحریریں تھیں۔ نفیسہ سعید کا 'جنت حوا' میں دو تین گھرانوں کی کہانیاں ایک ہی نقطہ نظر لیے مختلف پسِ منظر میں آگے بڑھ رہی ہیں۔ کہیں مرد کی بے حسی ہے تو کہیں عورت کی سطحی سوچ، لیکن وہ لوگ جو جھوٹ کو سچ اور بدی کو نیکی پر اپنی چرب زبانی کے سبب غالب کردیتے ہیں ان کا انجام بڑا بھیانک ہوتا ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ماریہ یاسر کا موسم محبتوں کا اچھی تحریر تھی۔ لیکن موضوع کی مناسبت سے جذبات نگاری کہیں کہیں الفاظ اور احساسات کے مابین ہم آہنگی کی چغلی کھاتی نظر آئی۔ سباس گل کا مکمل ناول ہیپی اینڈنگ کے ساتھ حسب توقع اختتام پذیر ہوا۔ روحیلہ خان کا افسانہ قربانی و خون اور نسیم سکینہ صدف کا سفینۂ زیست ڈوب گیا بھی مناسب تحریر تھی۔ موضوع و کہانی کے اعتبار سے اندازِ بیاں اتنا جاندار محسوس نہیں ہوا جتنا کہ اس کی ڈیمانڈ تھی۔ مہتاب خان کا افسانہ محبت ایک روگ بھی اچھی کاوش تھی۔ پلکوں پر ٹھہرے خواب میں حبیبہ عمیر سے کہیں کہ کہانی میں جمود سا محسوس ہوا ہے اس دفعہ، امید ہے آئندہ قسط میں کچھ دلچسپ تبدیلی آجائے گی۔ چلتے ہو تو شاپنگ کو چلیے ڈاکٹر اقبال ہاشمانی کا ہمیشہ کی طرح معاشرتی برائیوں کو ہنستے کھیلتے عکاسی کرجاتے ہیں۔ دوشیزہ گلستان میں اسماء اعوان نے اقوال، حکایات کا عمدہ کلیکشن کیا۔ پڑھ کر ذہن ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ نئے لہجے نئی آوازیں میں عائشہ شفقت کی چھوٹی سی غزل سمندر کی گہرائی لیے بہت اچھی لگی۔ کچن کارنر کی ریسپیز پڑھنے کے بعد احساس ہوا کہ جو سلسلہ آپ کے اداریے اور محفل میں حاضری سے شروع ہوا تھا وہ مختلف افسانوں اور

دنیا میں کس جگہ
دوشیزہ
کے چرچے نہیں
آپ دوشیزہ کے خریدار بنیں کو ملک کو
زرِ مبادلہ بھیجیے
اندرون ملک =/890 روپے
ہر ملک، ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے
زرسالانہ
کویت 55 امریکی ڈالرز
ایران 55 امریکی ڈالرز
سعودی عرب 55 امریکی ڈالرز
سری لنکا 55 امریکی ڈالرز
یو اے ای 55 امریکی ڈالرز
جاپان 55 امریکی ڈالرز
مصر 55 امریکی ڈالرز
لیبیا 55 امریکی ڈالرز
یونان 55 امریکی ڈالرز
ڈنمارک 55 امریکی ڈالرز
فرانس 55 امریکی ڈالرز
جرمنی 55 امریکی ڈالرز
برطانیہ 55 امریکی ڈالرز
ہالینڈ 55 امریکی ڈالرز
ناروے 55 امریکی ڈالرز
پولینڈ 55 امریکی ڈالرز
امریکہ 65 امریکی ڈالرز
کینیڈا 65 امریکی ڈالرز
افریقہ 65 امریکی ڈالرز
آسٹریلیا 65 امریکی ڈالرز
آج ہی رابطہ کیجیے
88-C II ۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز۔7، کراچی
فون نمبر 021-35893121 - 35893122

ناولوں سے آگے بڑھتا بڑھتا ڈاکٹر اقبال ہاشمانی کے ساتھ چلتے ہو تو شاپنگ کو چلیے سے محظوظ ہوتے ہوئے شعر و شاعری اور حکایات و فرمودات سے مستفید ہونے کے بعد آخر میں کچن کارنر کے کھانے پر اختتام پذیر حسب دستور دعوت کا بھرپور لطف دے گیا۔ منزہ ایک نظم اور ارسال کر رہی ہوں اس طویل تبصرہ کے ساتھ اب اجازت چاہوں گی آپ دوشیزہ اور اراکین دوشیزہ کے لیے ہر پل بہتر سے بہترین اور خوب سے خوب تر کی طرف گامزن رہنے کے لیے دعا گو۔

ھ: پیاری سی خولہ تمہارے خط کا تو مجھے انتظار رہتا ہے بہت پابندی اور مکمل تبصرے کے ساتھ محفل میں شرکت کرتی ہو کہ دل خوش ہو جاتا ہے۔ مجھے وہ لوگ بہت اچھے لگتے ہیں جو محبت سے محفل میں شریک ہوتے ہیں۔ کہنا نہیں پڑتا...... تمہاری یہی ادا تمہیں بہت منفرد رکھتی ہے۔ اب ہماری ملاقات ہونی چاہیے۔ تم آفس آؤ تمہیں اچھی سی چائے پلاؤں گی۔

✉: کراچی سے بھرپور تبصرے کے ساتھ آمد ہوئی ہے روبینہ شاہین صاحبہ کی، لکھتی ہیں۔ ایک طویل غیر حاضری کے بعد دعاؤں کے ساتھ حاضر ہوں خدا تعالیٰ وطن اور اہل وطن کو اپنے حفظ و امان میں رکھے (آمین) اس ماہ کا شمارہ ملا سرورق کچھ زیادہ ہی فیئر ہے۔ لیکن **Lovely** ہرگز نہیں ہے۔ محفل میں قلمی ملاقات بہت اچھی لگتی ہے۔ سب کی رائے اور خیریت مل جاتی ہے منزہ جی کی تحریر (ابتدائیہ) گلشن پھر اُجڑ گیا ہمارے دل کی آواز بنا مختصر افسانے میں موسم محبتوں کا احساس محبت سے تخلیق پانے والی تحریر ہے۔ قربانی اور خون رحیلہ خان کی زندگی کی تلخ سچائیوں کو بے نقاب کرتی تخلیق ہے محبت ایک روگ کمزور کردار کے لوگوں کے لیے آئینہ صفت تحریر ہے۔ سفینہ زیست ڈوب گیا احساس سے پُر تحریر ہے لیکن اس ماہ کی

وہ میری یاد کے جگنو

پیارے قارئین!

☆...... یقیناً آپ اپنے پسندیدہ لکھاریوں کے بارے میں جاننا

چاہتے ہیں۔

☆...... ان کی پسند، ناپسند...... ان کی زندگی کے یادگار پل،

غرض وہ سب سوال جو اکثر آپ کے ذہن میں اٹھتے ہوں گے۔

تو پھر تھوڑا سا انتظار......

بہت جلد...... آپ کے اپنے دوشیزہ میں، آپ کے پسندیدہ

لکھاری، آپ کے درمیان ہوں گے۔

اور

سلسلہ ہے

''وہ میری یاد کے جگنو......''

شاندار تحریر کباڑی کی جورو ہے واقعی یہ کہانی اپنی حقیقت اور اصل سے فرار حاصل کرنے والوں کی حقیقی تصویر ہے۔اب کچھ ناول کی بات ہوجائے فرزانہ حق کا ناول یہ زخم خنجر کے نہیں بہت اثر انگیز ہے۔منی اسکرین نئے لہجے نئی آوازیں ہمیشہ کی طرح اپنے اندر ایک ندرت لیے ہوئے ہے رنگ کائنات میں ڈاکٹر ہاشانی کی تحریر بہت شگفتہ ظرافت آمیز ہے۔میکال حسن کا انٹرویو اچھا لگا ماورا حسین کی باتیں جو کہ بہت ہی ماورائے فہم تھی برداشت کر گئے۔یہ تو خیر مذاق ہے آپ کا پرچہ شمارہ آپ کی کاوش کا عکاسی ہے اب اجازت دعا گو۔

ﷺ: سوئٹ روبینہ طویل غیر حاضری کے بعد آئیں مگر بہترین تبصرے کے ساتھ تمہاری پسندیدگی لکھاریوں تک پہنچ جائے گی تمہیں دوشیزہ اچھا لگا مجھے یہ بہت اچھا لگا محنت وصول ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔امید کرتی ہوں کہ تم اسی طرح سیر حاصل تبصرے کے ساتھ محفل میں آتی رہو گی۔

✉: کراچی سے تشریف لائی ہیں سمیرا غزل صدیقی کہتی ہیں۔پہلی بار آپ کے جریدے میں شرکت کر رہی ہوں میں آنچل کرن سمیت کئی جریدوں میں لکھا ہے۔کئی بار سوچا دوشیزہ کے لیے کچھ لکھوں اس لیے بڑی ہی امید سے نہایت مختصر افسانہ ارسال کر رہی ہوں۔امید ہے جلد شائع کریں گی اور اگر شائع نہ کریں تو واپس بھیج دیجیے گا کیونکہ میرے پاس کوئی کاپی نہیں ہوتی۔ڈائریکٹ لکھتی ہوں اور ڈائریکٹ بھیج دیتی ہوں دوشیزہ کا مطالعہ بھی کافی عرصے سے کرتی ہوں۔دعا ہے کہ اللہ آپ کو سلامت رکھے اور دوشیزہ کو مزید ترقیوں سے نوازے۔(آمین)

ﷺ: ڈیئر سمیرا! میں آپ کو خوش آمدید کہتی ہوں اور امید کرتی ہوں کہ محفل میں آپ سے ملاقات ہوتی رہے گی۔آپ کا افسانہ مل گیا ہے جلد پڑھ کر آگاہ کروں گی۔

✉: کراچی سے مومنہ بتول کہتی ہیں۔پیاری منزہ صدا بہاروں کے سنگ رہو۔دوشیزہ کی محفل میں آپ کا جواب ملا بہت خوشی کا احساس ہوا۔سچ ہے کہ اچھی اولاد اچھی تربیت اپنے منہ سے بولتی ہے۔آپ اپنے والد محترم کی روش پر چل رہی ہیں......اللہ آپ کا مقام بلند کرے۔حسب وعدہ اپنا افسانہ اور نظم بھجوا رہی ہوں امید کہ نوک پلک کی درستگی کے بعد مدرڈے پر ضرور شامل فرمائیں گی۔منزہ آپ کا بے حد شکریہ کہ میری غزل شائع کی دوشیزہ کا مطالعہ تو عرصہ ہوا کر رہی ہو مگر لکھنے کا دوبارہ سلسلہ جب شروع کیا تو محترم کاشی صاحب نے بے حد ساتھ دیا اُن کی حوصلہ افزائی سے دوبارہ قلم تھامنا شروع کیا۔دامِ دل تو بہترین لکھنے والی جناب رفعت سراج صاحبہ کا شاہکار ہے۔کہانیوں کا مطالعہ کر رہی ہوں۔دل جھیل اور خواب، خط کہانی اچھی کاوشیں تھیں جانو جرمن پر مزاح ذوق کو تسکین دے گئی۔منزہ جی ماما نظم پوسٹ کر رہی ہوں۔ممکن ہو تو قریبی اشاعت میں جگہ دے دیں تو مہربانی البتہ نظم مدرڈے پر ضرور شائع کیجیے گا ابھی تو ٹائم ہے میں اپنا ایڈریس اور فون نمبر بھی لکھ رہی ہوں اگر دوبارہ کہیں گی تو ارسال کردوں گی جناب اس سے پہلے بھی کافی تحریریں آپ کو ارسال کی تھیں جس کے شائع ہونے کا عندیہ بھی دیا جا چکا تھا مگر ابھی تک......کوئی شائع نہ ہوئی باقی آپ کی محنت کا منہ بولتا ثبوت دوشیزہ اچھا جا رہا ہے۔مگر ناولٹ قسم کی چیزیں جس میں سوائے طوالت کے کچھ نہیں ہوتو......طبیعت پر گراں گزرتا ہے جیسے یہ جو محبت ہے، پت جھڑ سے پہلے وغیرہ میں سمجھتی ہوں کہ یہ شعبہ اصلاح کا ہے۔ہنستے ہنستے چھوٹی بات چھوٹا سا نکتہ......

ہم شکل جیسے عظیم ناول کے بعد
ایم اے راحت کا ایک اور معرکۃ الآ راء شاہ کار
"زرد لومڑی"
دہکتے ہوئے رخسار، چمکتی ہوئی نیلی آنکھیں،
دلکش تراش کے بولتے ہوئے خاموش ہونٹ کچھ کہتے ہوئے،
شاخ نازک جیسے لچکتے ہوئے بدن والی حسینہ لیکن لومڑی سے زیادہ چالاک
جس کے نشانے پر آئے ہوئے دشمن اپنی موت یقین کر لیتے تھے
"زرد لومڑی"
جس کے نام سے بڑے بڑے جیالے کانپ اُٹھتے تھے
ایک انوکھے اِنتقام کی کہانی جو کسی ایک انسان سے نہیں لیا گیا
انتقام کی ایک ایسی لازوال داستان، جسے قارئین کبھی نہ بھلا پائیں گے
ماہ مئی سے "سچی کہانیاں" کے صفحات پر ملاحظہ فرمائیے

راہبر بن جاتا ہے ویسے یہ میری سوچ ہے۔

ج: پیاری سی مومنہ مکمل تبصرے کے ساتھ آئیں زبردست! افسانہ موصول ہو گیا انشاء اللہ جلد تمہاری تحریر دوشیزہ کی زینت بنے گی۔ محفل میں شرکت پابندی سے کیا کرو۔ اور تبصرہ بھی نئے شمارے پر کرو تاکہ پڑھنے والوں کو بھی اندازہ ہے رہے کہ کون سی تحریر کو سب سے زیادہ پسندیدگی حاصل ہو رہی ہے بھئی آخر آپ لوگوں کے ووٹ پر ہی تو ایوارڈ کا اعلان کیا جاتا ہے۔

✉: جناب یہ ہیں نسیم آمنہ کراچی سے تشریف لائی ہیں' فرماتی ہیں۔ خط تو میں شیرٹن والی شام سے واپس آ کر ہی لکھنا چاہ رہی تھی۔ اُس روز یوں لگا تھا کہ جیسے عرصے بعد اپنے وجود کے بچھڑے ہوئے حصے سے ملاقات ہوئی ہے ارے وہی رائٹر نسیم آمنہ صاحبہ! ایک سرشاری سی تھی۔ یہاں تک کہ میری چھوٹی بیٹی لاریب نے شگفتہ شفیق کے فیس بک پر میری یہاں سے وہاں تک پھیلی مسکراہٹ کی تصویر دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا کہ ''**Man You Were Realy Happy**'' جبکہ میں شرمندہ ہو رہی تھی کہ پتہ ہی نہیں چل سکا کہ کون کہاں سے فوٹو کھینچ رہا ہے۔ شاید اس خوشی کی وجہ یہ بھی ہو کہ دوشیزہ کی محفل میں پہنچ کر ہم رائٹرز بھاری بھرکم خواتین کی بجائے ''ننھی جنی دوشیزہ'' بن جاتی ہیں۔

خیر یہ تو مذاق کی بات تھی۔ باقی سب کچھ لاجواب رہا۔ ہوٹل کی آرائش دوشیزہ کی میزبانی سے لے کر طعام تک، سب ساتھی رائٹرز سے ملنا ایسا لگا باتوں میں وقت گزرنے کا پتہ تک نہ چل سکا تھا۔ نیلوفر صاحبہ سے پہلی بار یوں بالمشافہ ملاقات رہی۔ انہیں بلاشبہ گفتگو کا فن آتا ہے۔ الفاظ کا چناؤ، لہجے کا خوبصورت اتار اوَر چڑھاؤ، پھر جملے میں کس لفظ پر زور دینا ہے، کہاں ٹھہرنا ہے یہ سب یقیناً ریڈیو کی تربیت کے ساتھ ساتھ اُن کی اپنی محنت و صلاحیت کی وجہ سے تھا۔ وہ شام انہی کے نام رہی۔ اُن کے بعد سیما مناف اور رفعت سراج جانِ محفل رہیں۔ رفعت تو الفاظ کی جادوگر ہیں ہی، دوشیزہ میں اُن کے سلسلے وار ناول میں، میں اُن کے الفاظ کے انتخاب کو دیکھ کر حیران ہوتی ہوں۔ شائستہ عزیز کا سوبر سا انداز نہیں بھایا۔ انہیں ہنستے مسکراتے دیکھنے کی عادت ہے۔ اُدھر ہم لوگوں کی ٹرین تو فراٹے بھرتی دوڑ رہی تھی۔ بیچ بیچ میں ہنسی کی پھلجڑیاں اور شگفتہ جملے بازی۔ کوئی دیکھے تو نہ کہے کہ یہ ہماری سنجیدہ لکھنے والی، سینئر رائٹرز ہیں۔ شاید کانوں کو ہاتھ بھی لگالے۔ اور منزہ آپس کی بات ہے تمہیں دیکھ کر مجھے لگا کہ یہ آئیڈیل پاکستانی عورت کی مکمل تصویر ہے۔ خوبصورت' باوقار' مضبوط' پُر عزم' باعمل اور اِس کے ساتھ ساتھ شائستگی کے ساتھ شگفتگی...... مگر ہمارے میڈیا نے تو روتی بلکتی' پٹتی اپنی قسمت پر نالاں، مرد کے ہاتھوں خوار ہوتی عورت ہی دکھائی ہے۔ یا ایسی عورت جس کی زندگی کا واحد مقصد ایک مرد کے پیچھے آپس میں لڑمرنا یا سازشیں کرنا ہوتا ہے چاہے وہ مرد اُس کا محبوب ہو، شوہر ہو یا بیٹا...... کسی اور کو کیا دوش دوں خود میری تحریروں میں آپ کو ایسی روتی بلکتی ان گنت عورتیں ملیں گی۔ حالیہ تحریر ''توبہ'' میں بھی ایک تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ واقعی ہمارے معاشرے میں عورت ستم کا شکار ہے۔ میڈیا ذرا زیادہ **Drama** پیدا کر دیتا ہے۔ سب پوچھ رہے تھے کہ کہاں غائب ہو، میں نے خود سے وعدہ کیا کہ بہت ہو گیا۔ لیٹر بغیر کسی تحریر کے نہیں بھیجنا ہے اور ہوا یوں جب لکھنے بیٹھی تو وقت کا احساس ہی نہ ہوا۔ لیٹر بھی رہ گیا اور تحریر...... ہاں وہ

پراسرار کہانی نمبر 2

Email : pearlpublications@hotmail.com

پراسرار نمبر 1 کی پذیرائی کے بعد پراسرار نمبر 2

ایک ایسا شاہکار شمارہ جس میں دل دہلا دینے والی وہ سچ بیانیاں شامل ہیں جو آپ کو چونکنے پر مجبور کر دیں گی۔

آپ کے اُن پسندیدہ رائٹرز کے قلم سے، جو آپ کی نبض شناس ہیں۔

جن کی کہانیوں کا آپ کو انتظار رہتا ہے۔

جنوں، بھوتوں اور ارواحِ خبیثہ کی ایسی کہانیاں، جو واقعی آپ کو خوف میں مبتلا کر دیں گی۔

ہمارا دعویٰ ہے!

اس سے پہلے......

ایسی ناقابلِ یقین، دہشت انگیز اور خوفناک کہانیاں شاید ہی آپ نے پڑھی ہوں۔

آج ہی اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال پر اپنی کاپی مختص کرا لیں۔

سچی کہانیاں کا ماہِ اگست کا شمارہ، پراسرار نمبر 2 ہوگا۔

نوٹ: پراسرار نمبر 2 کے لیے کہانیاں بھیجنے کی آخری تاریخ 5 جون ہے۔

ایجنٹ حضرات نوٹ فرما لیں۔

حاضر ہے۔ دوشیزہ پندرہ تاریخ کے بعد ملا تو مکمل نہیں پڑھ سکی۔ سب سے پہلے تو فرزانہ آغا کی تحریر پڑھی اور پھر کم از کم اُس روز تو اور کچھ نہیں پڑھا گیا۔ پریا کی ذہنی وجسمانی اذیت کا درد اپنے دل پر محسوس ہوتا رہا ہم لوگ بھی عجیب ہیں۔ جیتے جاگتے انسان سے زیادہ معاشرے اور فرسودہ رسم ورواج کو اہمیت دیتے ہیں۔ میں تو ڈر رہی تھی کہ کہیں معصوم لڑکی آخر میں اپنی جان سے نہ گزر جائے مگر شکر کہ وہ آخری لمحے تک لڑتی رہی۔ مینا تاج کے افسانے کو پڑھ کر مانا کہ تقدیر سے فرار ممکن نہیں، انجام سے عبرت ہوئی۔ نفیسہ سعید کی بنت حوا' نے انسانی نفس کی کم زوریوں کو پرتاثیر انداز میں اُجاگر کیا ہے۔ ہوس یونہی انسان کو تاریک راہوں کا مسافر بناتی ہے۔ انداز بیاں دلچسپ تھا۔ یہ تجسس برقرار رہا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ ڈاکٹر ہاشمانی کی تحریر نے کھانے کے بعد سوئٹ ڈش کا کام کیا۔ ماشاء اللہ سے اللہ تعالیٰ نے دو چھوٹے چھوٹے افسانچے (نواسی پوتی) بھیجے ہیں۔ گھر میں ایشل اور اصباح، پھر کہاں کے ڈائجسٹ کہانی کے افسانے میرے قلم انہیں چاہیے ہوتے ہیں اور کاغذ پر ''میاؤں'' بنانی ہوتی ہے۔ یہی پیاری سی مصروفیت ہے آج کل، مگر اب سوچا ہے کچھ وقت اپنے لیے بھی نکالنا چاہیے اچھا اب اجازت، بہت سی نیک تمناؤں کے ساتھ اللہ حافظ۔

✉: عزیز از جان نسیم! مدتوں بعد آپ سے ملاقات ہوئی یقین جانیے بہت خوشی ہوئی میری بھی عجیب سی عادت ہوگئی ہے دل چاہتا ہے دوشیزہ کے سارے رائٹرز آس پاس ہوں وہ خوبصورت اور نوعمر لڑکیاں جنہیں میں ابو کی انگلی تھامے حیرت سے دیکھا کرتی تھی آپ لوگوں کی موجودگی میں، میں پھر سے چھوٹی سی منزہ بن جاتی ہوں۔ فکروں سے آزاد خوش باش اس لیے تو بہانے بہانے سے اب سب کو دعوت دیتی ہوں۔ آپ کی تحریر مل گئی بہت شکریہ جلد ہی شمارے کی زینت بناؤں گی اب مجھ سے وعدہ کرلیں کہ محفل میں شرکت کرتی رہا کریں گی اور میری طرف سے چھوٹے چھوٹے افسانچوں کو بہت پیار......

✉: رضوانہ کوثر لاہور سے لکھتی ہیں بہت پیاری سی منزہ سلامت رہو۔ کوشش تو بہت کرتی ہوں کہ محفل میں باقاعدہ حاضری کو یقینی بناؤں۔ لیکن یقین جانو ناسازیٔ طبیعت کے باعث سوچ کو عملی جامہ نہیں پہنا پاتی۔ دوشیزہ باقاعدگی سے ہر ماہ ملتا ہے یہ تمہاری محبت ہے اور محبت سے بڑی اس دنیا میں کوئی شے نہیں۔ تمہیں دیکھتی ہوں تو سہام صاحب کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ وہی حوصلہ، وہی ہمت' اور وہی عزم اور کچھ کر دکھانے کی جستجو...... اللہ تمہیں، تمہارے ہر نیک مقصد میں کامیاب کرے اور آج یہ تمہارا ہی دم ہے کہ پرچہ اتنی کامیابی سے اپنی جگہ پر جما ہوا ہے۔ خوش رہو۔ اپریل کا دوشیزہ میرے ہاتھ میں ہے گلشن پھر اجڑ گیا پڑھ کر آنکھیں نم ہوگئیں۔ دوشیزہ کی محفل نے تمام مہمان اپنے بھرپور تبصروں کے ساتھ موجود تھے۔ بہت اچھا لگتا ہے سب کے خطوط پڑھ کر...... یہ پرانے قاری ولکھاری کہاں جا سوئے ہیں۔ آجاؤ کہ باگ دوڑ اب اپنے ہی ہاتھوں میں ہے۔ لائف بوائے اسٹوری میں اسماء اعوان ہمیشہ ایک منفرد موضوع لے کر آتی ہیں۔ میکال حسن اور ماورا حسین کے انٹرویوز مونی خان اور ذیشان فراز نے خوب کیے۔ اس بار خط لکھنے کی سب سے اہم وجہ فرزانہ آغا کا مکمل ناول یہ زخم خنجر کے نہیں بنا۔ فرزانہ یقین جانو تم نے جو لکھا اُس نے ساکت کردیا۔ اب تک پڑھی گئی تمہاری تمام تحریروں میں یہ تحریر بھی اتنی نیچرل اور بھرپور تھی کہ میں اب تک اس کے حصار سے نکل نہیں پائی۔ رفعت سراج کی مدح سرائی کے لیے میرے

پاس الفاظ نہیں۔ واقعی رفعت لفظوں کی جادو گر ہے۔ دامِ دل 15 ویں قسط میں بھی بری طرح اپنے حصار میں لیے ہوئے ہے۔ ہر ماہ دامِ دل کا شدت سے انتظار کرتی ہوں۔ اُم مریم کا ناول رحمٰن رحیم سدا سائیں بھی لگتا ہے اب اپنے انجام کی جانب رواں دواں ہے۔ اتنے بھرپور ناول دوشیزہ کا حصہ ہیں۔ منزہ آپ کو بہت بہت مبارکباد۔ پرچہ واقعی بہت بلندیوں پر ہے۔ نفیسہ سعید بھی کمال لکھ رہی ہیں۔ حبیبہ عمیر، نگہت اعظمی، مینا تاج، روحیلہ خان، نسیم سکینہ صدف وغیرہ کی تحریریں بھی کمال ہیں۔ اب اجازت اگلے ماہ انشاء اللہ صحت نے وفا کی تو ضرور حاضر ہو جاؤں گی۔

ٰ: اچھی سی رضوانہ! اللہ آپ کو صحت دے۔ یقیناً دنیا میں محبت سے بڑی کوئی شے نہیں پرچے کی پسندیدگی کا بہت شکریہ۔ پرانے لکھاریوں کو تو میں بھی آواز دیتی رہتی ہوں۔ دیکھیں کب جواب دیتے ہیں۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

✉: کراچی سے تشریف لائی ہیں سکینہ فرخ، لکھتی ہیں۔ امید ہے کہ آپ سب بخیریت ہوں گے۔ دوشیزہ میں کچھ عرصے کی غیر حاضری کے بعد ایک مرتبہ پھر حاضر ہوں۔ یہ وقت جدائی میں تو گزر امگر دل سے یاد ایک مرتبہ بھی کم نہ ہوئی۔ اس واپسی پر کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے۔ جیسے لڑکیاں بڑے دنوں کے بعد سسرال سے میکے جا کر محسوس کرتی ہیں۔ یعنی خوشی اور اپنائیت...... ماشاء اللہ پرچہ بہت نکھرا نکھرا سا نظر آیا۔ منزہ آپ کے لیے بہت دل سے دعا ہے کہ اللہ پاک آپ کو ہمت اور حوصلہ دے کہ آپ ورثہ میں ملے اس گلستان کی آبیاری کر سکیں اور اس کے پھولوں کی خوشبو دور دور تک پھیلے، آمین۔ اداریہ، کہانیاں اور دوشیزہ کی محفل سب بہت اچھے لگے۔ دوشیزہ کی محفل کی تو کیا بات ہے۔ نیلوفر عباسی صاحبہ کے اعزاز میں ہائی ٹی کے موقع پر بھی یونہی لگ رہا تھا۔ جیسے ہم دوشیزہ کی محفل کو آن لائن دیکھ رہے ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان رونقوں کو سلامت رکھے۔ اب اجازت دیجیے۔ اللہ حافظ۔

ٰ: سوئٹ سکینہ! دل سے آپ کو یاد کیا تھا اور آپ آگئیں بہت اچھا لگا۔ افسانے بھیجنے کا شکریہ، انشاء اللہ جلد شائع کروں گی۔ بس آپ پابندی سے محفل میں شرکت کیا کریں پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ۔

✉: دل والوں کے شہر لاہور سے تشریف لائی ہیں حبیبہ عمیر، لکھتی ہیں۔ بہت پیاری سی منزہ سہام صاحبہ! السلام علیکم! خدائے بزرگ و برتر سے آپ سب کی خیریت مطلوب ہے۔ آپ سے بات ہوئی مجھے بہت مسرت ہوئی ایک بہت خوبصورت بولنے والی شخصیت سے شرف کلام ہو کر۔ نہ جانے کتنے عرصے سے قلم اٹھانے کا سوچ رہی تھی کہ آپ کی محفل میں شرکت کر سکوں بس کچھ مصروفیت ایسی رہی کہ حاضری کا شرف نہ مل سکا۔ لیکن آپ کے پیار بھرے اصرار کی بدولت آج آپ کی محفل میں حاضر خدمت ہوں۔ کم و بیش سال ہو گیا جب آخری بار شریک ہوئی تھی۔ لیکن اب محسوس ہی نہیں ہو رہا کہ لوٹی ہوں۔ گاہے بگاہے پڑھتی رہتی ہوں 'دوشیزہ' جب مصروفیت سے فرصت ملے۔ دن بدن یہ بہتری کی طرف گامزن ہے (ماشاء اللہ) میرا ناول چھاپنے کے لیے بے حد ممنون ہوں کہ اتنے سالوں بعد آپ نے بالآخر اس پر نظر کرم ڈالی تو سہی اور پھر جگہ بھی عنایت کر دی۔ بہت جلد انشاء اللہ اگلی تحریر ارسال کروں

گی۔ میں ان تمام لوگوں کا بے حد شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے میری کاوش کو سراہا بہت حوصلہ بڑھتا ہے جب کوئی پڑھے اور تعریف کرنے کے ساتھ ساتھ اصلاح بھی کرے۔ خاص کر جب کوئی تحریر سینئر رائٹر کی نظروں سے گزرے تو مسرت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ انسان وقت کے ساتھ ساتھ ہی سیکھتا ہے اور جب اپنی کی گئی غلطیوں سے سیکھ ملے تو وہ زندگی بھر ساتھ رہتی ہے۔ اس ماہ کا دوشیزہ ابھی تک موصول نہیں ہوا جس کا مجھے افسوس ہے کہ ہاتھ میں کیوں نہیں ہے ورنہ تھوڑا بہت پڑھتی اور تبصرہ ہی کر دیتی۔ لیکن چلیں اگلی بار سہی (انشاء اللہ) اب اجازت چاہوں گی کیونکہ ہمارے بیٹے راجہ جاگ چکے ہیں اور گھور رہے ہیں ہمیں کہ کب ہم انہیں اٹھائیں گے۔ آخر میں ملکِ پاکستان کے لیے دعا کہ رب کائنات اسے اپنی حفظ وامان میں رکھے (آمین)

ج: کیوٹ سی حبیبہ! تم وعدے کی بڑی پکی نکلیں...... خط کے ساتھ محفل میں شرکت کر لی خوش رہو۔ مجھے ایسی بچیاں بہت اچھی لگتی ہیں جو وعدہ پورا کرتی ہیں۔ میری طرف سے اپنے راجہ بیٹے کو بہت پیار کرنا اور بیچ محفل میں آتی رہنا۔

✉: رضوانہ پرنس کراچی سے لکھتی ہیں۔ پیاری منزہ بہت دنوں سے سوچ رہے تھے کہ محفل میں خط لکھیں مگر تم جانتی ہو، مصروفیات کہاں اجازت دیتی ہیں۔ لیکن اس بار ہم نے خط لکھ ہی ڈالا یقین کرو منزہ پرچہ بہت خوبصورت ہو گیا ہے۔ ناولٹ وغیرہ بہت خوبصورت اور آج کی جنریشن کے مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ ایک سچی بات بتائیں ہمارے جانے کے بعد تو تم نے پرچے کی لک ہی بدل ڈالی ہے۔ اور راز کی بات ہے ہمیں کسی ایڈیٹر سے ڈر نہ تھا بس تم سے ہی ڈر تھا۔ واقعی اب پرچہ پڑھ کر لگتا ہے کہ یہ دوشیزہ ہے۔ ورنہ تو یقین کرو یوں لگتا تھا جیسے کوئی بوڑھی روح پرچے میں بسیرا کر چکی ہے۔ دوشیزہ کی محفل کی کیا ہی بات ہے۔ تمہارے جواب بہت مزہ دیتے ہیں۔ لگتا ہے ہم سامنے بیٹھے ہی تم سے دو بدو بات کر رہے ہیں۔ اداریے میں تمہاری سوچ بہت واضح ہو جاتی ہے اور وطن پرستی اور انسانیت سے محبت تمہارے ہر لفظ سے چھلکتی ہے۔ جیتی رہو (یہ ہم دل سے دعا دے رہے ہیں) انٹرویوز بھی آج کل دوشیزہ میں بہت کمال کے آ رہے ہیں۔ ناولٹ بہت خوبصورت ہیں۔ سلسلہ وار ناولز کی کیا بات ہے۔ افسانوں میں آج کا رنگ چھلکتا ہے۔ یہ پوزیٹو سائن ہے۔ ڈاکٹر اقبال ہاشمانی رنگِ کائنات میں گدگدا دیتے ہیں۔ بس اب فی الحال اتنے ہی پر گزارہ کرو۔ انشاء اللہ بہت جلد پرچے پر بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گے۔

ج: بہت ہی اچھی رضوانہ! مجھے بہت اچھا لگا کہ آپ نے دوشیزہ پڑھا کیونکہ بنا پڑھے تبصرہ کرنا کافی مشکل ہے۔ بس جناب میں تو بس اتنا کہوں گی جو کام بھی محبت سے کیا جائے وہ بہت اچھا نتیجہ دیتا ہے اور مجھے تو اپنے دونوں رسالوں سے بہت محبت ہے۔ محفل میں آنے کا وقت ضرور نکالا کریں رونق ہو جاتی ہے۔

تو جناب یہ تھے وہ تمام خطوط جواب تک موصول ہوئے، پرچہ پریس جانے کے لیے بالکل تیار ہے۔ جب دوشیزہ آپ کے ہاتھوں میں پہنچے تو پڑھ کر اپنی رائے اپنی حد تک مت رکھیے گا مجھے ضرور ایک پیارے سے خط کی صورت میں آگاہ کیجیے گا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اجازت دیجیے۔ اگلے ماہ پھر ملاقات ہوگی، انشاء اللہ۔

دعاؤں کی طالب

منزہ سہام

کاشی چوہان

پرل پبلی کیشنز کی جانب سے دی گئی 'Hi-Tea' کی مختصر روداد اور تصویری جھلکیاں

21 مارچ کی چمکتی سہ پہر ادارہ دوشیزہ نے نیلوفر علیم کے اعزاز میں چائے کی دعوت کا اہتمام

ہائی ٹی سے پہلے کا ایک منظر،سب مصنفات نیلوفر عباسی کو بغور سنتے ہوئے

کیا۔شاید ہی کوئی ہو جو نیلوفر علیم جو شادی کے بعد نیلوفر عباسی کے نام سے جانی گئی ہوں نہ جانتا ہو۔ ڈرامہ ''شہزوری'' آج بھی لوگوں کو یاد ہے۔یہ خوبصورت ستاروں سے سجی محفل شہر کے 5 ستاروں والے ہوٹل موون پک المعروف شیرٹن ہوٹل میں منعقد کی گئی۔میزبانوں میں منزہ سہام اور ان کے دونوں صاحبزادے دانیال شمسی اور زین شمسی شامل تھے۔اس رنگوں بھری شام میں جو دیگر مہمان مدعو تھے وہ سب ادارہ دوشیزہ کے دیرینہ ہمدم اور لکھاری تھے۔جن میں عابدہ رؤف صاحبہ جو آج کل امریکہ میں اپنے صاحبزادے کے پاس مقیم ہیں آئی ہوئی تھیں۔اس کے علاوہ صبیحہ شاہ' غزالہ رشید' رفعت سراج' سکینہ فرخ' رضوانہ پرنس' نگہت اعظمی' شگفتہ شفیق' عقیلہ حق' سیما مناف' شائستہ عزیز' سنبل' حمیرا راحت' سیما رضا' نسیم آمنہ کی آمد نے محفل کو رنگین بنایا۔نیلوفر صاحبہ

اپنی ہمشیرہ کے ہمراہ تشریف لائیں۔ بہت خوشگوار ماحول میں چائے کا دور چلا Hitea اور وہ بھی

شیرٹن کی لابی میں مہمان خصوصی نیلوفر عباسی اپنی ہمشیرہ اور رفعت سراج کے ساتھ جبکہ منزہ سہام، عابدہ رؤف، شگفتہ شفیق اور رضوانہ پرنس کے ہمراہ

شیرٹن کی سمجھ سے باہر تھا کیا کھائیں اور کیا نہ کھائیں۔ انواع قسمیں کے لوازمات سے سجی میزیں جبکہ ایک جانب Cooks خود موجود تھے اور جو مہمانوں کی خواہش پر مزے دار چیزیں تیار کررہے تھے۔ درمیان میں میٹھے کے لیے ٹیبل موجود تھی جس پر بے شمار چیزیں سجی تھیں۔ چیز

منزہ سہام، عقیلہ حق اور رضوانہ پرنس کے نرغے میں جبکہ سیما رضا ردا، حمیرا راحت اور سکینہ فرخ تصویر کا حصہ ہیں

کیک سے لے کر فروٹ ٹرائفل اور پیسٹری سے لے کر سوفلے کیا تھا جو نہیں تھا...... مختلف قسم کے ٹارٹ، پڈنگ، کھیر، کسٹرڈ سب بہار دکھا رہے تھے۔ ایک طرف خواتین کے پسندیدہ چھولے اور

گول گپے سجے تھے تو دوسری جانب لذیذ حلیم، بھاپ اڑاتے برنرز میں فش، قیمہ، کچوریاں، پوریاں، چٹپٹے پکوڑے، چکن ونگز، سینڈوچز اور گرم گرم شیرے میں ڈوبے گلاب جامن دعوت نظارہ دے رہے تھے۔

اس قدر لذیذ لوازمات سامنے ہوں تو پھر کیسی ڈائٹ...... سب نے خوب انجوائے کیا۔ ہال کا خوابناک ماحول چاروں جانب بڑے بڑے شیشے اور میزوں پر جھکے جھومر جو کسی شیش محل کا تصور پیش کررہے تھے۔

چاق و چوبند ویٹرز کے دستے نے مہمانوں کی میز کو ایسے نرغے میں لیا ہوا تھا جیسے دشمن کو لیا جاتا

ہے جس کی تمام حرکات وسکنات پر گہری نظر ہوتی ہے۔ جیسے ہی کوئی مہمان نظر اُٹھا کر دیکھتا ویٹر

کرتی رہیں۔ محفل کو رضوانہ پرنس نے اپنی بے ساختہ پن سے اور رفعت سراج کے چلبلے جملوں

عقیلہ حق' رفعت سراج اور شگفتہ شفیق

چراغ کے جن کی طرح سامنے موجود ہوتے، شیرٹن کی مہمان داری ہمیشہ ہی لاجواب رہی ہے۔ گرم گرم چائے اور کافی سب کو نشستوں پر سروکی جاتی رہی۔

اس دوران باتوں کا بھی دور چلتا رہا۔ ادارہ

نے زعفران زار بنادیا تھا۔ دانیال، زین بہت احترام اور خلوص کے ساتھ اپنی والدہ کے مہمانوں کا خیال رکھتے رہے اور ساتھ ساتھ تصاویر بھی بناتے رہے۔ نیلوفر علیم صاحب نے اپنے ٹھہرے اور دھیمے لہجے میں تمام مہمانوں کو بتایا کہ سہام مرزا

نسیم آمنہ اور منزہ سہام یقیناً کسی ایسی بات پر ہنس رہی ہیں جو اُن کو سمجھ آ گئی ہے

کی سربراہ منزہ سہام صاحبہ اپنے تمام مہمانوں کے پاس جا کر ان سے تکلف نہ کرنے کی درخواست

صاحب سے ان کے شوہر قمر علی عباسی کا تعلق سن 70 سے تھا۔ جب حالات مشکل تھے اور مارشل

لاء کے باعث ٹی وی پر بہت پابندیاں تھیں۔تب سہام صاحب نے عباسی صاحب سے دوستی نبھائی جو وہ لوگ کبھی نہیں بھول سکتے۔

وہ منزہ سہام کو بچپن سے دیکھتی آ رہی ہیں ایسا جب انہوں نے کہا تو منزہ صاحبہ نے دھیرے سے ان کے کان میں کہا'' آنٹی سال مت بتائیے گا عمر پتہ چل جائے گی''، جس پر محفل میں موجود تمام لوگ ہنس پڑے۔منزہ صاحبہ کی کرسی کے ہتھے پر ایک جانب رفعت سراج براجمان تھیں اور دوسری

غزالہ رشید' سبیحہ شاہ' رضوانہ پرنس اور نسیم آمنہ.... آخر یہ انتظار کس کا تھا بھلا.....؟

جانب سنبل' غزالہ رشید بار بار بالکل ٹیچر کی طرح سب کو خاموش رہنے کی تاکید کرتی رہیں۔

وہ چاہتی تھیں کہ نیلوفر کی آواز ان تک واضح طور پر پہنچے مگر جہاں خواتین ہوں اور وہاں شور نہ ہو ایسا ممکن نہیں۔تھوڑے فاصلے پر بیٹھے غیر ملکی بھی حیرت سے قہقہے لگاتی خواتین کو دیکھ رہے تھے۔ حمیرا خاموشی سے سب کی باتیں سن رہی تھیں۔ سکینہ ہمیشہ کی طرح مسکرا رہی تھیں۔

سیما رضا اپنے دفتر سے اٹھ کر آئی تھیں۔ سیما مناف نے ہمیشہ کی طرح منزہ صاحبہ کا ہاتھ تھام کر بہت پیار سے بیٹوں کے ساتھ کھانے پر آنے کی دعوت دی۔نسیم بہت عرصہ کے بعد سب سے مل رہی تھیں اُن کی آمد پر منزہ صاحبہ نے اپنی سیٹ سے اُٹھ کر انہیں گلے لگایا۔ان کے چہرے پر وہی دھیمی سے مسکان تھی جو ان کا خاصہ ہے نگہت بھی اپنے دفتر سے آئی تھیں اور خاصی تاخیر سے آئی تھیں۔

انتہائی پُر تکلف ماحول میں یہ شام منائی گئی یہ ادارہ دوشیزہ کا ہی خاصہ ہے کہ وہ اپنے رائٹرز کو شہر کے بہترین ہوٹل میں مدعو کرتا ہے۔یقیناً یہ مرزا صاحب کی محبت اور احترام ہے اپنے لکھاریوں کی طرف جو ورثے میں اُن کی صاحبزادی کو ملا اور دانیال اور زین کی صورت یہ سلسلہ چلتا رہے گا انشاء اللہ......''

آخر میں گروپ فوٹو کھنچوائے گئے۔خوب ہلا گلا رہا ظاہر ہے جہاں سیما رضا اور عقیلہ ہوں وہاں رونق تو ویسے ہی لگ جاتی ہے۔یوں یہ رنگوں، محبتوں اور خلوص سے سجی شام اختتام پذیر ہوئی جو شرکت کرنے والوں اور اب پڑھنے والوں کو بھی تا دیر یاد رہے گی۔

☆☆......☆☆

طاہر شاہ

معروف سنگر اور بزنس مین

طاہر شاہ نے موسیقی کی دنیا میں تہلکہ مچادیا

مونی خان

طاہر شاہ جنہوں نے ایک بار پھر سوشل میڈیا پر دھوم مچادی ہے۔ اُن کا نیا گاناAngel اس وقت پسندیدگی کے ریکارڈ توڑ چکا ہے۔ طاہر شاہ نے پہلی بارEye To Eye گا کر سوشل میڈیا پر تہلکا مچادیا تھا لوگوں نے جہاں ان کے انداز، تلفظ کو تنقید کا نشانہ بنایا وہاں ایک بڑے طبقے نے ان کو بے انتہا پسند بھی کیا۔ 2015ء میں امریکن پرسٹیج ایوارڈ سے بھی نوازہ گیا۔ 2014ء میں طاہر نے اچیومنٹ ایوارڈ کینیڈا سے حاصل کیا۔ اس سے قبل 2013ء میں ریکارڈ سیٹر ورلڈ ریکارڈ USA سے حاصل کیا۔

Angel نامی گانا جس میں طاہر شاہ نے خود پرفارم کیا ہے۔ دھوم مچا رہا ہے۔ اس گانے کو لکھا بھی طاہر شاہ نے ہے اور ڈائریکٹ بھی خود ہی کیا ہے۔ گانے میں

موجود خاتون مسز طاہر ہیں اور بیٹا بھی انہی کا ہے۔ طاہر شاہ 1980ء میں کراچی میں پیدا ہوئے تعلیم مکمل کرنے کے بعد بزنس کی فیلڈ میں آ گئے۔ اُن کی خواہش ہے کہ وہ اپنا ذاتی ٹی وی چینل لانچ کریں۔ مزاجاً نرم خو واقع ہوئے ہیں۔ ان کے بالوں کو بھی شدید پذیرائی حاصل ہو رہی ہے۔ لمبی لمبی زلفوں کو دیکھ کر کافی خواتین حسد اور رشک میں مبتلا ہوگئی ہیں۔ طاہر شاہ کا کہنا ہے کہ انہیں ہالی وڈ اور بالی وڈ سے بہت آفرز آ رہی ہیں۔ ہماری بھی یہی دعا ہے کہ طاہر شاہ دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کریں۔

حریم فاروق

خوبصورت اداکارہ اور ماڈل

ذیشان فراز

ہم: حریم یہ بتائیں آپ کے والدین دونوں ڈاکٹر ہیں پھر آپ نے شوبزنس کا انتخاب کیوں کیا؟

حریم: جی بالکل اماں ابا دونوں ڈاکٹر ہیں مگر مجھے ہمیشہ سے ٹی وی میں آنے کا شوق تھا اس لیے کراچی چلی آئی تھی اور تھیٹر میں کام کیا۔

ہم: آپ کی تاریخ پیدائش کیا ہے؟

حریم: 26 مئی 1989ء اور شہر اسلام آباد۔

ہم: آپ کے کتنے بہن بھائی ہیں؟

حریم: میری بس ایک چھوٹی بہن ہے۔

ہم: یہ بتائیں علم کی کتنی دولت کمائی؟

حریم: (ہنستے ہوئے) میں نے جرنلزم میں گریجویشن کیا ہے۔

ہم: میرے ہمدم میرے دوست سے آپ کو شہرت ملی کیسا لگا؟

حریم: جی بالکل! اس ڈرامے کے بعد مجھے لوگ پہچاننے لگے۔ بہت اچھا لگا۔

ہم: کھانے میں کیا پسند کرتی ہیں؟

حریم: میں سب کچھ کھاتی ہوں ڈائٹ نہیں کرتی مگر گرین ٹی بہت پیتی ہوں اور جم جاتی ہوں پابندی سے۔

ہم: کون سی ایسی بات ہے جس پر بہت غصہ آتا ہے؟

حریم: مجھے جھوٹ بولنے والے لوگوں پر بہت غصہ آتا ہے۔

ہم: کس چیز سے ڈرتی ہیں؟
حریم: مجھے اماں ابا کی ناراضگی سے ڈر لگتا ہے۔
ہم: آپ کو بہت کم وقت میں شہرت مل گئی کیسا لگتا ہے؟
حریم: اللہ کا شکر ہے میں اس قابل نہیں تھی مگر اس پاک ذات نے مجھے بہت نوازہ۔
ہم: فرصت کے وقت کیا کرتی ہیں اور کہاں سب سے زیادہ اچھا فیل کرتی ہیں؟
حریم: فارغ وقت میں تو اپنے ادھورے کام مکمل کرتی ہوں، بک بھی پڑھ لیتی ہوں اور سب سے اچھی جگہ میرا کمرہ ہے جہاں میں بہت خوش رہتی ہوں۔
ہم: لباس کون سا پسند کرتی ہیں؟
حریم: مجھے آرام دہ لباس پسند ہے جس کو Carry کرنا مشکل نہ ہو۔
ہم: اچھا یہ بتائیں شاپنگ کا شوق ہے یا بہت سوچ سمجھ کر پیسے خرچ کرتی ہیں؟
حریم: نہیں نہیں سوچ سمجھ کر تو بالکل خرچ نہیں کرتی اور بہت شاپنگ کرتی ہوں بس جو اچھا لگے خریدتی جاتی ہوں۔
ہم: ہولی ڈے کہاں گزارنا پسند ہے؟
حریم: مجھے نیچر بہت پسند ہے تو میری کوشش ہوتی ہے کہ دریا، سمندر، سبزہ جگہ ایسی ہو شور شرابے سے دور۔
ہم: کون سی ایسی بات ہے جو تکلیف کا باعث بنتی ہے؟
حریم: جب لوگ پہلی ملاقات میں ہی کہتے ہیں آپ یہ فیلڈ چھوڑ کر شادی کیوں نہیں کر لیتیں تب بہت Irritate ہوتی ہوں۔
ہم: تو شادی کب کر رہی ہیں؟
حریم: (ہنستے ہوئے) ویسے ابھی کوئی ارادہ نہیں...... میں دماغ کی بات سنتی ہوں جس دن دماغ نے کہا شادی کر لو، کر لوں گی۔
ہم: دن کا کون سا حصہ پسند ہے؟
حریم: مجھے شام بہت پسند ہے۔ دل چاہتا ہے اس وقت اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر درختوں اور پرندوں کو دیکھتی رہوں۔
ہم: آپ ڈرپوک ہیں؟
حریم: ڈرپوک تو نہیں بس مجھے والدین کو کھونے کا سوچ کر خوف آتا ہے۔ میں ایسا سوچنا بھی نہیں چاہتی۔
ہم: اپنی سب سے بری عادت کیا ہے؟
حریم: مجھے اگر کوئی سوتے میں سے اٹھا دے تو میں پاگل ہو جاتی ہوں، اپنی یہ عادت پسند نہیں۔
ہم: سیاست سے دلچسپی ہے؟

حریم: بالکل نہیں مگر سیاست دانوں سے صرف اتنا کہوں گی کہ بس بہت ہو گیا اب پاکستان کے لیے بھی کچھ سوچیں۔
ہم: لوگوں کی کون سی بات بری لگتی ہے؟
حریم: گوسپ کرنے والے مجھے اچھے نہیں لگتے۔
ہم: بچپن یاد آتا ہے؟
حریم: بالکل یاد آتا ہے مگر میں نے زندگی کے ہر دور کو انجوائے کیا ہے۔ بچپن، پھر ٹین ایج اور اب یہ کام والا دور سب اللہ کی دین ہے۔
ہم: جھوٹ بولتی ہیں؟
حریم: (منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنس پڑیں) چھوٹے چھوٹے جھوٹ بولتی ہوں۔
ہم: آج کل موبائل فون زندگی کے لیے بہت اہم ہے ایسا مانتی ہیں؟
حریم: میں ایسا نہیں مانتی بلکہ جس دن موبائل سروس بند ہو اس دن بہت خوش رہتی ہوں۔
ہم: زندگی میں سب سے اہم کیا ہے؟
حریم: فی الحال میرا بیگ جس کے بغیر میں کام پر جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ ساری ضرورت کی چیزیں اس میں بھری رہتی ہیں۔
ہم: وقت کی پابند ہیں یا؟
حریم: میں وقت کی بہت پابندی کرتی ہوں صبح نو بجے سے میرا دن شروع ہو جاتا ہے۔
ہم: لوگوں میں رہنا پسند کرتی ہیں یا پھر تنہائی پسند ہے؟
حریم: مجھے مہمان اچھے لگتے ہیں مگر ظاہر ہے ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے جب اکیلے رہنا ہو تو اکیلی ہی خوش رہتی ہوں۔ خود بہت کسی کے گھر نہیں جاتی ہوں میرے گھر کوئی بھی آئے اچھا لگتا ہے۔
ہم: سچی خوشی کب ملتی ہے؟
حریم: جب میری وجہ سے کسی کو خوشی ملے تب دل سے خوش ہوتی ہوں۔
ہم: پہلا چیک کتنے کا ملا؟
حریم: پہلا چیک 3 ہزار روپے کا ملا تھا اور وہ ایک این جی او سے ملا تھا میں نے ان کے لیے کچھ عرصہ کام کیا تھا۔
ہم: جب بہت خوش ہوں تب کیا کرتی ہیں؟
حریم: مجھے سب سے زیادہ خوشی عید کی ہوتی ہے اور میں عید آنے سے کئی دن پہلے ہی خوب گانے گاتی ہوں شور کرتی ہوں۔
ہم: فیئرز تنگ کرتے ہیں؟
حریم: عام طور سے تو نہیں مگر کبھی کبھار ایسا ہو تو پھر ڈانٹ دیتی ہوں۔
ہم: رونا کب آتا ہے؟
حریم: جب غصہ آتا ہے میں شدید غصے میں بس یار بول کر رونا شروع کر دیتی ہوں۔
ہم: آپ کا پروفیشن ایسا ہے کہ اس میں مردوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے کیسا محسوس کرتی ہیں؟
حریم: سب بہت اچھے ہیں عزت دیتے ہیں، خیال رکھتے ہیں اور میں ویسے بھی مرد اور عورت کے فرق کو بہت اہمیت نہیں دیتی انسان اچھا ہو بس کافی ہے۔
ہم: کھانے پکانے کا شوق ہے؟
حریم: بالکل نہیں مجھے اماں کے ہاتھ کے کھانے بہت پسند ہیں۔
ہم: لوگوں کو کیا مشورہ دینا چاہیں گی؟
حریم: بس اتنا ہی کہ زندگی بہت بڑی نعمت ہے اس کو برباد مت کریں بلکہ ہر دن کھل کر جئیں اس طرح ہم اللہ کا شکر ادا کر سکتے ہیں۔

☆☆......☆☆

بیوٹی گائیڈ

مہرین اسماعیل

"حسن اور طرزِ زندگی"

انسانی 'جلد' چہرے اور جسم کے لیے حفاظتی شیلڈ کی اہمیت رکھتی ہے، جس کی وجہ سے جسم جراثیم اور انفیکشن سے محفوظ رہتا ہے، لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ انسانی جلد کچھ بہت اہم کام انجام دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے ہم نا صرف صحت مند رہتے ہیں بلکہ اپنے قدرتی رنگ روپ کو بھی برقرار رکھ پاتے ہیں۔ اسی وجہ سے جلد کا مساج، اس کی حفاظت بے حد ضروری ہے۔ پہلے ہم آپ کو جلد کے اہم امور کے بارے میں بتائیں گے پھر مساج کی طرف آئیں گے۔

گرمیوں کا زمانہ بھی جلد کی خاص حفاظت کے لیے، بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ پسینے، گرد، مٹی سے جلد بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ تو آیئے پہلے جلد کے چھ اہم کاموں کی طرف توجہ دیں تاکہ جلد کی اہمیت سمجھ میں آسکے اور ہم اس کی مزید بہتر انداز میں حفاظت کر سکیں۔

ہمارے چہرے اور جسم میں ماحولیاتی آلودگی یا خون سے خارج ہونے والی زہریلی رطوبتیں جو جلد کے مساموں میں جمع ہو کر اسے بند کر دیتی ہیں۔ پھر جسم کے اندر خون میں خرابی پیدا کرتی ہیں، غیر ضروری پانی جو جسم کے اندر جمع ہو جاتا ہے۔

ہماری جلد ان سب رطوبتوں اور گندے پانی کو جسم سے خارج کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے، اپنے مساموں سے تازہ آکسیجن جذب کر کے خون میں شامل کرتی ہے، جس سے جسم کے اندرونی نظام کی نشوونما میں بہت مدد ملتی ہے۔

جسم کے ٹمپریچر کو نارمل رکھنا

ہمارے جسم کا ٹمپریچر جلد کی بدولت ہی نارمل رہتا ہے۔ اس لیے موسم کے لحاظ سے ٹمپریچر

چاہے کتنا زیادہ ہو، مگر جسمانی ٹمپریچر 98.6 فارن ہائیٹ ہی رہتا اور یہ جلد کی بدولت ہوتا ہے کہ وہ باہر کے ٹمپریچر کو ہمارے جسمانی ٹمپریچر پر اثر انداز ہونے نہیں دیتی۔

جلد بھی سانس لیتی ہے

جلد بھی سانس لیتی ہے اُس سے جسم کے اندر پیدا ہونے والی زہریلی گیسیں جیسے کاربن ڈائی آکسائیڈ وغیرہ کو یہ اپنے مساموں کے ذریعے جسم سے باہر پھینکتی ہے اور آکسیجن کو جسم میں داخل ہونے میں مدد دیتی ہے۔

اس وجہ سے نا صرف ہماری جلد بلکہ تمام جسمانی نظام صحت مند رہتا ہے اور بیرونی خطرات سے محفوظ بھی رہتا ہے۔

جذب کرنے کی صلاحیت

جلد کی بدولت خون کے کئی اجزاء ٹشوز میں جذب ہو کر جسم کے ہر حصے میں پہنچ جاتے ہیں۔

اس طرح مختلف دوائیں، جلد کے ٹشوز میں جذب ہونے کی بدولت وہاں موجود خون کی باریک شریانوں کے ذریعے تمام جسم میں تیزی سے اور با آسانی پہنچ جاتی ہیں۔

جسم کے پانی کی سطح نارمل رکھنا

یہ جلد کی بدولت ہی ممکن ہے کہ جسم کا زائد پانی پسینے کی صورت باہر نکل جاتا ہے اور ضرورت کے لحاظ سے پانی کی سطح جسم میں جلد کی بدولت قائم رہتی ہے۔

جراثیم سے حفاظت

یہ جلد کا ایک بہت ہی اہم فنکشن ہے جو دھول مٹی میں پائے جانے والے جراثیم کو انسانی جسم میں داخل ہونے سے روک دیتی ہے۔ اسی طرح فضائی آلودگی سے بھی جسم کو محفوظ رکھتی ہے۔

ایک طرح سے دیکھا جائے تو جلد جسم کا پہلا مدافعتی دروازہ ہے جو جسم کو بیرونی خطرات سے محفوظ رکھتا ہے۔

❖❖

لائف بوائے ... قرا قرم سر کرائے

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت
سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

سفر میں صبح سے شام کیسے ہوتی ہے کچھ پتا ہی نہیں چلتا۔ ہاں مگر منزل کا یقین ہو تو ہر ہر لمحہ اپنا آپ وصولتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ میری زندگی کا بھی ایک Aim تھا۔ میں اپنی ماں کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ بڑے ناز و نعم سے تو میری پرورش نہیں ہوئی مگر پھر بھی...... میری ماں نے میری ہر ہر خواہش کو پورا کیا ہے۔

شروع سے ہی مجھے کچھ الگ کر دکھانے کی دھن سوار تھی۔ ہمیشہ میں نے لڑکوں والے کھیل کھیلے۔ گڑیا گڈے مجھے زہر لگتے تھے۔ مجھے لڑکیوں کا رسی کودنا برا لگتا تھا۔ میں تو رسی پر لٹک کر درخت پر چڑھنے کی مشق کرتی تھی اور لڑکوں کو ہرا دیا کرتی تھی۔ کوڑا جمال شاہی' برف پانی' کھو کھو کے بجائے مجھے گھوڑی چپی یا پکی پسند تھا۔ اِدھر لڑکیاں اکٹھی ہو کر بالش ناپتی تھیں اُدھر میں دیواریں پھلانگا کرتی تھی۔

سائیکلنگ' بائیک رائیڈنگ اور گھڑ سواری مجھے بہت پسند تھی۔ میں اچھی تیراک بھی تھی۔

غرض میں نے بچپن ہی سے سوچ لیا تھا کہ لڑکیوں والا کوئی کام نہیں کرنا...... آپ سچ سمجھے۔ میں خود کو لڑکی ماننے پر تیار ہی نہ تھی۔ میری ماں نے بھی میرے مشاغل پر نکتہ نہ اٹھایا۔ بلکہ وہ مجھے بس یہی کہتی تھیں کہ ''ملیحہ بیٹی! پہلے اسٹڈی اور پھر گیم۔''

میری زندگی بس اسٹڈی اور گیم کے درمیان گھومتی رہی۔ میں نے ہمیشہ نمایاں کامیابی حاصل کی۔

امی نے بابا کے بعد اپنی تعلیم سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور بچوں کی کوچنگ نے ان کی اور میری زندگی کو کسی حد تک نارمل کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

بچپن کب، کیسے گزرا کھیل اور پڑھائی میں پتا ہی نہ چلا۔ اب میں کالج میں آ گئی تھی۔ کالج میں، میں نے لڑکیوں کا الگ ہی رنگ اور انداز دیکھا تھا۔

مجھے تو بالوں سے چڑ تھی مگر امی ہمیشہ لائف بوائے شیمپو سے سر دھلا کر رکھتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا

کہ لائف بوائے شیمپو سے دھلے بال ہیئر Smell سے محفوظ رکھتے ہیں۔ جو کام مہنگے سے مہنگا شیمپو کرتا ہے وہی کام لائف بوائے شیمپو بھی قدرے بہتر انجام دیتا ہے۔ مجھے جیسے بالوں سے چڑ تھی اُسی طرح مجھے لائف بوائے شیمپو سے بھی چڑ سی ہوگئی تھی۔ یہ میرے اور لائف بوائے شیمپو کے درمیان اٹھنے والی پہلی دیوار تھی جو غائبانہ اٹھ گئی تھی۔

ہمارے کالج میں اکثر غیر نصابی سرگرمیاں عروج پر ہوتی تھیں۔ پاکستان وومن ہاکی ٹیم میں بھی ہمارے کالج کی ایک لڑکی کالج کا نام روشن کررہی تھی۔ اکثر میں بھی کالج کے بہترین طلباء میں اپنا نام دیکھا کرتی تھی۔

کوہ پیمائی میں ہمارے اسکول کا نام بھی شامل تھا اور ہمیشہ کی طرح اس سرگرمی کے لیے بھی سب سے پہلے میرا نام پکارا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں پرنسپل صاحب کے کمرے میں تھی۔

''ملیحہ! اِس بار ایک نہایت منفرد سا مقابلہ حکومت کی جانب سے کالج اسٹوڈنٹس کے درمیان منعقد کیا جارہا ہے۔ میری خواہش ہے کہ اس بار تم نا صرف اپنے اسکول بلکہ دنیا بھر میں اپنی دھوم مچادو۔''

''مگر میم آپ امی کو کیا کہیں گی۔''

''وہی جو ہمیشہ کہتی ہوں You Are A Lucky Woman کہ آپ کے پاس ملیحہ جیسی بیٹی ہے۔''

''او کے میم!'' میں یہ کہہ کر واپس اپنے کلاس روم میں آگئی۔ میری خوشی کی انتہا نہ تھی۔ میں خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کررہی تھی۔

گھر آتے ہی میں خاموشی سے اپنے کمرے میں دروازہ بند کر کے بیٹھ گئی۔ میری عادت تھی جب میں بہت زیادہ خوش ہوتی تھی تو اپنا کمرہ لاک کرلیا کرتی تھی۔

امی نے دو ایک بار آکر دروازہ کھٹکھٹایا مگر جواب ندارد وہ واپس پلٹ گئیں۔ اب تو میرے سامنے صرف کوہ ہمالیہ ہی تھی۔ میں خوابوں میں اس پہاڑ کو سر کرتی جارہی تھی۔

راکاپوشی کی فضائیں مجھے چوم رہی تھیں۔ مجھے چھو رہی تھیں کہ اچانک سے میں خود کو چشمِ زدن میں لائف بوائے شیمپو سے سر دھوتا محسوس کرنے لگی۔

''اوہ مائی گاڈ! امی میرے سامان کے ساتھ لائف بوائے شیمپو بھی تو رکھیں گی۔ اوکے......'' میں مسکرائی اور پہلی بار مجھے اس لائف بوائے شیمپو سے ممتا کا سا احساس چھلکتا محسوس ہوا تھا۔

''گڈ گرل!'' کچھ دیر بعد میں امی کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر تھی۔

''تو پھر تم نے ٹھان لیا ہے کہ تم قراقرم سر کرو گی۔'' اُسے ماں کی بات سن کر کچھ نہ سوجھا تو بولی۔

''میں نے کچھ نہیں ٹھانا...... امی اگر آپ اجازت دیں گی تو یہ ممکن ہو جائے گا ورنہ...... میں آپ کی اجازت کے بغیر کچھ نہ کرسکتی ہوں نہ میں نے کیا ہے۔''

''مجھے اپنی گڑیا سے یہی امید تھی۔'' آگے بڑھ کر امی نے میرا ماتھا چوم لیا۔ دھڑ دھڑ دل دھڑکا اور آنسو ٹپ ٹپ میری آنکھوں سے گرنے لگے۔

''آئی لو یو امی...... میں نے قراقرم سر کرلیا ہے۔ آپ کی محبت اور اعتماد کا...... میں تو صرف کالج کی ایکٹیویٹی کے لیے جارہی ہوں۔ باقی جو خدا کی مرضی۔''

''جاؤ بیٹی! خدا تمہیں ہر میدان میں سرخرو کرے۔''
یہ کہہ کر زرین بیگم نے بیٹی کا ماتھا چوم لیا۔
سفر کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ میرا ایک چھوٹا سا بیگ جس میں انتہائی ضرورت کی چیزیں شامل تھیں امی نے تیار کیا تھا۔
''ملیحہ! گڑیا سفر کے دوران دھول مٹی اور گرد وغبار بال Damage کر دیتا ہے پلیز میں یہ لائف بوائے شیمپو رکھ رہی ہوں۔ اسے روزانہ استعمال کرنا انشاء اللہ اس میں موجود ملک پروٹین' بادام اور اس کا اپنا ایکسٹرا 30 فیصد زائد مضبوط بال کرنے والا فارمولا اِس ٹرپ میں تمہیں اپنے بالوں کی طرف سے آزاد کر کے میری یاد دلائے گا۔''
''امی ...... لگتا ہے آپ لائف بوائے شیمپو سے بہت تنگ ہیں۔''
''ارے بیٹا! میرے بال دیکھو۔'' انہوں نے جھٹ سے موٹی گھٹی چوٹی میرے سامنے کردی۔
''یہ سب مضبوطی اور خوبصورتی میرے لائف بوائے شیمپو ہی کی وجہ سے ہے نا۔ تو پھر میں اپنی بٹیا کے لیے اس لائف بوائے شیمپو جیسے پیارے دوست کا انتخاب کرنے میں سیریس نہ ہوؤں ...... بولو۔''
''اوکے امی! یہ آپ کا پیارا دوست آج سے میرا بھی پیارا دوست ہوا۔'' میں نے لائف بوائے شیمپو کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔
''شریر! چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ کالج والے تمہارا ہی Wait کر رہے ہوں گے۔''
کچھ دیر بعد میں کالج میں تھی اور پھر ایک گھنٹے بعد ہمارا سفر شروع ہو گیا۔

☆......☆......☆

فلک میں دیکھتے تھے اُڑتے اُڑتے
وہ شہرِ شب کے
وہ سانولی روشنی کے پیچھے سے جگمگاتے
جزیرے شب کے
ہوانوردی میں آتے جاتے
وہ کہکشاں میں سروں پر اڑتے
پرندے شب کے

میں راکاپوشی پہ ہوں۔ لگتا ہے سب کچھ خواب جیسا ہے۔ سفید دودھ سے اجلی برف کے درمیان سیدھی لکیر کی طرح ایک دراڑ سی ابھر رہی ہے پہاڑ پر اس دراڑ سے نیچے کی ساری برف ایک جگہ پر گر رہی تھی۔
میں اِس سلائڈنگ سے معجزانہ طور پر بچ گئی تھی۔ بال دھول میں اٹے تھے کیونکہ سلائڈنگ کے وقت میرا بہت مضبوط کیپ کہیں گرا تو طوفان کی نذر ہو گیا۔ سخت سردی میں جیسے جان نکلی جاتی تھی۔ اس سفید تاج محل جیسے عظیم پہاڑ نے میری ساری قوت جیسے سلب کر لی تھی۔ جانے سارے ساتھی کہاں کھو گئے تھے۔ حالانکہ ہم سب ساتھ ہی تھے۔
میرے کانوں میں اذان کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اور لگتا تھا سامنے میری ماں دونوں ہاتھ اٹھائے میری لمبی زندگی کی دعائیں مانگ رہی ہے۔ مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔
جب ہوش آیا تو میں اسپتال کے ایک کمرے میں تھی۔
''پلیز آپ اٹھنے کی کوشش نہ کریں۔'' میرے اٹھنے پر ایک فرشتہ صورت نرس قریب آئی اور مسیحائی کرنے لگی۔
''اوکے!'' میں نے کہا اور پھر سے بیڈ پر

دراز ہوگئی۔

اُف کیسا خوبصورت سفر تھا۔ قراقرم...... ہمالیہ کی شان، آسمان سے باتیں کرتا پہاڑ ہم راکاپوشی سر کرنا چاہتے تھے۔

مگر...... موسم نے ہمیں اس کی اجازت نہ دی۔ اس سفر کے دوران ہمارا ایک ساتھی Missing تھا۔

اس پہاڑ نے اگر گود میں کسی کو لے لیا تو سمجھ لیں کہ وہ اسی پہاڑ کا ہوگیا۔ خیر اس قدر سخت موسم میں ہمارا سفر جذبے کی Peak پر تھا۔ میں سب سے کم عمر کوہ پیما تھی اس گروپ میں۔ سب میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ حیرت انگیز طور پر جہاں پانی ہوتا میں جھٹ سے اپنے بال آزاد کرتی اور لائف بوائے شیمپو سے انہیں دھوڈالتی۔

سفر میں میرے بال بہت مضبوط رہے۔ یہ میرے لائف بوائے شیمپو کا کمال تھا۔ اس لائف بوائے شیمپو نے مجھے میری ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی تھی۔ اب میں اس بیڈ پر لیٹی قراقرم پر گزرے وقت کی یادوں سے دل کو مطمئن کررہی تھی کہ نہیں کچھ نہیں ہوا اگر میں نے وہ چوٹی سر نہیں کی۔

میں نے اپنے کالج کا نام ضرور بلند کردیا تھا کہ ملیحہ نامی ایک طالبہ جسے کالج نے کوہ پیمائی کے لیے چنا۔ وہ آدھا پہاڑ تو سر کر آئی۔

اگر راستے اجازت دیتے، موسموں کی رضا مندی شامل ہوتی اور سب سے بڑھ کر خدا کا حکم ہوتا تو آج میرا نام بھی راکاپوشی سر کرنے والوں میں ہوتا۔ خیر...... جو نصیب میں تھا ہو کر رہا۔

آنکھیں جل تھل ہونے لگیں اور میرا سر خود بخود ایک طرف کو ہوگیا۔

☆......☆......☆

جب بھی اترو گے تم پہاڑوں سے
نیچے بہتے بیاس کے کنڈے
ایک پتھر ملے گا پانی میں
جی کرے تو اٹھا کے رکھ لینا
ٹوٹ کر یہ میں گرا تھا چوٹی سے!

آہ! میں زندہ تھی۔ آج تصویریں کالج میں سب کے ہاتھوں میں تھیں جو حکومت کی طرف سے کالج والوں کو دی گئی تھیں۔ اخبار میں چند تصویریں لگائی گئی تھیں۔ یہ بھی غنیمت تھا۔ سب لوگ ملیحہ راجپوت کے بارے میں جان کر شاکڈ رہ گئے تھے کہ یہ اتنے سخت امتحان کے بعد سرخرو کیسے تھی۔

اور پھر ایک پریس کانفرنس ہونا تھی اور اس پریس کانفرنس میں اس ''مہم'' کے بارے میں بہت سارے سوال تھے۔ جو میرے منتظر تھے۔

صحافی پوچھ رہے تھے۔

''کیسا محسوس ہوا جب پہلی بار اس دنیا کے عظیم پہاڑ پر قدم رکھا؟''

''کیا بتاؤں! ان شہروں کی خوبصورتی سے ہٹ کر اگر پہاڑوں پر جائیں تو خدا کی قدرت یاد آتی ہے۔ ہمارے رات دن اور پہاڑوں پر کٹنے والے رات دن الگ ہوتے ہیں۔ پہاڑوں پر رات کچھ اور ہی ہوتی ہے۔

پہاڑوں پر آسمان روشن رہتا ہے۔ بجھتا ہی نہیں۔ دریا روشن رہتا ہے۔ کبھی تھکتا ہی نہیں۔ لگتا ہے آسمان کی چادر نے تاروں کی شکل میں زری کی چادر اوڑھ لی ہو۔ سب کچھ شفاف دکھتا ہے۔

جس طرح جہاز سے رات میں شہر روشنی کا استعارہ ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح پہاڑوں سے بھی شہر روشنی کے ٹمٹماتے جگنو محسوس ہوتے ہیں۔''

"مس ملیحہ! کیا اب پھر سے کوہ پیمائی کریں گی آپ؟" ایک صحافی کا چبھتا ہوا سوال آیا۔
"جی بالکل! میری بیٹی جب تک راکاپوشی سر نہیں کر لیتی کوہ پیمائی کرتی رہے گی۔"
اس سوال کا جواب میری ماں نے دیا تھا۔ بے اختیار میں نے امی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ میرے بال لہرانے لگے تو ایک دم سے ایک صحافی کا سوال آیا۔
"مس ملیحہ! اکثر دیکھا گیا ہے کہ کوہ پیماؤں کے بال اپنا حسن کھو دیتے ہیں مگر آپ کے بال تو لگتا ہے پہاڑوں کے سفر نے مزید خوبصورت کر دیے ہیں۔"
"اِس سوال کا جواب میں نہیں، میری ممتا کا دوسرا نام ...... لائف بوائے شیمپو دے گا۔" میں نے اپنے بیگ سے لائف بوائے شیمپو کی بوتل نکال کر ہاتھ میں ایوارڈ کی طرح لہرائی۔
"لائف بوائے شیمپو نے میرا ساتھ میری ماں کی طرح دیا۔ میری امی نے ہمیشہ لائف بوائے شیمپو کو میرا ساتھی بنا کر رکھا اور پہاڑوں کے سفر میں بھی میں لائف بوائے شیمپو کی طاقت اور حفاظلت کو مان گئی۔
سچ ہے اگر لائف بوائے شیمپو میرے ساتھ نہ ہوتا تو شاید میرے بال بھی کھردرے اور بے رونق ہو کر مجھ سے ناتا توڑ دیتے۔
آئی لو یو امی اینڈ آئی لو یو لائف بوائے شیمپو، آج میں ببانگ دہل کہتی ہوں۔ دنیا میں ہمالیہ عظیم کے بعد اگر میرے لیے کوئی چیز عظیم ہے تو وہ ہے لائف بوائے شیمپو۔"
میرے اتنا کہنے کے بعد ہی پریس کانفرنس اپنے اختتام کو پہنچی اور پھر میں اور امی بھی گھر آ گئے۔

☆......☆......☆

جیسے ایک دیہات کے دوست اچانک مل کر وادی میں
گاؤں بھر کا پوچھتے ہیں
لگتا ہے بھی آدمی آنکھیں کھول کے سوتی ہے
رات پہاڑوں پر کچھ اور ہی ہوتی ہے
ہم ماں بیٹی مل کر رو رہے تھے۔ یہ آنسو خوشی کے آنسو تھے۔
اعتماد کے آنسو تھے۔
محبت کے آنسو تھے۔
جیت کے آنسو تھے۔
میں ایک ایک بات، ایک ایک یاد امی سے Share کر رہی تھی۔

☆......☆......☆

میری ماں نے میرا ہر ہر پل ساتھ دیا اور پورے سات سال بعد میں پھر سے قراقرم سر کرنے نکلی ہوں۔ اپنے لائف بوائے شیمپو پر اعتماد کے ساتھ مگر...... میرے ساتھ میرے لائف پارٹنر اریب حسن بھی ہیں۔
مجھے امید ہے ہم دونوں اب مل کر اس پہاڑ کو سر کر لیں گے۔
سفر شروع ہے اور میری ماں کی دعاؤں کے دیپ نشانِ منزل بن رہے ہیں۔
اچھے لگتے ہیں یہ پہاڑ مجھے
چوٹیاں بادلوں میں اُڑتی ہیں
پاؤں بر خاب بہتے پانی میں
گھومتے رہتے ہیں ندیاں
کتنی سنجیدگی سے بہتے ہیں
کس قدر مستقل مزاج ہیں یہ
اچھے لگتے ہیں یہ پہاڑ مجھے!

☆☆......☆☆

ناول

قسط 16

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں، جو دھڑکنیں
بے ترتیب کر دیں گی، رفعت سراج کے جادوگر قلم سے

چمن بھی ڈاکٹر علی عثمان کو سامنے پا کر اپنی حواس باختگی کنٹرول کرنے لگی۔
''السلام علیکم ڈاکٹر......'' اس نے اپنی پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پا کر سلام کیا۔
''وعلیکم السلام...... آپ...... اس وقت؟ خیریت ہے ناں......'' ڈاکٹر علی عثمان کی نظریں مہ وش پر تھیں جو بالکل نڈھال نظر آ رہی تھی۔
''جب خیریت نہیں ہوتی تو ہاسپٹل میں آتے ہیں...... ورنہ تو ہاسپٹل کے نام سے ہی پناہ مانگتے ہیں۔ اس کو دو گھنٹے سے وومیٹنگ ہو رہی ہے۔ دیکھیں کتنی ویک لگ رہی ہے جیسے پتہ نہیں کب سے بیمار ہو۔'' چمن نے پریشانی سے مہ وش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''اوہ...... آپ اسے ایمرجنسی میں لے کر جائیں...... میں پانچ منٹ میں پہنچتا ہوں۔'' ڈاکٹر علی عثمان نے ابھی تک سیل فون ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ جیب میں ڈالتے ہوئے ایمرجنسی کی طرف اشارہ کیا۔
''ماشاء اللہ...... بہت کیوٹ ہے۔ ڈونٹ وری بے بی...... ابھی تھوڑی دیر میں آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی اور بھاگتی ہوئی اپنے گھر جائیں گی۔
ڈاکٹر علی عثمان نے مہ وش کا گال چھو کر اس کے اندر نئی روح پھونکنے کی کوشش کی۔
ہم تو نانا کے گھر رہتے ہیں خالہ...... مہ وش نے لفظ 'اپنے گھر' سن کر بڑی کمزور آواز اور خاصی حیرت سے چمن سے کہا تھا۔
''نانا کا گھر...... خالہ...... ڈاکٹر عثمان چونکے۔ وگرنہ اس مرتبہ تو وہ یہی سمجھے تھے کہ چمن اپنی بیٹی کو لے کر آئی ہے۔
''اچھا اچھا...... جلدی چلو......'' چمن اسے اسی طرح اپنے ساتھ کھینچتی ہوئی ایمرجنسی کی طرف بڑھ گئی جس انداز میں ہاسپٹل میں داخل ہوئی تھی۔
O.T کی طرف بڑھتے ہوئے ڈاکٹر علی کے چہرے پر تفکر کا عکس تھا۔

☆......☆......☆

جانے کیا وقت ہو چلا تھا جب وہ گھر پہنچا تھا۔ زندگی میں شاید پہلی بار وہ بغیر Change کیے ٹوٹی شاخ کی طرح بیڈ پر اوندھا گر گیا اور اسی طرح گہری نیند میں چلا گیا۔

آج اس نے ڈنر بھی خوب ڈٹ کر کیا تھا۔ دل میں وحشتیں بھری ہوئی تھیں اور دماغ میں پندار کی کرچیاں......

ماؤف ذہن کے ساتھ کھاتا چلا گیا۔ پہلے ایک سالم فش...... پھر لاہوری چرغہ، افغانی پلاؤ رائتہ...... پائن ایپل جوس، چاکلیٹ آئس کریم ...... پلیٹ بھر سلاد اسے ہوش نہیں تھا کہ اس نے کس رفتار سے ڈرائیو کی بھرے پیٹ کی وجہ سے بار بار آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں۔ اسی لیے بیڈ پر گرتے ہی سو گیا۔

اس دنیا کو دار المشقت کہا گیا ہے۔ بے شمار انسان دل کے درد چھپائے اپنے معمولات نمٹاتے ہیں۔ جو قہقہہ لگا کر ہنستا ہے اُسے رشک سے دیکھتے ہیں۔ اِس بات سے بے خبر...... کہ اِس مشقت گاہ میں کوئی نہیں بچا ہوا۔ دکھ، پریشانی، رویوں کے زخم...... بیماریاں، سب کے ساتھ ہیں۔ یہ دنیا جائے عبرت ہے۔ جائے رشک نہیں۔

بے پناہ خوشی اور بے پناہ دکھ ظرف کا پیمانہ ناپنے آتے ہیں۔ انسان کی حقیقی اور درست قیمت کا تعین کرنے آتے ہیں۔

مگر جس پر غم آتا ہے وہ سمجھتا ہے۔ جنت سے بے دخلی کے بعد وہ تیسرا ہے۔

''ثمر کو...... سنہری چھپر کھٹ سے گرنے کے بعد بانس کے جنگل کا سامنا تھا۔ ہر دو قدم پر ٹھوکر لگ رہی تھی۔ گز بھر کا فاصلہ صدی کا سفر لگ رہا تھا۔ ہمیشہ کے لیے لطف و روحانی مسرتوں کے چھن جانے کا احساس گھات میں بیٹھے چیتے کی سرخ آنکھوں کی طرح خوفناک تھا۔

گہری نیند کی پناہ لی تھی۔ خود فریبی کی ریشمی چادر اوڑھ لی تھی۔

☆......☆......☆

نانا جان کو دوا کھلانے کے بعد ان کے کمرے میں لگے بے پالش جدی پشتی آئینے میں خود کو ایک نظر دیکھا تھا۔

واش بیسن پر آویزاں چٹخے ہوئے آئینے میں خاصی توجہ سے دیکھا تھا۔ پھر اپنے کمرے میں آ کر ماں کی سہ رخی ڈریسنگ ٹیبل میں مختلف اینگل سے اپنا جائزہ لیا تھا۔

اتنی بھی حور پری نہیں ہوں کہ کوئی میری خاطر اپنی بیوی کو چھوڑ دے...... اس نے اسی فطری سچائی کے ساتھ تجزیہ کیا جو اس کے دل میں قدرتی چشمے کی طرح اُبلتی رہتی تھی۔

لیکن جو کہہ کر گئے ہیں...... اس پر یقین تو کرنا پڑے گا۔

عورت اپنی زندگی سب سے حسین دھوکہ خوب دل کھول کر اور بڑی خوشی سے کھاتی ہے۔

ایک خوشی کا سمندر تھا۔ سمندر بھی وہ جس پر ماہِ کامل نثار ہوتا ہے تو جوار بھاٹے کی صورت چاند کا منہ چومنے کے لیے مچل جاتا ہے۔ لہریں گاہے گاہے پانی کی تنی ہوئی چادریں محسوس ہوتی ہیں۔

ایک ہلکا سا دباؤ دل پر وقفے وقفے سے پڑ رہا تھا۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا ادراک تھا۔ دل دھڑکنے کا انداز بدل

گیا تھا۔ ہر دھڑکن خوش گواری اور تازگی کی پیامبر تھی۔
ایک لہر سی پل میں گزرتی تھی اور اس طرح گویا پیاسی زمین ساون کی پہلی پھوار کو والہانہ اپنے دامن میں سمو لیتی ہے۔
چاہے جانے کے احساس کی لہریں...... اس کے وجود کو گدگدا رہی تھیں۔ وارفتگی ان لہروں کا ردِعمل تھی۔ جی چاہتا تھا بس وہ پلک جھپکتے اس کے سامنے آ کھڑا ہو۔ وہ آنکھیں بند کر لے اور آنے والا خاموش محبت پاش نظروں سے اسے تکتا ہو۔
کھڑے کھڑے ذات اتنی معتبر ہو گئی تھی۔ صراحی دار گردن میں سریا پھنس گیا قربتوں کی چاہ میں نظر جھکنے لگی، حیا آنے لگی۔

☆......☆......☆

مہ وش کو فوراً ڈرپ لگا دی گئی تھی۔ چمن اس کے قریب بیٹھی گہری سوچ میں تھی۔ مہ وش نے اس کا ہاتھ تھاما ہوا تھا اس خوف سے کہ خالہ اسے اکیلا چھوڑ کر نہ چلی جائے۔
ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑی تو چمن نے چونک کر مہ وش کی طرف دیکھا۔ جو گہری نیند سو چکی تھی۔ چمن نے اس کے چہرے پر سکھ کی کیفیت محسوس کر کے خود بھی سکھ کا سانس لیا اور آہستگی سے اس کا ہاتھ بیڈ پر ٹکا دیا۔ اور گھڑی میں وقت دیکھا۔
رات کے دو بج چکے تھے۔ آدھا گھنٹہ پہلے عطیہ بیگم کا فون آیا تھا بہت پریشان تھیں۔ چمن نے ان کو تسلی تشفی دی اور مہ وش کی طرف سے اطمینان دلایا۔ سوئے ہوئے کی رات چھوٹی اور جاگتے ہوئے کی پہاڑی سی ہوتی ہے۔
ڈاکٹر نے کہا تھا کہ مہ وش کو کم از کم دو ڈرپس لگیں گی کیونکہ اس کے جسم میں پانی کی کمی خطرناک حد تک ہو چکی ہے۔ بچے تو یوں بھی پھول کی طرح نازک ہوتے ہیں۔
آپ اسے تین ڈرپس لگا دیں...... اس نے لفظ ''خطرناک حد تک'' سن کر بڑی بے ساختگی سے کہا تھا۔
''بچی بے زار ہو جائے گی...... بچے نارمل حالت میں واپس آ جائیں تو بیڈ پر لیٹنا پسند نہیں کرتے۔ انہیں Activity سوجھنے لگتی ہے۔ بس آپ اس کی ڈائٹ کا خیال رکھیے گا۔ یہ دو دن میں سیٹ ہو جائے گی۔ بچوں کو بیڈ پر لیٹنا ایسا ہی لگتا ہے جیسے کسی جرم پر بڑی سخت سزا دے دی گئی ہو۔ ڈاکٹر علی نے بڑے بے ساختہ مگر سادہ انداز میں اس کی فرمائش کا جواب دیا تھا۔
ماشاءاللہ آپ کے کتنے بچے ہیں؟ Experienced لگتے ہیں چمن کے منہ سے بے ساختگی میں پھسل گیا تھا۔ ڈاکٹر علی کے چہرے پر یکلخت سنجیدگی جھلکنے لگی۔
فی الحال تو میری ایک چھوٹی سی بہن ہے...... اور بس......!
''چھوٹی سی بہن......!'' چمن نے پوری آنکھیں کھول کر ڈاکٹر علی کو سر سے پاؤں تک دیکھا تھا۔
آپ اتنی حیران کیوں ہو رہی ہیں؟ انسان کے بہن بھائی بھی ہوتے ہیں انہوں نے شگفتہ انداز میں کہا تھا اور فوراً ہی کسی وارڈ کی طرف بڑھ گئے تھے۔
چمن ابھی تک بیٹھی سوچ رہی تھی۔ چھوٹی سی بہن...... اتنا بڑا بھائی......!''

☆......☆......☆

پو پھٹتے ہی بانو آپا کی آنکھ کھل گئی تھی۔

آنکھ کھلتے ہی پہلا خیال ثمر کا آیا...... اونگھتے وجود میں بجلی سی کوند گئی۔

پتہ نہیں رات گئے کہاں مارا مارا پھر تا رہا میرا بچہ...... کیکر بو یا تھا گھر میں...... نیم لگالیتی تو بھی کچھ سکھ ہوتا...... سایہ بھی ملتا اور میٹھی نبولیاں بھی...... بھلے کوئی پھوہڑ آجاتی...... گھر میں بچے کھیلتے تو پھوہڑ پن بھی برداشت کرلیتی...... منحوس...... پاگل بنادیا میرے بچے کو......

سلیپر پاؤں میں پھنسا کر خود کو گھسیٹتی ہوئی باہر کی طرف چلیں......سب سے پہلے نیچے جھانک کر ثمر کی کار دیکھ کر تسلی کی پھر قدرے سکون کا سانس بھر کر واش روم کی طرف چل پڑیں۔

☆......☆......☆

ثمر کی آنکھ خود بخود کھل گئی تھی...... اس نے حواسوں میں آتے ہی اپنی حالت پر غور کیا۔ پاؤں میں جرابیں اور گلے میں ٹائی تک پھنسی ہوئی تھی۔ ایک گزری ہوئی صبح پائل چھنکاتی مسکراتی سامنے آ کھڑی ہوئی۔

ایک رات حیدرآباد سے کراچی تک خود ڈرائیو کر کے رات کے تین بجے جب گھر پہنچا تو کسی نے بڑی چاہ سے اس کی تھکن دونوں ہاتھوں میں سمیٹی تھی۔ جوتے جرابیں، ٹائی اُتاری تھی سر کے نیچے تکیہ ٹھیک کیا تھا۔ شرٹ کے اوپری بٹن کھولے تھے نیند سے بوجھل آنکھیں چومی تھیں۔

وہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہو گیا اور لیٹے لیٹے ٹائی ڈھیلی کر کے اتارنے لگا اگر یہ عورت اسی طرح آسیب بن کر میرا پیچھا کرتی رہی تو میں ایک دن ضرور پاگل ہو جاؤں گا۔

یہ تنہائی اس کمرے کو قبرستان بنادے گی۔

مجھے تنہائی سے پرہیز کرنا چاہیے۔

''میں اس عورت کی ایک ایک نشانی اس کمرے سے نکال کر آگ لگادوں گا۔'' وہ ٹائی کھینچتے ہوئے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

☆......☆......☆

اس بے وقوف لڑکی کا نانا تو قیامت تک 'ناں ناں' کرتا رہے گا۔''

لڑکی قابو آگئی تو ایک دن میں بہت کچھ بدل جائے گا۔

عشق کا اعتراف کر کے تو آگیا ہوں۔

اسے تو خوش ہونا چاہیے۔ ویران اجاڑ سے گھر میں کیا کر رہی تھی؟

اس کی تو Value بنادی ہے۔ اس کی مردانہ اَنا عود کر آئی۔

ابھی فون کرتا ہوں۔ آخر اس کا 'ری ایکشن' بھی تو دیکھنا چاہیے۔ ثمر نے اِدھر اُدھر ہاتھ مار کر سیل فون ٹٹولا۔

اوہ...... اب اس نے کوفت بھرے انداز میں گہری سانس کھینچی۔ اور بڑے مجبوری کے انداز میں اُٹھا صوفے پر پڑا کوٹ اٹھایا۔ جیبیں ہاتھ سے دبا کر چیک کیں۔ ایک جیب سے سیل فون برآمد ہو گیا۔

واپس پلٹا اور دھپ سے بیڈ کے کنارے پر ٹک گیا۔ ندا کا نمبر ڈائلنگ لسٹ میں موجود تھا۔ فوراً ڈائل کر دیا۔

رنگ پاس ہو رہی تھی۔ دل کی دھڑکن بے ترتیب ہو رہی تھی۔

☆......☆......☆

نور کے تڑکے تو آنکھ لگی تھی۔ موبائل کی رنگ یوں لگی گویا کسی نے گرم سلاخیں کانوں میں گھونپ دی ہوں۔

گہری نیند میں بڑی مشکل سے رابطہ منقطع کیا...... مگر رنگ دوبارہ ہونے لگی ندا نے پھر سابقہ حرکت کی اور سیل فون تکیے کے نیچے دبا کر سر رکھ کر پھر سے گہری نیند میں جانے لگی۔

اب تکیے کے نیچے سے رنگ کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے اپنی پسند کا گیت بطور رنگ ٹون ڈاؤن لوڈ کیا ہوا تھا۔ تکیے کے نیچے سے گیت کی آواز آ رہی تھی۔

ایس توڑا ڈھا دکھ ناں کوئی

کسے دا یار نہ وچھڑے

سب کے یاروں کی ایسی کی تیسی...... اللہ کرے سب بچھڑ جائیں۔ جہنم میں جائیں اس نے یہ سوچ کر سیل تکیے کے نیچے سے نکالا کہ پاورڈ آف ہی کر دے۔ تا کہ جان چھوٹے اور وہ آرام سے سو جائے۔

کسے دا یار نہ وچھڑے

مغنی کی آواز کے ساتھ ہی شبیر حسین کی دھاڑ بھی گونجی۔

''ارے یہ اتنی دیر سے بھونپو بج رہا ہے۔ کسی کو سویرے سویرے مصیبت آئی...... ارے امریکہ میں تو رات ہو رہی ہو گی۔ لگتا ہے اسی ناہنجار کو سارے سودے بیچ کر باپ کی یاد آئی ہو گی۔ ذرا میری بات کرانا...... ابھی سناتا ہوں اس کو دو چار......

ندا ہکا بکا آنکھیں پھاڑے اسکرین کی طرف گھور رہی تھی۔ کال ریسو کرنے میں دیر کر دی تو رابطہ پھر منقطع ہو گیا تھا۔ اب اسکرین پر تین مس کال ظاہر ہو رہی تھیں۔

اتنی صبح صبح سر نے فون کیا...... لگتا ہے ساری رات سوئے نہیں۔ نانا کی گھن گرج ایک طرف وہ تو حسین خیال میں کھو چکی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اب اسے کال بیک کرنا چاہیے۔ اسی لمحے از سر نو Ring شروع ہو گئی۔

کسے دا یار نہ وچھڑے

ارے میں کہہ رہا ہوں میری بات کراؤ۔

ندا نے گھبرا کر Silent کا بٹن دبا دیا۔ اور اُلجھن میں پڑ گئی کہ کال کیسے وصول کرے۔ نانا جان کے تو کان ہی اِدھر لگے ہوئے ہیں۔ ثمر کا نام ہنوز Blink ہو رہا تھا۔

''نانا جان آپ سو جائیں...... کسی رانگ نمبر سے کال آ رہی تھی۔'' مجھے بھی بہت زور سے نیند آ رہی ہے۔

جملہ ادا کرتے کرتے اس مرتبہ بھی رابطہ منقطع ہو گیا۔ اس نے کوفت کے عالم میں اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا اور سیل فون مٹھی میں دبا کر واش روم کی طرف چل دی۔

ارے کس بدبخت کو اس سے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں۔ نماز کے نہ روزے کے صبح صبح شیطانی چکر...... شبیر حسین کی بڑبڑاہٹ سناٹے میں یوں گونج رہی تھی جیسے گھنے جنگل کی رات میں شیر دھاڑ رہا ہو۔

ندا نے واش روم میں داخل ہو کر دروازہ بند کر کے بالٹی آگے کر کے شاور کھول دیا اور ثمر کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

ثمر بری طرح بے زار ہو کر واش روم کی طرف بڑھا ہی تھا کہ سیل فون کی رنگ نے پاؤں میں زنجیر ڈال

دی۔لپک کر آگے ہوا اور سیل فون اُٹھا کر Caller کا نام دیکھا اور جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔سامنے ندا کا نام Blink ہو رہا تھا۔

لگتا ہے تنگ کر رہی تھی۔ایک طمانیت کے احساس کے ساتھ اس نے کال وصول کی۔

''جی محترمہ...... کیا نیند کی گولیاں کھا کر سو رہی تھیں۔'' ثمر کے لہجے میں تازگی عود کر آئی۔

سونے کے لیے نیند کی گولی کھاتے ہیں اور خودکشی کرنے کے لیے بہت ساری نیند کی گولیاں...... فی الحال میرا مرنے کا کوئی ارادہ نہیں...... اُدھر سے فطری اور بے ساختہ انداز میں جواب آیا۔

زندگی بہت حسین لگنے لگی ہے۔ایک اچھے بھلے انسان کو پاگل جو بنا دیا ہے...... ہے ناں......؟'' ثمر بہت عجلت میں تھا۔اسے ہر بال پر شاٹ کھیلنا تھا۔

''ہائے اللہ...... سر...... آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟'' ندا گھبرا کر شرما کر کہہ رہی تھی۔

''تمہارا کوئی سر پیر بھی ہے؟ میں تم سے شادی کرنے جا رہا ہوں اور تم ابھی تک سر دھڑ پاؤں میں اٹکی ہوئی ہو۔ثمر نے بہت پیار بھرے لہجے میں جھاڑ پلائی۔

''تو پھر کیا کہوں؟'' ندا کی آواز میں گھبراہٹ اور بے بسی تھی۔

''ثمر نام ہے میرا......''

آپ کا نام تو کبھی بھی نہیں لے سکتی۔شروع سے سر جو کہہ رہی ہوں۔ندا کا بڑا معصومانہ جواب آیا۔

''ٹھیک ہے تم 'سر' کہتی رہو۔بعد میں جب بچے پوچھیں گے کہ آپ ہمارے پاپا کو سر کیوں کہتی ہیں تو پھر جواب دیتی رہنا...... ثمر کے ہونٹوں پر لاشعوری طور پر مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔

مگر بجائے جواب کے کانوں میں ٹوں ٹوں کی آواز آنے لگی۔ندا نے یقیناً خود ہی رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

شاید یہ شگفتگی اس کے حوصلے سے زیادہ تھی جس کی وہ تاب نہ لا سکی تھی۔ثمر نے گہری سانس لی اور دوبارہ کوشش نہیں کی۔

ندا کی عمر کی لڑکیوں کے لیے اتنا ہی کافی ہوتا ہے۔چاہنے والا متوقع فیملی تک زیرِ بحث لانے لگے تو یہ سچائی اور سنجیدگی کی ضمانت سمجھ لی جاتی ہے۔

ایک بہت چھوٹی سی پیاری سی چڑیا...... پنجرے میں رقصاں تھی سرمستی میں دھیان ہی نہیں ایا کیا جنگل کیا پنجرہ......

اس نازک عمر میں ہر راہ پلِ صراط ہوتی ہے۔اگر سو سال کی زندگی بھی ہو تو آنے والے سالوں کے فیصلے اسی عمر میں ہو جاتے ہیں۔

باغ باڑی والی دادی یا نانی......

میکے سسرال کی Recognized شخصیت یعنی 'محصنت'' (م+ح+ص+ن+ت) یا کسی بھول کے بعد قبر تک ڈھول کا سفر......

جسے پیا چاہے وہی سہاگن
جو دل سے اتر جائے تو برہن
سب کچھ بس اسی نازک عمر میں ہی تو ہو جاتا ہے

یہ نازک عمر ایک 'شہ سرخی' ہوتی ہے۔ باقی پھر تفصیلات، وضاحتیں، عدالتیں، ضمانتیں، پنچائتیں، رشتے در رشتے' پیچ در پیچ رویے، یا تو سر سبز وادیاں...... یا پھر اندھری گھاٹیاں، کھائیاں۔
عورت کی زندگی میں بھول کی تو گنجائش ہی نہیں......
نہ رشتے معاف کرتے ہیں نہ معاشرہ......
مگر نازک عمر میں نازک موڑ آ ہی جاتے ہیں۔ بہت کچھ اچھا بھی لگتا ہے اور سچا بھی...... پھر دل من مانی کر کے ایک جوا تو کھیلنے کے لیے تیار ہو ہی جاتا ہے۔
سیدھی سادی' جذباتی، باحیا...... کم اعتماد' ذہن رسا سے عاری...... وہ تو اس ہوش رُبا انکشاف کے بعد کہ کسی نے اپنی برسوں کی پرانی شادی اس کے عشق میں گنوادی چاہنے والے نے بغیر Surity کے اتنا کچھ کر ڈالا۔ اب اسے بھی تو کچھ کرنا ہوگا۔
اور پھر شادی اب نہیں ہوگی تو کب ہوگی؟
خدانخواستہ نانا جان اللہ کو پیارے ہو گئے تو میری شادی کیسے ہوگی؟
نرگس آنٹی جب تک لڑکا ڈھونڈیں گی تب تک میں اکیلی کیسے رہوں گی؟ ثمر نے دل میں چاہتوں کا دیا جلا دیا تھا۔ دل جواز ڈھونڈنے لگا۔ اب تو جو ہونا ہے جلدی سے ہو جائے۔
میں تو نانا جان سے صاف صاف کہہ دوں گی۔ آج کل سب لَو میرج کرتے ہیں۔
لیکن میں نے تو سر سے لَو نہیں کی۔ اس کی فطری صداقت نے سر ابھارا۔
خیر سر تو کرتے ہیں...... دوشیزگی والہانہ تھی۔
سر کا تو گھر بھی بہت شاندار ہوگا۔ اب کئی سمتوں میں ذہن دوڑنے لگا۔ فرنیچر بھی Latest ہوگا۔
اتنے ویل آف ہیں...... بجٹ تو نہیں بنتا ہوگا...... جب دل چاہتا ہوگا شاپنگ پر چلے جاتے ہوں گے۔
ان کی کار کا ماڈل بھی چینج ہوا ہے۔ ہر سال ہی چینج کرتے ہوں گے وہ...... حسین خواب دیکھنے لگی۔ جو اس عمر کی لڑکیوں کی کمزوری ہوتے ہیں۔
ساتھ ہی اسے مشکل کا حل بھی سوجھ گیا۔
نانا جان تو بات سننے سے پہلے ہی کانوں پر ہاتھ رکھ لیں گے۔
میں سر سے کہتی ہوں وہ پہلے نرگس آنٹی سے بات کریں۔ اور اپنی امی جان کو ضرور لے کر آئیں۔
نرگس آنٹی کا خیال آتے ہی ذہن میں برپا طوفان تھم گیا۔ جیسے کشتی کنارے پر پہنچ گئی ہو۔ طمانیت بھرا سانس لیا...... اور دوبارہ سے سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☆......☆......☆

رات دیر تک تمہاری راہ دیکھی...... خیریت رہی ناں بیٹا؟ بانو آپا نے ثمر کو دکھا دکھا کر لڑکھڑاتے' لنگڑاتے آملیٹ، پراٹھے پر مشتمل ناشتہ بنا کر ہی لیا تھا۔ اب چائے لیکر ٹیبل کی طرف آرہی تھیں۔
اور وقتوں میں تو ثمر اپنی موجودگی میں انہیں اپنا کوئی ذاتی کام کرنے ہی نہیں دیتا تھا۔ مگر آج ثمر کی ذہنی کیفیت اور طرح کی تھی۔ سارا دن منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ یہ بھی کرنا تھا وہ بھی کرنا تھا۔ سب سے بڑھ کر ماں کو راضی کرنا تھا۔

جی امی جان......رات دوستوں کے ساتھ کھانے پر چلا گیا تھا۔ سب خیریت ہے کوئی فکر کی بات نہیں۔ اس نے خاص بات سے پہلے تسلی و تشفی دی۔
شکر ہے......بس اپنا خیال رکھا کرو۔ ابھی تمہاری کوئی ایسی خاص عمر نہیں ہے۔ فکریں انسان کو بوڑھا کر دیتی ہیں۔ بانو آپا نے اپنی بات منوانے کی نیت سے لاڈ دلار کا آغاز کیا۔
جی امی جان......بس اب تو ساری فکریں ختم ہو جائیں گی۔ آپ کی بہت ساری خواہشیں پوری ہو جائیں گی۔
انشاءاللہ بانو آپا کے لہجے میں ترنگ سی آ گئی۔ محبت پاش نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا۔
تو پھر آپ آج ندا کے گھر چل رہی ہیں ناں......ویسے ہی بہت دیر ہو گئی ہے میرا خیال ہے اب مزید دیر نہیں ہونا چاہیے۔
''ندا......؟ کون ندا؟ بانو آپا اپنے حافظے پر زور دینے لگیں۔
وہی جس کے نانا آپ کو پسند نہیں آئے۔ مگر مجھے شادی نانا سے نہیں ندا سے کرنا ہے۔ ثمر نے اب بڑی جرأت کے ساتھ مطلب کی بات شروع کر دی۔
بس......اس لڑکی کا نام دوبارہ نہ لینا۔ شہر میں لڑکیوں کا قحط ہے جو میں پھر سے ذلیل ہونے وہاں جاؤں؟ بانو آپا کو تو بھڑیں چٹ گئیں ویسے ہی ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ تھیں۔ ٹمپرامنٹ تو رہا ہی نہیں تھا۔ میں نے یہ قصہ اسی دن ختم کر دیا تھا۔ تم پھر سویرے سویرے لے کر بیٹھ گئے۔
گھر در دیکھو......جیسے قوم ثمود کے کھنڈرات' نانا جیسے آثارِ قدیمہ ہمارے پاس کس چیز کی کمی ہے؟ ہمیں کسی کی دولت یا غربت سے کیا لینا دینا ثمر ماں کے از سر نو کھلے انکار پر اندر ہی اندر پیچ و تاب کھانے لگا۔
رہن سہن گھر بار سب کچھ دیکھنا پڑتا ہے۔ کل کو بال بچے ہوں گے ان کا وہ ننھیال ہوگا۔
اور پھر موت زندگی اللہ کے ہاتھ میں......نانا کو ساتھ جہیز میں لائے گی شادی کے بعد کون دیکھ بھال کرے گا بڑے میاں کی......خود ہی عقل کی بات سوچو۔
بانو آپا آخری گیئر میں انجن چلا رہی تھیں۔ بریک لگانا محال تھا۔ یہ وہ ٹرین تھی جس کے سامنے گدھا آنے پر بھی بریک نہیں لگائے جا سکتے تھے۔
ثمر ایک لفظ بولے بغیر ٹشو سے ہاتھ منہ صاف کر کے کھڑا ہو گیا۔ بانو آپا نے قدرے تعجب سے بیٹے کی طرف دیکھا۔
''ارے چائے تو ختم کرو......'' ثمر سنی ان سنی کر کے اپنے بیڈروم کی طرف بڑھتا چلا گیا۔
افشاں آج دو تین لڑکیوں کی تصویریں لا رہی ہے...... یہاں کون سی عشق محبت کی کہانی ہے۔ سنبھال لوں گی۔
بانو آپا نے چند ثانیے متفکر رہنے کے بعد اپنا پیدائشی اعتماد بحال کرنے کی کوشش کی۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر علی عثمان آف کر کے جا رہے تھے۔ زیادہ تر وہ نائٹ ہی کو ہوتے تھے اس کی ایک خاص وجہ ان کی بہن تھی۔ رات کو وہ سو جاتی تھی دن میں وہ اس کے سامنے ہوتے تھے۔

چمن بھی گھر جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ مہ وش کو چیک اپ کے بعد ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔
میں اپنے گھر جا رہا ہوں...... آپ اپنے گھر جائیں۔ اور آئندہ بیمار ہو کر یہاں آنے کی ضرورت نہیں...... آپ کو پتا ہے نا Health Is Wealth وہ جھک کر مہ وش کا گال چھو کر بہت اپنائیت سے کہہ رہے تھے۔ مہ وش نے بھی جواب میں مسکرا کر گردن ہلائی۔
''اللہ آپ سے بہت اچھا کام لے رہا ہے۔ وہ لوگ بہت لکی ہوتے ہیں جو بھلائی کے کام کے لیے منتخب کیے جاتے ہیں۔
ڈاکٹر علی چمن کا حوصلہ بڑھانے کی نیت سے کہہ رہے تھے۔ انہیں یاد تھا کس طرح وہ مہ وش کی ننھی سی بہن کو سنبھالتی رہی۔ جس کی ماں اس کو جنم دے کر خالق ابدی سے جا ملی تھی۔
تھینک یو ڈاکٹر...... بہر حال یہ میرا فرض ہے۔ کسی پر بھی احسان نہیں۔ چمن کو بھی آخر کچھ تو کہنا تھا۔
مہ وش کے اور کتنے بہن بھائی ہیں؟ ڈاکٹر عثمان شاید بے لوث خالہ کی ذمہ داریوں کا اندازہ لگانا چاہ رہے تھے۔
ڈاکٹر انکل میری صرف ایک بہن ہے ماہ پارہ...... نور العین تو اللہ میاں کے پاس چلی گئی۔ وہاں ماما بھی ہیں ناں...... نور العین بہت چھوٹی تھی ماما کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ مہ وش بلا سوچے سمجھے بے ساختہ بول پڑی تھی۔
چمن کے دل پر چوٹ پڑی اور ڈاکٹر علی کے ذہن پر، انہوں نے بہت ہمدردی اور پیار سے مہ وش کی طرف دیکھا اور چمن سے گویا ہوئے۔
آپ کے اپنے بچے بھی ہوں گے۔ انہیں یاد تھا کہ چمن نے بتایا تھا وہ شادی شدہ ہے۔
ڈاکٹر انکل خالہ کے گھر میں تو بچے ہی نہیں ہیں...... اس سے قبل کہ چمن کچھ کہتی۔ مہ وش پھر پٹر پٹر بول پڑی۔
ڈاکٹر علی نے لاشعوری انداز میں چونک کر چمن کی طرف دیکھا تھا۔ چمن نظر چرا گئی تھی۔
''سوری...... شاید میں پرسنل ہو رہا ہوں۔''
مہ وش بہت کیوٹ ہے۔ میری بھی ایک چھوٹی سی بہن ہے، جو مہ وش کی طرح بہت پیاری باتیں کرتی ہے۔ ایسا کرتے ہیں کسی دن مہ وش کو ٹینا سے ملواتے ہیں وہ بہت خوش ہوگی۔ ڈاکٹر علی بڑی سادگی اور خلوص سے کہہ رہے تھے۔
آپ کی چھوٹی بہن آپ سے کتنی چھوٹی ہے۔ چمن جو حیران سی تھی بے اختیار سوال کر بیٹھی تھی۔
کافی چھوٹی ہے نیکسٹ ویک اس کی برتھ ڈے آرہی ہے۔ ایسا کرتے ہیں مہ وش کو برتھ ڈے میں انوائٹ کرتے ہیں۔ میری بہن کو نئے نئے فرینڈز بنا کر بہت خوشی ہوتی ہے۔
چمن اب بہت توجہ سے ڈاکٹر علی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے جانے کیوں لگ رہا تھا کہ ڈاکٹر علی کا رویہ، خلوص، مسکراہٹ عام نہیں غیر معمولی ہے وہ عام حالات میں ملنے والے ڈاکٹر فزیشن کی طرح محسوس نہیں ہوتے تھے۔ جن سے اپائمنٹ لینے کے بعد جب ملاقات کی جاتی ہے تو لگتا ہے ٹھنڈے کمرے میں کرسی پر کوئی روبوٹ بیٹھا ہے۔
کچھ فزیشن تو مسکراتے تک نہیں ہیں جو مسیحا کا طرۂ امتیاز ہونا چاہیے یوں لگتا ہے جیسے اپنی باڈی لینگویج سے

سمجھا رہے ہوں اتنی فیس میں صرف بات ہو سکتی ہے مسکرانے کے الگ پیسے ہوں گے۔
ڈاکٹر انکل ہم آپ کی سسٹر کی برتھ ڈے میں ضرور آئیں گے۔ مہ وش تو برتھ ڈے کا نام سن کر ہی جذباتی ہوگئی۔
بچے تو برتھ ڈے پارٹی کا انتظار کرتے ہیں۔ خواہ کسی کی ہو۔ کہیں ہو۔ یہ لیجیے خالہ خاموش ہیں مگر مہ وش نے پرامس کرلیا ہے۔
ڈاکٹر علی نے بہت شفیق انداز میں مہ وش کے سر پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔
''Wish U Good Luck۔'' وہ گویا ہوئے۔
''All The Best۔'' چمن کو بھی کہنا پڑا۔
ان دونوں سے پہلے ڈاکٹر علی عثمان باہر کی طرف بڑھ گئے۔ چمن ان کی بیک پر نظر جما کر سوچ رہی تھی۔
چائلڈ اسپیشلسٹ کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔

☆......☆......☆

یہ پہلی مرتبہ تو نہیں ہوا عطیہ...... ہماری بیٹی میں کوئی کمی نہیں ہے۔ بہت اچھی طرح گھر کو سنبھالتی آرہی ہے۔ بات یہی سمجھ آتی ہے کہ ثمر کی والدہ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے سیدھے سیدھے معاملات کو بگاڑ رہی ہیں۔ قدرت کے فیصلے کو ماننے سے انکار کررہی ہیں۔ چمن اب ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہورہی ہے۔
مشکور احمد عطیہ بیگم سے ناشتے کی میز پر خاصے متفکر انداز میں بات کررہے تھے۔ جی اصل مسئلہ چمن کی ساس ہیں۔
ثمر اپنی ذات سے برا نہیں۔ خراب حالات میں بھی اس کے سامنے گئی ہوں تو اس نے بہت عزت و احترام دیا۔ ہمیشہ تمیز سے بات کی۔ لیکن بہرحال ماں پھر ماں ہے۔ ماں کے سامنے شریف انسان بے بس ہوسکتا ہے۔
عطیہ بیگم نے بھی مشکور احمد سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔
اب اس کا سادہ سا حل یہی ہے کہ میں خود ثمر سے بات کروں۔
کیا بات کریں گے...... کیا کہیں گے......؟ عطیہ بیگم بے تابانہ بول پڑیں۔
یہی کہ تمہارے گھر تمہاری اپنی ذات کا سوال ہے۔ ٹھنڈے دماغ سے کام لو چمن کا قصور ہے تو بتاؤ...... وہ تم سے معافی مانگ لے گی۔ تمہاری کوئی غلطی سامنے آئی تو ہم حساب سے خارج کردیں گے۔
گھر بچانا گھر بنانے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ فی الحال ہمیں بہت صبر و ہمت سے محنت کرنا ہوگی۔ نتیجے کے لیے جلد بازی سے پرہیز کرنا ہوگا۔
مشکور احمد اپنے حکیمانہ و مدبرانہ انداز میں ایک حساب سے عطیہ بیگم کو بھی بے چینی سے نکال رہے تھے۔
تو پھر جلدی کیجیے...... ایسا نہ ہو بات بہت زیادہ بگڑ جائے۔ خدانخواستہ عطیہ بیگم کا دل آٹھ پہر ہولتا بولتا رہتا تھا۔ بہتری کے امکانات دیکھ کر جذباتی ہونے لگیں۔
انشاء اللہ...... میں آج ہی ثمر سے اس کے آفس میں ملوں گا۔ فی الحال یہ بات چمن کو بتانے کی ضرورت نہیں۔
مشکور احمد کی چائے کی گرمی قوت کھو چکی تھی مگر ان کی جذباتی کیفیت بہت باقوت تھی...... آدھی پیالی چائے

دوا کے چچوں کی طرح پی گئے۔

☆......☆......☆

نرگس کا ندا کے گھر آنا تو روز کے معمولات میں تھا۔ پانچ منٹ کے لیے ہی صبح صبح ایک راؤنڈ تو لازمی لگاتی تھی۔ جہاندیدہ پختہ عمر خاتون تھیں شبیر حسین کی حالت کے پیش نظر ہر رات دھڑکوں کے ساتھ سوتی تھیں کہ شبیر حسین ذرا کی ذرا میں ہاتھوں میں آ جاتے تھے۔ سوچا کرتی تھیں اب ان میں دھرا کیا ہے وہ تو نواسی کی وجہ سے خود کو اٹھا اٹھا کر بٹھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

شدید احساس ذمہ داری بھی تو روحانی اور جذباتی قوت کا استعارہ ہے۔

آج تو بہت ہی نرالی بات ہوئی۔ ندا انتظار میں بیٹھی نظر آئی۔ گیٹ کھولتے ہی اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر نرگس کو خاموش رہنے کی تاکید کی اور اپنے کمرے میں لے آئی۔

ندا کے پُر اسرار انداز نرگس کو خلجان میں مبتلا کر رہے تھے۔

لیکن جب ماجرا کھلا تو ساتھ ہی منہ بھی کھلا کا کھلا رہ گیا۔

یہ کیا کہہ رہی ہو؟ پہلا جملہ بے ساختگی میں منہ سے خود بخود نکل گیا تھا۔

آنٹی...... وہ کہہ رہے ہیں کہ وہ مجھ سے عشق کرتے ہیں۔ میری خاطر انہوں نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا ہے۔ ندا نے شرمائے شرمائے انداز میں بتایا۔

شادی شدہ مرد کا عشق...... پاگل ہوئی ہو؟

کل کو تم سے شادی کے بعد اسے پھر کوئی نیا عشق ہو گیا تو کیا کرو گی؟

بیٹا...... کچھ لوگ پیدائشی دل پھینک ہوتے ہیں۔ سب کی طرح دل تو انہیں بھی ایک ہی ملتا ہے مگر ان سے سنبھالا نہیں جاتا۔ اِدھر اُدھر پھینکتے پھرتے ہیں۔

دوسری بات...... کچھ مرد عمر بڑھنے کے ساتھ 'ٹھرکی' بھی ہو جاتے ہیں دیکھنے میں تو تمہارے باس خاصے معقول اور سوجھ بوجھ والے لگتے ہیں مگر لگتا ہے یہ شخص بہت ہوشیار ہے...... اس نے گھر دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ اس گھر کی دیواریں بہت نیچی اور دروازے بے قفل ہیں۔

جی......؟ ندا کو ذرا سمجھ نہ آئی۔ ہونق ہو کر نرگس کی شکل دیکھنے لگی۔ ندا کا جی 'اسپیڈ بریکر' بن گیا۔ نرگس نے بھی قدرے سانس لیا اور ندا کے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرنے لگیں۔

یہ شادی شدہ مرد کھیلے کھائے ہوتے ہیں۔ اتنی پیاری بھولی بھالی لڑکی پر جال ڈالنا کوئی مشکل کام نہیں۔ یہ تو تم نے بہت ہی اچھا کیا کہ مجھے سب کچھ بتا دیا۔

تمہاری ماں میری ایک اکیلی سہیلی یا دوست تھی۔ تمہارا ہر طرح سے خیال رکھنا، میری اخلاقی ذمہ داری ہے۔ اس بات کو یہیں ختم کر دو۔

خ...... ختم کر دوں؟ آنٹی سر تو کہہ رہے ہیں......

تم سے کہہ رہے ہیں ناں...... ان سے کہو انہیں جو بات کرنا ہے مجھ سے کریں۔ نرگس نے قصہ کوتاہ کیا۔

ٹھیک ہے آنٹی...... میں سر سے کہہ دوں گی۔ مگر ایک بات بتا دوں۔ سر ایسے ویسے نہیں ہیں۔ انہوں نے تو آج تک آفس میں بھی میرے ساتھ چائے نہیں پی...... نہ کبھی باہر ملنے کے لیے کہا۔ ندا صفائیاں پیش کر رہی تھی

اور نرگس بے ساختہ مسکرا پڑی تھیں۔
بیٹا...... شروع شروع جب لڑکی کو احساس ہوتا ہے کہ کوئی اس پر مرمٹا ہے تو ایسے ہی اس کا دماغ خراب ہوتا ہے۔
بہر حال میں تمہیں مایوس نہیں کر رہی...... مرد دوسری شادی بھی کرتے ہیں۔ میرے حلق میں صرف ایک بات اٹک رہی ہے۔ ایک تو اچانک آناً فاناً عشق ہونا...... اور اتنا زبردست عشق کہ بندے نے کچھ ہونے سے پہلے بیوی کو بھی فارغ کر دیا۔
بہر حال بندہ بہت معقول دکھائی دیتا ہے۔ ایک مرتبہ بات تو ضرور ہونا چاہیے۔ نرگس نے بھرپور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ ندا جیسی جذباتی لڑکی کو بہت مہارت سے 'کنٹرول' کیا۔
"اوکے...... میں سر سے کہتی ہوں وہ آپ سے مل لیں۔ میں سر کو آپ کا کونٹیکٹ نمبر دے دیتی ہوں۔
اور ہاں...... آنٹی...... میں آپ کو ایک بات بتانا تو بھول ہی گئی۔ ندا نے اپنے روایتی اور مخصوص انداز میں پیشانی پر ہاتھ مارا۔
وہ کیا...... نرگس کا دل بڑے زور سے اچھلا۔
سراپنی ماں کو لے کر آئے تھے۔ مگر نانا جان نے ان کی بہت انسلٹ کی۔
اچھا...... نرگس نے بہت تعجب سے کہا تھا۔ وہ تو ابھی تک یہی سمجھ رہی تھیں کہ کوئی موقع پرست لڑکی کے برے حالات سے فائدہ اٹھا کر آگے بڑھا ہے مگر ماں کو ساتھ لانے کا مطلب تو یہی ہے کہ کارروائی واضح ہے۔ معاملات خفیہ نہیں ہیں۔
پھر انہوں نے شبیر چچا سے کیا بات کی؟ نرگس کا انداز اب پُرشوق و متجسس تھا۔
"اُف...... بات کہاں ہوئی نانا جان نے تو انہیں ایک گلاس پانی نہیں پینے دیا۔ وہ بھی غصے میں اُٹھ کر چلی گئیں۔ ندا نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارنے کے بعد طریقے سے جواب دیا۔
"میں سمجھ گئی؟" نرگس نے گردن ہلائی۔
"کیا سمجھ گئیں؟" ندا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔
شبیر چچا کو اس بات پر غصہ ہے کہ ان کے لاڈلے حکیم صاحب کو انکار کیوں کیا گیا۔
"بیٹا...... ایک بات کہوں؟ نرگس نے وجہ بیان کرنے کے ساتھ ہی کچھ انکشاف کرنے کا موڈ بنایا۔
"جی...... جی......؟ ندا نے جلدی سے بولی۔
بیٹا برا مت ماننا...... تمہارے سگے نانا ہیں۔ مگر میں عرصے سے ان کو دیکھ رہی ہوں۔ اب ان کا دماغی توازن درست نہیں۔ ہر وقت جلنا کڑھنا...... اولاد کی طرف سے مایوس ہونا...... بے بسی، غصہ، کمزور صحت...... دیکھو بیٹا سیدھی سی بات ہے۔ ایک صحت مند، خوش باش، پُر امید انسان جس طرح سوچ سکتا ہے اس کی طرح سے بیمار کمزور، دوسروں پر انحصار کرنے والا نہیں سوچ سکتا۔
ان کی اجازت، پسند نہ پسند کوئی معنی نہیں رکھتی۔ ان سے اپنی جان نہیں سنبھلتی وہ تمہارے معاملات کیا سنبھالیں گے۔
مجھے تو خود تمہاری فکر رہتی ہے۔ جوان خوبصورت، کنواری بچی کا کس طرح گزارا ہوگا...... آج نانا کی آنکھ بند ہو جاتی ہے۔ تو پھر اکیلی اس گھر میں کیسے رہے گی؟"

آنٹی گھر کو لاک لگا کر جاب پر بھی نہیں جا سکتی۔ امی کا اتنا سارا گولڈ نانا جان کے کمرے میں رکھا ہے۔ بنک سے سارے پیسے نکال کر لے آتے ہیں کہ اپنا پیسہ اپنے پاس رکھنا چاہیے۔ پیسہ اس کا جس کے پاس ہوتا ہے۔ مجھے کہتے ہیں بینک اسٹیٹمنٹ دیکھ لو اکاؤنٹ میں تو پیسے ہی نہیں ہیں۔ تین چار ہزار والے پیکٹ تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ اگر پہلے دیکھ لیتی تو پھر جاب کرنے تھوڑا ہی جاتی......

ایک شاپر میں دس دس اور بیس پچاس والے اتنے سارے گندے میلے نوٹ بھرے ہوئے ہیں۔ اب تو میں اسی شاپر سے مٹھی بھر نوٹ نکال کر گروسری لے آتی ہوں۔

ندا اپنی دھن میں بولتی چلی جا رہی تھی۔ نرگس نے اپنا سر پکڑ لیا تھا۔

بے وقوف لڑکی...... میرے سامنے تو اپنے گھر کے راز کھول دیے۔ کسی اور کو اپنے اثاثے، نوٹوں کے شاپر کا نہ بتا دینا۔

نہیں نہیں وہ تو میں آپ کو بتا رہی ہوں...... ہم غریب نہیں ہیں اتنے سارے پیسے تو نانا جان نے گھر میں ہی رکھے ہوئے ہیں۔ ندا نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔

بات یہ ہے بیٹا...... نرگس نے اب گہری سانس لینے کے بعد کہا۔

بڑھاپے میں بہت سے انسان اسی طرح ہو جاتے ہیں۔ زندگی، دولت ہر چیز کے لیے حریص ہو جاتے ہیں۔

عمر بڑھتی ہے تو ہوکا بھی بڑھ جاتا ہے۔ نرگس نے ٹھنڈے دماغ سے تجزیہ کیا۔

یہ ہوکا کیا ہوتا ہے آنٹی؟'' ندا نے معصومیت سے سوال کیا۔

اے بیٹا...... اسے لالچ ہی سمجھ لو۔

بتاؤ...... اتنا مال جمع کیے بیٹھے ہیں۔ حکیم صاحب سے پانچ پانچ روپے کی پڑیاں لے کر کھاتے رہے اور اس حال کو پہنچ گئے۔

خیر...... اچھا ہے اتنا جوڑ کر بیٹھے ہیں۔ تمہاری شادی پر کام آئے گا مرحومہ بیٹی کا سونا سنبھالے بیٹھے ہیں اب تمہارے کام آئے گا۔ آج کل سونا خریدنا کوئی آسان کام نہیں۔ نرگس کے انداز میں بلا کی طمانیت تھی۔

ورنہ سوچ رہی تھیں کہ بے ماں باپ کی بچی کی شادی پر انہیں اخلاقاً بہت کچھ کرنا پڑ جائے گا۔

میں تمہارے باس سے ملتی ہوں۔ انہوں نے میری تسلی کر دی تو بسم اللہ، شبیر چچا کو تو میں خود سنبھال لوں گی۔ اگر وہ ماں کو ساتھ لائے تھے تو یہ بہت اچھا ہو گیا۔

مگر سر کی امی جان بہت غصے میں گئی تھیں۔ اب نہیں آئیں گی۔ آنٹی ان کو بہت انسلٹ فیل ہوئی تھی۔ ندا پریشانی کی کیفیت میں مبتلا ہو گئی جب بیٹے کا دل ہے تو 100 بار آئیں گی۔

بس اب تم مجھ پر چھوڑو...... یہ میری ذمہ داری ہے۔ خود چھان بین کروں گی...... آخر ایک روز اللہ کو بھی جواب دینا ہے۔

آپ ان کے آفس جائیں گی؟ خوبصورت امکانات نے ندا کے چہرے پر رنگ بکھرا دیے۔

آفس کیوں جاؤں گی...... انہیں اپنے گھر چائے پر بلاؤں گی۔ یہاں تو شبیر چچا کی وجہ سے آرام سے بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تمہیں بھی آنے کی ضرورت نہیں...... جب تک میری تسلی نہیں ہو گی بات آگے

نہیں بڑھاؤں گی...... میرے آگے بھی اولاد ہے۔
بس تم انہیں میرا نمبر دے کر کہو مجھ سے بات کریں۔
نرگس نے ندا کو بے ساختہ انداز میں گلے لگا کر کہا تھا جو اپنی خوشی کی کیفیت چھپانے کے لیے ہونقوں کی طرح آنکھیں جھپکا رہی تھی۔

☆......☆......☆

شادی ایک ذمہ داری کا نام ہے بیٹا......
ایک عہدِ وفا جو اللہ کا نام لے کر کیا جاتا ہے۔
مشکور احمد ثمر کے مرصع اور ماڈرن اسٹائل میں سجے آفس میں بیٹھے بہت شفیق و نرم لہجے میں مضبوط دلائل سے سمجھانے کی سعی کر رہے تھے۔ ثمر کے چہرے پر اتنی اجنبیت و بے مروتی تھی کہ مضبوط دلیل بھی لنگڑا لنگڑا کر چل رہی تھی۔
مجھے اس خیال سے تکلیف ہو رہی ہے کہ آپ نے بہت زحمت کی۔ ثمر نے بے مہر انداز میں اب لب کشائی کی۔
اب یہ چیپٹر کلوز ہو چکا انکل...... اسی عہدِ وفا نبھانے کی خاطر میں نے ذلت کی انتہا پر بھی صبر کیا تھا۔
مگر آپ کی صاحبزادی گھر بسانا ہی نہیں چاہتی۔
ایسا نہ کہو بیٹا...... بدگمانی تو ایک زہر ہے۔ ایک امر بیل جو ہرے بھرے سرسبز گھروں کی ہریالی چاٹ جاتی ہے۔
انکل آپ...... بہت سادہ ہیں...... مجھے آپ کو مایوس کرتے ہوئے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ بہرحال آپ نے بہت پیار دیا، بہت عزت دی۔ ثمر نے اپنی فطرت کے بموجب بہرحال حقیقت کا اعتراف کیا۔
شفیق و نرم خو، عاجزانہ طبیعت کے مالک مشکور احمد مخاطب پر اپنی شخصیت کا بھرپور اثر ڈالتے تھے۔ ثمر کے ساتھ تو ان کا باپ بیٹے جیسا رشتہ تھا اس گھر کو بسانے کے لیے میں کیا کر سکتا ہوں؟ تم جو کہو میں کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مشکور احمد کے انداز میں ابھی تک مایوسی کا شائبہ نہیں تھا۔
اب بات ختم ہو چکی ہے انکل...... طلاق کے پیپر اسی ہفتے چمن کو مل جائیں گے وہ یہی چاہتی تھی...... جو عورت گھر بسانا چاہتی ہے وہ کسی انتہا پر جاتے ہوئے ڈرتی ہے۔ ریشم کی باریک سی ڈوری سے بندھا ہوتا ہے یہ رشتہ...... میں مرد ہو کر اتنی احتیاط کرتا تھا وہ عورت ہو کر بے فکر تھی۔
سوری انکل...... دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے مجھے ہر حال میں دوسری شادی کرنا ہے۔ جو ہو سو ہو۔
دوسری شادی...... چھت گویا سر پر آ رہی تھی۔
کتنے سکون سے سسر کے سامنے دوسری شادی کی بات کر رہا تھا۔ مشکور احمد کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ بات اس حد تک جا چکی ہے چند لمحے تو وہ دھڑکنوں کی بے ترتیبی سے نبرد آزما ہے۔ بات کرتے ہوئے حلق میں گولے سے پھنس رہے تھے۔
لگتا ہے تم نے واقعی دوسری شادی کی نیت کر لی ہے۔ مشکور احمد کئی مرتبہ کھنکارنے کے بعد بولنے کے قابل ہوئے۔

ثمر جواب میں خاموش رہا اور شیشے کے پار نظریں جما دیں۔
حرکات و سکنات سے ظاہر کیا اب مزید کچھ نہیں بولے گا۔
مشکور احمد بار بار نظر اٹھاتے بار بار جھکاتے۔
مدعا پورا نہ ہونے کے مضبوط آثار ظاہر ہو جائیں تو دلائل کی تلاش بھی رک جاتی ہے۔ بلکہ دلیل و منطق دیوانوں کا نصاب لگتا ہے۔ الفاظ بے معنی لگتے ہیں۔ خاموشی آغوشِ مادر کا گہوارہ لگتی ہے۔
دوڑ لگا کر منظر سے غائب ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔ ایسے میں کوئی چہرہ دیکھے تو اسے یوں لگے جیسے کوئی جان بچا کر آیا ہو اور سانسیں بحال کر رہا ہو۔
عظیم خواہش کا حسرت بننا..... کوئی کھیل نہیں۔
مشکور احمد اپنی جگہ سے یوں اٹھے گویا کوئی انہیں گڑھے سے کھینچ کر نکال رہا ہو اپنی وضع داری کا بھرم رکھتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔
ثمر کو تھامنا پڑا..... کہ یہ چمن کا نہیں مشکور احمد کا ہاتھ تھا۔
سابقہ رشتے کا لحاظ و احترام ایک سماجی مجبوری تھی۔

☆.....☆.....☆

خالہ ہم ڈاکٹر انکل کی سسٹر کی برتھ ڈے میں جائیں گے ناں؟'' مہ وش بہت آس لگا کر پوچھ رہی تھی۔
بچیاں رونق و خوشیوں کو ترسی ہوئی تھیں۔ برتھ ڈے کا سن کر بہت پُر جوش و جذباتی نظر آ رہی تھیں۔
انشاءاللہ..... ضرور جائیں گے۔
خالہ گفٹ بھی تو لینا ہے ناں..... گفٹ لینے چلیں.....؟ مہ پارہ مہ وش سے زیادہ پُر جوش نظر آ رہی تھی۔
پتہ نہیں ڈاکٹر انکل کی سسٹر کتنی بڑی ہے۔ میرے جتنی ہے یا مہ پارہ جتنی فون پر پوچھ لیں گے بیٹا.....
جس دن برتھ ڈے میں جائیں گے راستے میں رُک کر گفٹ بھی لے لیں گے۔
چلیں ٹھیک ہے۔ خالہ پھر میں ان کو اپنی برتھ ڈے پر بھی بلاؤں گی۔ آپ کو پتہ ہے میری برتھ ڈے کب ہوتی ہے؟ مہ وش نے سوال کیا۔
چمن چونک پڑی۔ ایک مرتبہ وہ خود ہی مہ وش کی برتھ ڈے پر گفٹ لے کر پہنچ گئی تھی۔ فردوس نے بڑے برے برے منہ بنائے تھے بھئی ہم انگریزوں کے نقشِ قدم پر نہیں چلتے..... عمر گھٹ رہی ہے یہ خوشیاں مناتے ہیں۔
فضول کے چونچلے..... مہمانوں کا رش..... پچاس پچاس روپے کے کھلونے نکلتے ہیں ڈبوں سے..... ہزاروں کا خرچہ ہوتا ہے۔ تان خرچے پر آ کر ٹوٹ جاتی تھی۔
ایمن کو ہر وقت یہی تو سننا ہوتا تھا۔ لڑکی..... نرا خرچہ ہی خرچہ.....
مہ وش اور مہ پارہ کی برتھ ڈے اتنی شاندار ہو گی کہ بس.....
خالہ سے جو گفٹ مانگوں گی خالہ دلائے گی..... چمن نے دونوں کو باری باری پیار کیا۔
پرامس.....؟ مہ پارہ کو یقین نہ آیا۔
پکا والا پرامس..... اس نے مہ پارہ کو سینے سے لگالیا۔ آنکھوں میں نمی سی اترنے لگی۔

اسے اپنا اور ایمن کا بچپن یاد آیا۔ مشکور احمد اور عطیہ بیگم کتنے اہتمام سے بیٹیوں کی سالگرہ مناتے تھے۔ ریفریشمنٹ الگ ہوتا تھا اور ڈنر الگ...... باہر سے کیٹرنگ ہوتی تھی۔ غباروں سے گھر بھر جاتا تھا اس نے بے ماں کی بچیوں کے چہروں پر الوہی مسرتوں کے رنگ دیکھے تو سوچنے لگی۔

یہ باقی بچی ہوئی زندگی...... بس اب ان ننھی پریوں کے نام......

☆......☆......☆

آیئے آیئے...... کافی راہ دکھائی آپ نے...... نرگس ثمر کا سواگت کر رہی تھی۔

جی...... بس...... ایک ضروری میٹنگ شروع ہوگئی تو وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا...... ثمر قدرے شرمسار انداز میں نشست کی طرف بڑھتے ہوئے گویا ہوا۔

آپ اکیلے آئے ہیں؟ نرگس نے باہر کی طرف نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

جی......؟ میں کچھ سمجھا نہیں۔ ثمر اُلجھ گیا۔

میرا مطلب ہے آپ کی والدہ صاحبہ تشریف نہیں لائیں؟ نرگس نے عمیق نگاہ سے کچھ اندازہ لگانے کی کوشش بھی کی تھی۔

جی وہ بس اچانک ان کی طبیعت خراب ہوگئی...... ثمر کو یہی جواب سوجھا (اُف کتنا سیدھا سا کام فضول میں ٹیڑھا ہو رہا ہے)

بات یہ ہے ثمر صاحب میں لگی لپٹی کی قائل نہیں ہوں۔ یہ بچی میرے سامنے پیدا ہوئی اور میری آنکھوں کے سامنے ہی ماشاء اللہ جوان ہوئی۔

دور پرے کے رشتے دار بہت ہیں۔ مگر قریبی رشتے دار صرف ایک سگا ماموں ہے۔ وہ بھی چالیس سال سے امریکہ میں آباد ہیں۔

جی...... جی...... بتایا تھا ندا نے؟ ثمر اس طومار تفصیل سے اُلجھنے لگا۔

آپ ندا کو پسند کرتے ہیں۔ میرا اندازہ ہے وہ بھی آپ کو ناپسند نہیں کرتی۔ اچھے خاندان کا پڑھا لکھا صاحب حیثیت ساتھی اسے مل جائے تو اور کیا چاہیے۔ مگر کچھ اُلجھن سی ہے۔ وہ دور کرنا چاہتی ہوں۔ بظاہر ندا سے میرا خون کا رشتہ نہیں ہے مگر اتنا پرانا ساتھ ہے کہ میرے لیے تو رشتے داروں سے بڑھ کر ہیں۔

مجھے بھی اللہ کو جواب دینا ہے۔ بس اپنی تسلی کرنا چاہتی ہوں۔ نرگس نے بہت محتاط اندازِ گفتگو اپنایا تھا۔

جی...... جی...... آپ جو پوچھنا چاہتی ہیں پوچھ لیجیے۔ میں ندا کے لیے سیریس ہوں اپنے گھر کی عزت بنانا چاہتا ہوں۔ اور بس......

ایک بات کہوں برا تو نہیں مانیں گے؟ نرگس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

بالکل بھی نہیں...... آپ کے ہر سوال کا جواب دوں گا۔ ثمر نے بڑے اعتماد سے کہا۔ اور اس کا اعتماد دیکھ کر ہی نرگس مناسب الفاظ میں کہا۔ کیا وہ مرد قابلِ اعتماد ہو سکتا ہے جو اپنی اچھی بھلی شادی شدہ زندگی ایک نئے عشق کی وجہ سے ختم کر دے؟

سوال بہت چبھتا ہوا تھا...... ایک لمحے کے لیے ثمر چکرا کر رہ گیا۔

شادی بہت خراب چل رہی تھی۔ کئی مرتبہ طلاق کی نوبت آئی۔ مگر میں نے بہت صبر و برداشت سے معاملہ

سنبھالا۔
اچھی بھلی شادی شدہ زندگی کون اپنے ہاتھوں سے تباہ کرتا ہے۔ بس اسی دوران ندا سے ملاقات ہوگئی۔ سیدھی سادی صاف گو بلکہ بہت معصوم سی لڑکی ہے میں عورت کی ہوشیاریوں کا ڈسا ہوا ہوں۔ وہ میری زندگی سے بہت دور جا چکی ہے۔
اولاد نہ ہونے کی وجہ سے وہ نفسیاتی مریضہ بن گئی تھی۔ ایک پل کا سکون نہیں تھا میری زندگی میں......
ثمر اتنی روانی سے بولا کہ نرگس کو اس کی سچائی کا یقین کرنا پڑا۔
آپ باقاعدہ طلاق دے چکے ہیں؟ نرگس نے قدرے ہچکچاتے ہوئے سوال کیا۔
"Doucumentation Process چل رہا ہے۔" ثمر نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔
آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں ندا کے لیے الگ گھر کا بھی انتظام کر سکتا ہوں۔ چار کمروں کا ایک لگژری اپارٹمنٹ ہے۔ پہلے Rent Out کیا ہوا تھا آج کل خالی ہے۔ وہ میں حق مہر میں ندا کے نام لکھ دوں گا۔ اب اس سے بڑی ضمانت کیا دے سکتا ہوں؟
اس بات پر تو نرگس نے واقعی بہت غور سے ثمر کی طرف دیکھا تھا۔
کنکریٹ کی عمارتوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ گھر کا سکھ چاہیے اتنا ترسا ہوں گھر کے سکھ کو کہ اس سکھ کی خاطر اپنا سب کچھ دینے کو تیار ہوں۔ ثمر کے چہرے سے جھلکتا روحانی کرب نرگس کو تڑپانے لگا۔ گویا انہوں نے ثمر پر اعتبار کر لیا۔
ایک بات میں ضرور کلیئر کر دینا چاہوں گا۔ ثمر تذبذب کی کیفیت میں دکھائی دیا۔
وہ کیا؟ نرگس چونک پڑیں۔ لہجہ کسی خاص بات کی چغلی کھا رہا تھا۔
میری والدہ میرے نکاح کی تقریب میں شرکت نہیں کریں گی۔ ثمر نے تو زبردست دھماکہ کر دیا تھا۔
کیا مطلب......؟ ندا تو بتا رہی تھی آپ کی والدہ ایک بار تشریف لائی تھیں اور رشتے ہی کی نیت سے آئی تھیں۔
جی بالکل......مگر نانا جان نے اتنی زیادہ عزت افزائی کی کہ وہ کسی صورت راضی نہیں ہیں۔
مگر آپ نکاح ہو جانے دیں......خود بخود مان جائیں گی۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں مجھ سے الگ تو نہیں ہو سکتیں۔ ثمر نے ساتھ ہی تسلی بھی دے ڈالی۔
میں ان کو منانے کی کوشش کروں گی۔ ایسی بھی کیا بات ہے۔ نرگس کو اپنی صلاحیتوں پر بھرپور اعتماد تھا۔
میری ماں ہیں......مجھ سے زیادہ انہیں کون سمجھ سکتا ہے۔
میں خفیہ شادی نہیں کروں گا۔ شادی میں میرے دوست احباب شریک ہوں گے۔
اچھا......! نرگس اُلجھن میں پڑ گئیں۔
میرے دو ذاتی گھر ہیں اس شہر میں۔ ایک مشہور ٹریڈنگ کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز ہوں۔ فراڈ کر کے شہر چھوڑ کر تو جانے سے رہا۔ ثمر نرگس کی الجھن پر شدید کوفت میں مبتلا ہو رہا تھا۔ سیدھا سا کام لوہے کے چنے بن رہا تھا۔
نہیں نہیں ثمر صاحب......خدانخواستہ مجھے آپ پر کوئی شک نہیں ہے۔ مگر دولہا کے ماں باپ شادی میں شریک ہوں تو لڑکی بہت معتبر ہو جاتی ہے۔ نرگس نے جلدی سے وضاحت کی۔

دیکھ لیجیے...... میں تو سارے سچ بول چکا۔ اب آپ ندا سے بات کر لیجیے اور اپنا فیصلہ سنا دیجیے۔ ثمر نے ریسٹ واچ پر نظر ڈال کر اپنے روانہ ہونے کا عندیہ دیا۔

ندا سے پہلے تو مجھے اس کے نانا کو سنبھالنا ہے۔ نرگس ہنوز مخمصے میں نظر آئیں۔

میں چائے لے کر آتی ہوں۔ مجھے پانچ منٹ دیجیے۔ نرگس نے ثمر کو روانگی کے موڈ میں پایا تو جلدی سے اُٹھ کر باہر جانے لگیں۔ ثمر کو موقع ہی نہ دیا کہ وہ تکلف کے ضمن میں کچھ کہتا۔

☆......☆......☆

امی...... ثمر نے اگر کچھ طے کر ہی لیا ہے تو مزید بات چیت کا کوئی فائدہ نہیں۔

بس میری طرف سے پاپا سے یہ ریکوسٹ کر دیجیے کہ مجھے طلاق کے پیپر نہیں چاہئیں وہ دوسری تیسری چوتھی جو مرضی شادی کریں۔ مجھے اس جگہ پر جہاں میں آ کر بیٹھ گئی ہوں سکون سے جینے دیں۔

چمن حتی المقدور کوشش کر رہی تھی کہ پھٹ جانے والے دل سے آنسوؤں کا سمندر آنکھوں کے کناروں سے نہ چھلکنے پائے...... اُفتاد سے نبرد آزما ماں کے لیے اولاد کے آنسو ناقابلِ برداشت ہوتے ہیں۔

ٹھیک ہے بیٹا...... لیکن...... تم بھی اگر ایک مرتبہ ثمر سے بات کر لیتیں تو شاید...... عطیہ بیگم 'شاید' پر آ کر رک گئیں۔

''شاید'' امکانات کی ایک وسیع دنیا ہے۔ چمن کے ہونٹوں پر ایک اُداس سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

امی...... ثمر آپ کی اور پاپا کی بہت عزت کرتے ہیں۔ کہنے والی باتیں بھی اندر روک لیتے ہیں۔

اس مرتبہ تو انہوں نے پاپا سے سب کچھ کہہ دیا۔ کچھ نہیں چھوڑا۔

میرے بات کرنے کی تو گنجائش ہی ختم ہو گئی۔ چمن نے آزردگی کے لمحوں کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹتے ہوئے جواب دیا۔

عطیہ بیگم یہ سن کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ چمن نے آگے بڑھ کر انہیں گلے سے لگا لیا۔ اور ان کے سر پر پیار سے بوسہ دیا۔

امی وہ کہتے ہیں ناں کہ

تاب لاتے ہی بنے گی غالب

واقعہ سخت ہے اور جاں عزیز

مرنے کے لیے تو میں تیار نہیں ہوں۔ اللہ سے صحت و ہمت کے ساتھ زندگی کی دعا مانگتی ہوں۔ اس لیے کہ کہیں جا کر تو اب زندگی کا کوئی مقصد سمجھ میں آیا ہے۔

مرحومہ بہن کی نشانی دو معصوم بچیاں...... ان کی بہترین تعلیم و تربیت اب میری ذمہ داری ہے۔ یہ معصوم بھی ہیں اور مظلوم بھی......

مظلوم تو تم بھی ہو...... تم نے کیا کیا تھا جو اتنی بڑی سزا تمہارے حصے میں آئی؟ عطیہ بیگم ہچکیاں لیتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

میں مشکور احمد کی بیٹی ہوں امی...... صبر و برداشت اور عقیدہ مجھے وراثت میں ملا ہے۔

میرا ایمان ہے...... ظلم کے حساب کتاب دنیا سے جانے سے پہلے ہی صاف ہوتے ہیں۔ میں صبر سے اُس وقت کا انتظار کروں گی جب ظلم کا حساب ہو گا۔

آفرین ہے میری بچی...... ماں کو کیسے بچوں کی طرح بہلا رہی ہے۔ عطیہ بیگم نے چمن کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور سینے سے لگالیا۔

امی یہ بھی تو مجھ پر اللہ کی بہت بڑی مہربانی ہے۔ نامہربان، قدر نہ کرنے والوں سے جان چھڑا کر ماں کی ٹھنڈی چھاؤں میں لا بٹھایا ہے۔

آپ کی خدمت کروں گی تو دنیا و آخرت سنور جائے گی۔ ہر پل آپ سے دعا لوں گی۔

امی ہاں تو زندگی میں ایک ہی بار ملتی ہے۔ چمن نے ماں کے سینے سے لگ کر آنکھیں موند لیں۔

ضبط غم کی قوت نے اسے یوں سنبھالا کہ پاؤں زمین میں میخوں کی طرح گڑ گئے تھے۔ نہ ٹانگوں میں لرزہ تھا نہ چال میں لڑکھڑاہٹ ماں کے سینے سے سیر شکم نومولود کی طرح چپکی ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

نرگس کو ہزار اندیشوں کے باوصف Risk تو لینا تھا۔ ندا دلائل سننے کے لیے رضامند نہیں تھی۔

شبیر حسین ہاتھوں میں آ رہے تھے۔ ہاتھ میں کوئی متبادل رشتہ ہوتا تو سر دھڑ کی بازی لگا دیتیں اور کوشش یہی کرتیں کہ ندا کی شادی کسی شادی شدہ سے نہ ہو...... مگر انہیں احساس ہو چلا تھا۔ اب معاملہ صرف شادی کی حد تک نہیں تھا...... ندا پیار کی رم جھم میں بھیگ رہی تھی۔

اس کے لیے تو یہی کافی تھا کوئی اس کے عشق میں پاگل ہو رہا ہے۔ اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ فلرٹ و موقع پرست نہیں ہے۔

پھر بھی انہوں نے شبیر حسین کو یہ چٹان شکن خبر سنانا ضروری سمجھا کہ وہ ندا کی پسند کی وجہ سے ثمر کا رشتہ منظور کر رہی ہیں اور آپ کو بھی عاقل بالغ لڑکی کے اس شرعی و قانونی حق کا پاس کرنا ہوگا۔

شبیر حسین کے لیے یہ صورِ اسرافیل تھی...... ان کی تو رہی سہی قوت بھی جاتی رہی...... زبان بالکل ہی گنگ ہوگئی۔

وہ ثمر کو جی کھول کر لعن طعن کرنا چاہتے تھے مگر نقاہت ان کے ارمانوں پر پانی پھیر رہی تھی۔

کہیں تو کرنی ہے...... آپ کے بعد کون اس کا پہرہ دے گا؟ نرگس نے ان کی کیفیات سمجھتے ہوئے پھر سمجھانے کے انداز میں کہا۔

شبیر حسین کے حلق سے بس بے معنی سی آوازیں ہی نکل پائیں۔

☆......☆......☆

نکاح کے بعد ثمر ندا کو P.C کے شاندار سویٹ میں لے کر آ گیا تھا۔ وہ ہر تعلق و رشتے سے دور ہو کر شب زفاف منانا چاہتا تھا۔ مرد کے لیے تو کہا جاتا ہے کہ نہائے دھوئے کنوارے کے کنوارے...... اپنی دلہن کو فانوسوں کی جگمگاہٹ کے سائے تلے لے کر گزرتے ہوئے وہ ایسا ہی دکھائی دے رہا تھا گویا مدتوں انتظار کے بعد بڑی ارمانوں بھری شادی ہوئی ہے۔ ہوٹل کا عملہ دولہا دلہن کا شایانِ شان استقبال کر رہا تھا۔ مہکتے ہوئے گلدستے دونوں کے ہاتھوں میں تھے اور وہ آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

(رشتوں کی نزاکت اور سفا کی دکھاتے اس سحر انگیز
ناول کی اگلی قسط انشاء اللہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

> ''صحیح کہا تم نے اماں...... ہر نیا آنے والا بچہ میرے زخم ہرے کر دیتا ہے۔ ہر نیا آنے والا بچہ مجھے نئی نئی کہانیاں بننے پر مجبور کر دیتا ہے اور اس رات ایک نئی کہانی میرے ذہن میں اپنے خدوخال ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ ان ننھے فرشتوں کا رونا، ہنسنا، بسورنا، سونا جاگنا مجھے......

آج ''گود'' میں کون آیا ہے جی؟ اماں شیداں نے اوولٹین ملے گرم دودھ کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے دھیرے سے جب پہلی مرتبہ پوچھا تھا تو ڈیزی چونک گئی تھی۔ حیرت و اچھنبے سے اس نے جواباً سوال کیا تھا کیا؟

''کاکی یا کاکا؟'' اماں شیداں نے دوبارہ اسی انداز سے پوچھا۔

گھریلو ملازمہ شیداں این جی او اور سماجی و دفتری کاموں سے قطعاً نابلد صرف ایک روٹین میں کام کرنے والی عورت تھی جس کے ذمے گھر کا انتظام سنبھالنا، ڈیزی اور اس کے کبھی کبھی آنے والے مہمانوں کی خواہش و ضرورت کے مطابق کھانا پکانا اور پکوانا، کپڑوں کی دھلائی، استری، گھر کی صفائی ستھرائی کا خیال رکھنا، کچھ وہ خود کرتی اور کچھ اپنے ہیلپر خادم حسین سے کراتی لیکن ان تمام تھکا دینے والوں کاموں میں گھن چکر بنے رہنے کے بعد بھی اسے ڈیزی کے قائم کردہ شیلٹر ہوم 'گود' میں آنے والے ہر نئے فرد کی آمد کا علم کچھ نہ پوچھ کر بھی پہلی ہی رات ہو جاتا ہے۔

''تمہیں کیسے پتہ چل جاتا ہے کہ آج کوئی آیا ہے؟'' ایک روز ڈیزی نے اس سے پوچھا تھا اور وہ شرمندہ شرمندہ سی مسکرا دی تھی۔

''بس جی! آپ کو دیکھ کر اب پتہ چل جاتا ہے۔ اور واقعی جس دن بھی 'گود' میں اب ایک ننھی جان کا اضافہ ہوتا وہ رات ڈیزی پر بڑی بھاری گزرتی۔ دس بجے ہی سو جانے والی ڈیزی کئی راتوں کو پچھلے پہر تک جاگتی، ٹہلتی، کروٹیں بدلتی، پانی پہ پانی پیتی اور بلاوجہ ہی اٹھ اٹھ کر گھر بھر میں چکراتی پھرتی۔

وہ، ڈیزی...... کبھی ماں نہیں بنی کیوں کہ اس نے کبھی شادی ہی نہیں کی۔ گو وہ بھی عام سی لڑکی تھی خوشبوؤں، رنگوں کی شیدائی، خواب سجانے اور خواب نگر میں جاگنے والی، گھر بنانا، بسانا، خوبصورت، ہمکتے بچے اس کا خواب ہو سکتے تھے۔ لیکن اس نے خود ہی اپنی پلکوں سے یہ خواب نوچ پھینکے تھے۔ ایک ممکنہ جوابدہی کے خوف سے اور اس

کے خوفزدہ دل میں آج اتنے برس بعد بھی جبکہ بالوں کی سیاہی سرمئی ہو چلی تھی کچھ آرزوئیں دل میں اکثر ہمکتی ہیں۔ جنہیں وہ تھپک تھپک کر فوراً ہی سلا دیتی ہے اور شیداں کا معمول کے مطابق سوال کرنا کہ کاکا ہے یا کاکی؟ اس کو جانے کیوں لرزا گیا، اس نے تھکے تھکے لہجے میں بتایا کہ بے بی......

''اوہ! اچھا، رب خیر کرے۔'' سمجھدار شیداں نے فوراً اپنے آپ کو کنٹرول کیا۔

''سر دبا دوں جی؟''

''نہیں اماں! آپ سو جاؤ جا کر، تھک گئی ہوگی۔''

''کوئی نہیں جی......'' اماں نے پیار سے کہا۔

''میں نئی تھکدی وگدی اچھا چلو...... آئل کی بائل لاوا، ذرا سا مساج کر دو بالوں میں......''

خلاف عادت اس وقت ڈیزی نے کام کہا تو وہ پھرتی سے بوتل اٹھا لائی۔ اور دھیرے دھیرے اس بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے ہمت کر کے بولی۔

''ہک گل پچھوں باجی؟''

''ہوں!'' ڈیزی نے آنکھیں بند کیے کیے ہنکارا بھرا۔ اماں شیداں کے ہاتھوں میں تو جادو ہے واقعی...... اس نے سوچا۔

''جدوں وی کوئی نواں بال آوندا اے تسی انی پریشان ہور بے چین کیوں ہو جاوندے ہو جی...... ہیں جی؟'' چند لمحے تو ڈیزی چپ کی چپ رہ گئی پھر پھیکی ہنسی ہنس دی۔

''ارے نہیں اماں! بس بچوں کی ذمہ داری بڑی ہوتی ہے ناں......''

''ہاں جی...... ایہہ تو ہے......'' اماں شیداں نے سر ہلایا۔

''اچھا ٹھیک ہے، اب جاؤ، سو جاؤ تم بھی...... میں بھی سوؤں گی۔'' ڈیزی نے نرمی سے اماں شیداں کے ہاتھ ہٹائے۔ وہ خاموشی سے بوتل اٹھا کر چلی گئی اور ڈیزی نے دل میں کہا۔

''صحیح کہا تم نے اماں...... ہر نیا آنے والا بچہ میرے زخم ہرے کر دیتا ہے۔ ہر نیا آنے والا بچہ مجھے نئی نئی کہانیاں بننے پر مجبور کر دیتا ہے اور اس رات ایک نئی کہانی میرے ذہن میں اپنے خدوخال ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ ان ننھے فرشتوں کا رونا، ہنسنا، بسورنا، سونا جاگنا مجھے امکانات کے کن جہانوں کی سیر کراتا ہے کسی کو کیا بتاؤں؟ ان بچوں کی معصوم آنکھوں میں، میں ان کی سفاک ماؤں کی شبیہہ تلاشتی رہتی ہوں...... مگر......''

سچ ہے کہ دنیا کی ساری مائیں بہت حسین ہوتی ہیں۔

میری ماما بھی ایسی ہی حسین بلکہ حسین ترین عورت تھیں۔ لیکن وہ کہتی تھیں کہ میری ڈیزی بہت حسین ہے، بالکل ڈیزی کے پھولوں جیسی...... مجھ سے چھوٹی روزی ماما جیسی تھی اور ان دنوں مجھے روزی کا ماما جیسا ہونا بہت برا لگتا تھا کہ میں کیوں نہیں؟ میں کیوں ماما جیسی نہیں ہوں؟ مجھے اپنی پتلی سی کھڑی ناک اور باریک ہونٹ جھاڑو والی چڑیل جیسے لگتے تھے۔

''ماما کی سلونی رنگت' بھرے بھرے ہونٹ اور ناک بہت پیاری لگتی۔ اور صرف ماما ہی تو حسین نہیں تھیں۔ پوری زندگی ہی حسین ترین تھی اتنی کہ کچی بتاؤں...... یاد کرنے کو جی نہیں چاہتا اور بھول جانے کا یارا نہیں۔''

ماما، پاپا روزی اور میں...... چاروں جانب رنگ ہی رنگ' خوشبو ہی خوشبو تھی۔ لیکن رنگ مٹیالے ہونے لگے، خوشبوئیں تب اڑنے لگیں جب اچانک ہی پاپا کی ڈیتھ ہو گئی۔ لیکن جلد ہی ماما نے

خود کو سنبھال لیا وہ بہت بریو اور اسٹرونگ لیڈی تھیں۔ انہوں نے اپنے عمل سے بتایا کہ موت بھی زندگی کی طرح ایک حقیقت ہے اور اس حقیقت کو جتنی جلد قبول کر لیا جائے بہتر ہے۔ وہ شہر کے ایک بڑے اسپتال میں نرسنگ اسٹاف کی انچارج ایک سینئر اور تجربہ کار نرس تھیں۔

وہ شام...... ہاں وہ کراچی کی پسینے سے چپچپاتی ہوئی حبس زدہ شام تھی جب لائٹ نہ ہونے کے باعث میں سیڑھیوں پر کتابیں پھیلائے کل جمع کیے جانے والے اسائمنٹ کی تیاری میں گم تھی کہ ٹونی گیٹ سے اندر داخل ہوتا نظر آیا۔ وہ سیدھا میری جانب آیا اور ہیلو ہائے کے بعد متذبذب سا سامنے ہی کھڑا رہا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی وہ اکثر آتا تھا، مگر آنٹی مارتھا کی بھیجی ہوئی کوئی ڈش یا کوئی پیغام لے کر...... مجھے اُلجھن سی ہوئی اور استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''یہاں کیوں بیٹھی ہو؟'' عجیب ہی سوال تھا۔ میرا گھر ہے، جہاں بھی بیٹھوں...... اپنے لہجے کی ناگواری پر قابو پاتے ہوئے میں نے دھیرے جواب دیا۔

''لائٹ نہیں ہے اور اندر بہت حبس ہے۔''

''میں بیٹھ جاؤں یہاں؟'' وہ اجازت طلب کر رہا تھا۔

''ماما ہاسپٹل سے نہیں آئی ہیں ابھی......'' میں اُلجھ سی گئی۔

''آئی نو......'' وہ کتابیں سمیٹ کر مجھ سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گیا اور بلا تمہید اس نے بتایا کہ وہ روزی کو پسند کرتا ہے۔

''تو...... تم مجھے کیوں بتا رہے ہو؟''

آنٹی مارتھا کا یہ بیٹا مجھے نہ جانے کیوں کبھی بھی اچھا نہیں لگا حالانکہ اسے ناپسند کرنے کی کوئی ٹھوس وجہ میرے پاس نہ تھی۔ وہ خوش شکل اور تعلیم یافتہ تھا، عادت و اطوار میں بھی کوئی قابلِ اعتراض اور قابلِ گرفت بات نہ تھی مگر بس...... پتہ نہیں کیوں اس کی موجودگی میں مجھے اُلجھن سی ہوتی، عجیب سی ناگواری سی محسوس ہوئی اور اس وقت تو وہ مجھے گدھا گدھا سا بھی لگا۔

''تو......؟ تم مجھے کیوں بتا رہے ہو؟'' مجھے تھوڑا سا غصہ اور بہت سی ہنسی آئی تھی۔

''پلیز ڈیزی......!'' وہ تھوڑا سا میری جانب کھسکا تھا۔

''پلیز، تم روزی سے میری سفارش کر دو ناں؟'' میرے دل میں گدگدی سی ہوئی۔

''ارے! میری اسٹوپڈ بہن اتنی بڑی ہو گئی ہے......'' میں نے دیکھا وہ بڑی پُر امید نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''اوکے......'' مجھے پہلی مرتبہ ٹونی پر پیار آیا اور میں نے بڑی بہنوں کی طرح اس کا کندھا تھپکا۔

''آئی وِل......'' جب میں نے روزی کو بتایا تو وہ حسبِ توقع چراغ پا ہوئی اور پھر منہ پھلا لیا...... (یہ بھی حسبِ توقع ہی تھا)۔

''یہ کیا بات ہوئی بھلا؟ سارے زمانے کو بتاتا پھر رہا تھا، مجھ سے ہی نہیں کہہ رہا ہے، ہے ناں گدھے کا گدھا......''

''سارے زمانے کو نہیں......'' میں نے انگلی اُٹھا کر تنبیہ اور تصحیح کی۔

''صرف تمہاری بڑی بہن کو...... اور مائنڈ یور لینگویج پلیز...... اب تو اسے گدھا نہ کہو۔''

''ہونہہ......'' روزی نے منہ پھلا لیا۔

''بونگا سا ہے۔'' روزی نے مزید اضافہ کیا۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ محبت فاتحِ عالم، اور تُو تو میری معصوم سی، منی سی روزی ہے۔ میں نے ماما کو بھی بتایا، پہلے

تو وہ حیران ہوئیں اور پھر غصہ کہ روزی ابھی صرف انٹر میں ہے، اتنی جلدی یہ سلسلے نہیں ہونے چاہئیں۔

''کیا ہے ماما؟ دیکھا بھالا لڑکا ہے، اعتراض والی کیا بات ہے؟ اور پھر وہ بھی تو ابھی پڑھ ہی رہا ہے۔BCS کے تھرڈ ایئر میں ہے۔''

''ہاں...... وہ سب تو ہے......''

''ماما ایگری تھیں...... لیکن...... بڑے پیار اور ارمان سے۔'' انہوں نے میرا ماتھا چوما۔

''پہلے تو مجھے تمہاری شادی کرنی ہے۔''

''کم آن ماما......!'' مجھے ہنسی آ گئی۔

''ابھی تو میرا ایم بی بی ایس شروع ہوا ہے، ابھی بہت وقت پڑا ہے، میں ابھی کوئی شادی وادی نہیں کرنے والی۔''

''تو......؟'' ماما نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

''تو کیا ماما! آپ سوچ لیں آرام سے۔'' روزی سے پوچھیں۔

''اس کے کیا پروگرام ہیں۔ نیکسٹ ویک روزی کی برتھ ڈے ہے، پھر دیکھتے ہیں آگے، ٹونی اور آنٹی مارتھا کیا بات کرتی ہیں۔''

''ہاں...... ماما سوچوں میں گم ہو گئی۔ کہتی تو ٹھیک ہو۔'' نیکسٹ Saturday روزی کی برتھ ڈے تھی اور میری بہت امپورٹنٹ کلاس...... میڈیکل میں جانے کے بعد میرے پاس فرصت کم کم ہی ہوتی تھی۔ اس روز بھی ڈیڑھ گھنٹہ ٹریفک جام میں پھنسے رہنے کے بعد میں گھر پہنچی تو چند مہمان جو انوائٹڈ تھے آ چکے تھے اور شاید صرف میرا ہی انتظار ہو رہا تھا۔ گھر کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور ہنستے بولنے کی آوازوں اور کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبوؤں سے گھر بھرا ہوا تھا، سب شاید لاؤنج میں تھے۔ میں ابھی پہنچ میں ہی تھی کہ آنٹی مارتھا کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ ''بہت گریٹ ہے لزا، ورنہ کون یوں کھلے دل سے کس کے بچے کو پال پوس کر بڑا کرتا ہے کس کے بچے؟'' میں ٹھٹھک گئی۔

''ہاں واقعی...... یہ انکل ڈیوڈ تھے۔ دونوں میں رتی بھر فرق روا نہیں رکھا لزا نے اور بھئی اس معاملے میں تو جارج بھی گریٹ تھا۔

میرے قدم جم گئے۔ ذہن اُلجھ گیا۔

''یہ کیا باتیں ہو رہی ہیں۔'' تب ہی روزی کچن سے نکلی۔

''آ گئی ڈیزی......'' اس نے نعرہ لگایا۔ اس کی تین فرینڈز، ٹونی، آنٹیز، انکل...... ایکدم ہی ہلا گلا شروع ہو گیا۔ کیک کٹ گیا، تحائف دیے گئے، کھانا، ڈانس، جو اس پارٹی میں ہونا چاہیے تھا، ہو سکتا تھا۔ سب ہوا...... لیکن میرے اندر دوسرا ہی شور شروع ہو چکا تھا اور شور بھی کہاں...... وہ تو سناٹا تھا، ایسا سناٹا جس میں صرف ایک سوال کی گونج نے شور ڈالا ہوا تھا کسی کے بچے؟ کس کے بچے؟ اور یہ ایسا سوال تھا جو میں اپنی سب سے بہترین اور بے تکلف دوست ماما سے کرتے ہوئے جانے کیوں ڈر رہی تھی۔ جب جب وہ ہم دونوں بہنوں کو کس کرتیں، ہمیں ہگ کرتیں، ہمیں ڈانٹتیں، جب جب رات گئے وہ ہمارے کمرے میں ہم دونوں بہنوں کو سوتے میں دیکھنے، کمبل ٹھیک کرنے، لائٹ بند کرنے آتیں تو میرا دل چاہتا کہ دھیرے سے پیار کر کے دبے پاؤں جاتی ماما کا ہاتھ تھام کر روک لوں اور پوچھوں کہ کون ہے ہم دونوں میں سے وہ؟'' میں نے ان ہی دنوں آئینہ بہت دیکھنا شروع کر دیا تھا، میں اپنے آپ میں ماما سے مماثلت ڈھونڈتی، قد میرا ماما کی طرح ٹال تھا، اور شکل؟''

"ڈیزی تو بالکل اپنی گرینڈ ما اور بوا کی طرح ہے۔"

گرینڈ ما کی ڈیتھ ہو چکی تھی اور بوا یعنی میری پھوپی، ماما نے بتایا گوا میں رہتی ہیں جن سے واسطہ نہ جانے کیوں نہ تھا۔ اور اب میرا دل چاہنے لگا تھا انہیں دیکھنے اور ملنے کا...... دو چار مرتبہ ماما نے مجھ سے پوچھا بھی کہ کوئی پریشانی، کوئی ٹینشن ہے ڈیزی؟"

"نو ماما...... میں ہزار چاہتے ہوئے بھی نہ کہہ سکی کہ یس ماما!" پڑھائی سے دور بھاگنے والی روزی کی ماما نے ٹونی سے انگیجمنٹ کر دی تھی اور اب وہ بہت دلجمعی سے بیوٹیشن کا کورس کر رہی تھی۔ اپنے آپ میں مست اور زندگی سے جی بھر کی لطف اندوز ہونے والی روزی کو دیکھ کر اکثر میں سوچتی کہ آگہی بھی عذاب ہی ہے۔ اگر اس وقت میری جگہ روزی ہوتی تو کیا تب بھی اتنی ہی مست خوش و خرم ہوتی؟

وہ میرا میڈیکل کا تیسرے سال کا پہلا سمسٹر تھا۔ روزی پارلر کھولنے سے پہلے ایکسپیرئینس (تجربہ) گین کرنے کے لیے ایک بڑے پارلر میں جاب کر رہی تھی، کمنگ کرسمس سے پہلے اس کی شادی پلان تھی جس کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔

تب ہی ہم پہ آسمان ماما کے ہارٹ اٹیک کی صورت میں آ گرا۔ بروقت طبی امداد سے بچت تو ہوگئی مگر ماما کی اچانک بیماری مجھے ہی نہیں روزی کو بھی اندر تک ہلا گئی۔ یوں لگا تھا کہ سر پہ تنی چھت اڑتے اڑتے رہ گئی ہے۔ اور اس روز جب روزی پارلر گئی ہوئی تھی اور ماما بیماری کے بعد پہلی مرتبہ لاؤنج میں آ کر بیٹھی تھیں۔ میرا صبر جواب دے گیا میرے حوصلے کی طنابیں ٹوٹ گئیں ہیں۔ سوالوں کی پوٹلی کھولے ان کے قدموں میں جا بیٹھی، وہ شاکڈ سی لگیں، مجھے لگا کہ ان کو دوسرا اٹیک نہ ہو جائے۔

"تمہیں کس نے بتایا؟" ان کی آواز گہرے کوئیں سے آتی لگی۔ میں نے گھبرا کر انہیں سنبھالا۔

"مجھے کسی نے نہیں بتایا، مگر مجھے پتہ چل گیا ہے بس......"

"آپ بتائیں پلیز......"

"کون ہے، ہم دونوں میں سے؟"

"کوئی نہیں میرے بچے......" انہوں نے کمزور بانہوں میں مجھے سمیٹ لیا۔ تم دونوں ہی میرے دل کے ٹکڑے، میری جان ہو۔

"نہیں ماما......" میں مچل گئی۔

"مجھے بتا دیں پلیز ورنہ میں کچھ نہیں کر پاؤں گی، نہ پڑھ پاؤں گی، نہ جی پاؤں گی۔" ماما لرز اٹھیں۔

"نہ میری جان......" آنسوان کے زردی مائل سانولے رخساروں پہ بہہ نکلے۔

"دنیا کتنی کم ظرف ہے۔" انہوں نے آسمان کی طرف دیکھ کر نہ جانے کس سے کس کا شکوہ کیا۔

چند لمحوں بعد وہ گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر اٹھیں اور اسٹور میں جا گھسیں۔ میں ان کے پیچھے پیچھے تھی، ایک بکس انہوں نے کھلوایا، اس میں سے کچھ نکالا اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی واپس آ کر اپنی جگہ بیٹھ گئیں۔ استخوانی ہاتھوں سے انہوں نے وہ پوٹلی سی کھولی۔ میں نے دیکھا وہ ایک ننھی سی نیلی چادر تھی اور اس میں لپٹا ہوا ایک پولکا ڈاٹس والا عنابی فراک......

"یہ...... چادر اور فراک انہوں نے اپنے زانوؤں پر پھیلایا اور پیار سے اس پر ہاتھ پھیر کر دھیرے سے بولیں۔

"یہ فراک تھا جو تم پہنے ہوئے تھیں اور یہ چادر

تھی جس میں تم لپٹی ہوئی تھیں۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔

میرے اندیشے، میرے اندازے درست تھے، میرے اندر سے بگولے اٹھے اور آنسوؤں کر میرے گالوں پر دھاروں کی صورت بہہ نکلے۔

''وہ ایک سرد رات تھی......'' ماما نے مجھے آغوش میں ننھے سے بچے کی طرح سمیٹا اور دھیرے دھیرے گویا ہوئیں، آنسو ان کے زرد رخسار بھگو رہے تھے اور وہ کہہ رہی تھیں۔

''وہ ایک سرد رات تھی، میں ان دنوں نرسنگ ہوسٹل میں وارڈن تھی، رات گئے معمول کے مطابق میں ہوسٹل کا راؤنڈ لے رہی تھی جب کال بیل بجی، میں نے انٹر کام اٹھایا اور پوچھا کہ کیا بات ہے؟ گارڈ خدا بخش نے بتایا کہ میڈم گیٹ کے باہر سے بہت دیر سے بچے کے رونے کی آواز آ رہی تھی، میں نے دیکھا تو گیٹ سے ذرا آگے درخت کے نیچے کوئی بچہ رکھ گیا ہے۔ میں نے وال کلاک پر نگاہ ڈالی ڈیڑھ بجے تھے۔ میں ڈور کھول کے میں نے گارڈ کے ہاتھ سے بچہ لیا جو سردی سے بری طرح کپکپا رہا تھا۔ بے اختیار ہی میرے منہ سے اس بچے کے والدین کے لیے بُرے الفاظ نکلے۔ میں اپنے کمرے میں آئی دیکھا کہ تم گیلی ہو رہی تھیں۔ میں نے اماں بختو جو صفائی کا کام کرتی تھی اسے اٹھایا، اس نے گرم پانی سے تمہارا جسم صاف کیا، زیتون کے تیل کی مالش کی اور ایک پرانا دوپٹہ پھاڑ کر تم کو اس میں لپیٹا اور رات کے اس پہر غذا اور گرمی پہنچانے کے جو انتظامات وہ کر سکتی تھی اس نے کیے، صبح پولیس کو رپورٹ کی، پولیس آئی کاغذی کارروائی ہوئی۔ جانے کیوں میرا دل نہ چاہا کہ تم کو کہیں اور بھیجوں، پولیس کے حوالے کروں۔

اس وقت میری شادی کو پانچ سال ہو چکے تھے اور میرے بچے نہیں تھے، صرف میں نے ہی نہیں جارج نے بھی تم کو بڑے پیار سے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ پولیس سے اس وعدے کے ساتھ کہ جب بھی تمہارے حقیقی والدین یا وارثوں کا پتہ چلے گا ہم تم کو واپس کر دیں گے۔ پولیس کو ایک رسمی سی کارروائی کرنی تھی، باقی جانے ان کی بلا...... تو میری جان......!'' ماما نے میرا اپنے زانوؤں پہ رکھا سر سہلایا۔ وہ دن اور آج کا دن تم میری زندگی کی بہار ہو، تمہارے آنے سے برکتیں اور رحمتیں خداوند مسیح نے یوں برسائیں کہ جیسے بارش...... جارج کا بزنس یکدم پھلنے پھولنے لگا۔ اتنا کہ صرف تین برس بعد ہی ہم نے یہ خوبصورت گھر خریدا، میری سینیارٹی جو دو سال سے اٹکی ہوئی تھی اس کا مسئلہ حل ہوا مجھے ٹریننگ اور فردر ایجوکیشن کے لیے سلیکٹ کیا گیا اور میں لندن ایڈوانس کورسز کرنے کے لیے بھیجی گئی، تمہارے آنے کے چار سال بعد خداوند نے روزی عطا کی، تو میری چندا! میری زندگی کی اصل بہار، میری جان، میرا سب کچھ اصل میں تم ہو...... تم کو زمین پر میرے لیے، صرف میرے لیے اُتارا گیا ہے۔ لہٰذا میری ہر چیز، اس گھر کی بھی مالک تم اور روزی دونوں برابر کی ہو...... میں یہ سب کچھ زبانی نہیں کہہ رہی ہوں، ماما نے کانپتے ہاتھوں سے میرے آنسو پونچھے۔ میں دن رات بہت لائق ڈاکٹروں کے ساتھ گزار چکی ہوں، گو ڈاکٹر نہیں ہوں...... مگر مجھے پتہ ہے میرے پاس اب بہت وقت نہیں ہے۔

''نہیں ماما...... ایسا نہ کہیں۔'' میں تڑپ اٹھی۔

''ڈیزی میرے بچے!'' ماما نے مستحکم لہجے میں کہا۔

''میں شاید یہ بات تم سے نہ کر پاتی، لیکن آج قدرت نے خود ہی ایسا موقع فراہم کر دیا ہے تو

سنو...... روزی چھوٹی ہے، نادان ہے، لااُبالی ہے، تم سمجھدار ہو، میرے بعد تم کو ہی روزی کو سنبھالنا ہے اور باقی معاملات بھی تم کو ہی دیکھنے ہیں۔ میں نے پیپرز بنوالیے ہیں۔ میرے بعد تم اس پورشن کی قانونی مالک ہو، دوسرا پورشن جو رینٹ پر ہے وہ روزی کا ہے۔ تم دونوں کے اکاؤنٹ الگ الگ میں نے بہت پہلے کھولے تھے دونوں کے نام کے سیونگ سرٹیفکیٹ برابر کے اماؤنٹ کے لاکر میں رکھے ہیں، اور زیور...... ماما جانے کیا کیا بتا رہی تھیں۔ پاپا کے جانے کے بعد وہ پہلا دن تھا جب میں روئی اور بے انتہا روئی یہ جانے بنا کہ مجھے ابھی اور رونا ہے اور روزانہ رونا ہے اور رونے کے لیے مجھے کوئی کندھا، کوئی سینہ کوئی زانو بھی میسر نہ ہوگا۔ جس پہ سر رکھ کر میں روسکوں۔

ماما کو ان کے اندازے کے مطابق زندگی نے یا شاید موت نے مہلت نہ دی وہ ٹھیک ہوئیں۔ جاب جوائن کی مگر اس دوران وہ ریٹائرمنٹ کے لیے پوری تیاری کر چکی تھیں کہ انہیں فالج کا اٹیک ہوا اور جانبر نہ ہوسکیں اور میں لمحوں میں 'بڑی' ہوگئی۔ بہت بڑی...... ماما کی آخری رسومات میں نے ان کے شایانِ شان کیں۔ روزی کو میں نے ننھے چوزے کی طرح اپنے پیروں میں گویا سمیٹ لیا۔ وہ تھی بھی تو چوزہ سی، چوزے جتنا دل، اتنی ہی عقل، اتنی ہی سمجھ و حوصلہ...... اتنا بڑا گھر اور ہم دو لڑکیاں شاید زندگی بہت ہی مشکل ہوجاتی اگر ایک پورشن میں مہربان سے کرائے دار نہ ہوتے، آنٹی مارتھا اور ٹونی نہ ہوتے...... ایک سمسٹر موت و بقا کے جھمیلوں میں ڈراپ ہوگیا۔ میری تیاری نہ ہوسکی، تب ہی ٹونی اور آنٹی کی خواہش پر میں نے روزی کی شادی کا انتظام کیا، سادگی مگر ایک شان سے ہونے والی اس شادی کی رات جب روزی رخصت ہوئی مجھے لگا ماما میرے آس پاس ہیں۔ مجھے پیار سے دیکھ رہی ہیں۔ میرے کیے ہوئے انتظامات کو سراہا رہی ہیں، شادی کے تیسرے دن ٹونی اور روزی ہنی مون پر ناردن ایریاز چلے گئے۔ بیس دن بعد دولہا دلہن واپس آئے تو چنچل، ہنستی مسکراتی روزی مجھے کچھ اُلجھی اُلجھی لگی، سوچا پوچھوں۔ مگر پوچھ نہ پائی شادی شدہ بیٹی کیا واقعی پرائی ہوجاتی ہے کہ اس سے بات کرنے کے لیے موقع محل دیکھنا پڑتا ہے؟'' روزی گھر میں ہی پارلر کا سیٹ اپ بنا رہی تھی، وہ بزی تھی اور دو ہفتے گزر گئے تھے وہ ویک اینڈ پر بھی نہیں آئی تھی اس اتوار میری آنکھ ٹونی کی آواز سے کھلی، وہ میرے سرہانے کھڑا تھا مجھے بڑا ناگوار محسوس ہوا کہ یہ یوں میرے بیڈروم میں کیسے؟''

میں چادر اپنے اوپر سمیٹ کر اٹھی تو روزی کو دیکھا۔

''گڈ مارننگ......'' ناگواری چھپاتے ہوئے میں نے پیار سے کہا۔

''مارننگ......'' ٹونی نے پھر سا کھینچ مارا روزی آج بھی اُلجھی اُلجھی کچھ سہمی ہوئی سی لگی۔

''تم سے کچھ بات کرنی ہے، پندرہ منٹ میں آجاؤ۔'' ٹونی عجیب انداز سے بولتا کمرے سے چلا گیا۔ پیچھے پیچھے روزی بھی میرے دماغ میں گھنٹی سی بجی۔ ایک اَن ہونی کے ہونے کا احساس دل دھڑکا گیا۔ سب سے پہلی بات جو میرے ذہن میں آئی وہ دونوں کی کوئی لڑائی تھی۔ میں فریش ہو کے لاؤنج میں آئی تو ٹونی صوفے پر بیٹھا ریموٹ ہاتھ میں تھامے ٹی وی پر نگاہیں جمائے بیٹھا تھا اور انتہائی گرم چائے پینے والی روزی چائے پہ جمی جھلی کو تک رہی تھی۔

''ٹونی! ناشتہ کیا تم نے؟'' ٹوسٹر میں سلائس رکھتے ہوئے میں نے اماں شیداں کو ہاف فرائی انڈہ

لانے کو کہا۔

"جی کر کے آیا ہوں۔" ٹونی نے مڑے بنا جواب دیا۔

اماں شیداں انڈہ اور گرم چائے لائی تو ٹوسٹ پر بٹر لگاتے ہوئے میں روزی سے آج اس کے بجھے بجھے رہنے کی بابت پوچھنے کا سوچ رہی تھی تب ہی ٹونی میرے سامنے والی کرسی پر روزی کے برابر آبیٹھا۔

"تم یہ گھر کب خالی کر رہی ہو؟" بلا تمہید پتھرائے لہجے میں پتھرائے چہرے کے ساتھ بولتا وہ مجھے پل بھر میں پتھر کر گیا۔ منہ تک جاتا لقمہ میری گود میں گر گیا، بڑے جتنوں سے میں نے روزی کی طرف دیکھا وہ سفید چہرے پر لبالب پانیوں سے بھری آنکھیں لیے بیٹھی تھی۔ مجھے سنبھلنے میں چند منٹ لگے میں کمزور نہیں ہوں۔ میں کمزور نہیں پڑوں گی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا اور چائے کا کپ ٹیبل پہ آگے کھسکا کر میں سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"اتنی جلدی...... اتنی جلدی کی مجھے امید نہیں تھی۔" میں نے لرزتے دل کے ساتھ دانت پہ دانت پہ جما کر اس شخص ٹونی کا چہرہ دیکھا۔ جس کو اب تک میں روزی کے حوالے سے بھائی کی حیثیت سے سوچتی، دیکھتی، سمجھتی تھی۔ مگر......

"مگر آج پتہ چلا کہ میرے اندر اس آدمی کے لیے جو ایک ناپسندیدگی کا احساس تھا وہ دراصل اس کی بدنیتی تھی جو آج ظاہر ہوگئی۔ روزی سے محبت کا ڈرامہ بھی لمحہ بھر میں بخوبی واضح ہوگیا۔

"کیوں؟" میں نے اپنی آواز کو حتی الامکان لرزنے سے بچایا۔

"کیونکہ تم ایڈاپڈ چائلڈ ہو۔ اس گھر کی قانونی وراثت صرف روزی ہے اور......" روزی پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

میں نے اس اجنبی اور بے مروت و بدنیت انسان کو افسوس سے دیکھا جو چند لمحے پہلے تک میرا بھائی تھا۔ میرا بہنوئی تھا۔ روزی کے حوالے سے میرے لیے بہت پیارا، بہت اہم تھا، مگر اب......"

"مسٹر ٹونی!" بے ارادہ ہی میں بھی اجنبی بن گئی۔

"ایڈاپڈ چائلڈ مسلم لاء میں وراثت کا حقدار نہیں ہوتا۔ ہم تم کرسچن ہیں اور پاکستانی قانون ہمیں اجازت دیتا ہے کہ ہم اپنے مذہبی اصول و ضوابط اور قوانین کو فالو کر سکیں اور ہمارے مذہبی احکام کے مطابق وصیت کر کے اپنی جائیداد، روپیہ یا کچھ بھی، کسی کو بھی دی جا سکتی ہیں اور ماما کی ول کے مطابق یہ پورشن میرا ہے۔ جو پورشن رینٹ پر ہے وہ روزی کا ہے اور......"

"بکواس کرتی ہو تم......" میری بات پوری ہونے سے پہلے وہ کرسی دھکیل کر یوں کھڑا ہوا جیسے وہ مجھے جھپٹ کر موڑ تروڑ دے گا میں نے بمشکل اپنے آپ کو رونے اور چلانے سے روکتے ہوئے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

"میں بکواس نہیں کر رہی۔ اگر تفصیل جاننا چاہتے ہو تو انکل ناصر سے پوچھ لو۔" میں نے ماما کے وکیل کا نام لیا اور ہنستا بستا گھر جو ماما اور پاپا کی محبتوں کا امین تھا بکھر گیا۔ دو سکھیاں، دو بہنیں دو ہوتے ہوئے بھی اکیلی ہوگئیں۔

روزی کم عمر اور معصوم سی تھی، ٹونی کے دھونس اور دباؤ میں آگئی۔ مجھے اللہ نے ہمت دی، اچھے لوگوں کا ساتھ دیا اور وقت جس کا کام ہی ہے گزرنا، گزر گیا۔ کبھی تنگی ترشی سے، کبھی فراخی سے، کبھی مشکلیں رہیں، کبھی راحتیں...... بجھ جانے والے چراغوں کی بدولت ہونے والی تیرگی نئے جلنے والے چراغوں کی لو میں جگمگا اٹھتی ہے۔ میں ڈاکٹر نہ بن سکی، مگر ماما نے جو چراغ جلایا تھا میں نے اسے

بجھنے نہیں دیا۔

''گوڈ'' میری این جی او کا نام ہے جس کے تحت ماما کے ترکے میں ملنے والا پورشن اب ایک شیلٹر ہوم ہے۔ یہاں بے نام و نسب بچے پناہ و پرورش پاتے ہیں۔ جانے غربت بڑھ رہی ہے یا بدکاری...... کہ اب یہ گھر تنگ محسوس ہونے لگا ہے اسی لیے ماما کا دیا ہوا زیور اور سیونگ سرٹیفکیٹس اب میں اس پورشن کی دوسری منزل بنوانے پر خرچ کر رہی ہوں۔ وقت کتنا آگے نکل چکا ہے۔ اس کا احساس اب مجھے روزی کے دونوں بچوں کو دیکھ کر ہوتا ہے جو اپنے باپ کے کاندھوں کے برابر آ گئے ہیں اور ایک ہی علاقے میں رہنے کی وجہ سے اکثر باپ ماں کے ساتھ آتے جاتے نظر آتے ہیں۔ لیکن...... وہ مجھے نہیں جانتے، میں انہیں نہیں جانتی۔''

کتنے ہی لوگ، کتنے ہی ہاتھ تھے جو میرا ہاتھ تھامنے بڑے شوق سے بڑھے تھے، ان میں وہ بھی تھے جو مجھے نہیں جانتے تھے اور وہ بھی جو مجھے ''جانتے'' تھے۔ مگر میں کوئی بھی ہاتھ تھام نہ سکی۔

''میں نہیں جانتی۔''

''میں نہیں جانتی کہ میں اپنے والدین کے لیے ایسی ان چاہی کیوں تھی کہ انہوں نے مجھے اپنی زندگیوں سے ہی نکال پھینکا۔

''کیا وہ غربت کے مارے ہوئے تھے؟ یقین نہیں آتا۔''

کیا وہ اخلاق و کردار سے عاری تھے؟ سوچنے کی ہمت نہیں ہوتی کل اگر میرے بچوں نے میرا حوالہ جاننا چاہا تو ان کو کیا جواب دوں گی اس، صرف اس ایک ممکنہ سوال نے کبھی میرے خوابوں کو گلاب نہ ہونے دیا۔

''گوڈ'' میں آنے والا ہر نیا بچہ مجھے نئی اذیت میں مبتلا کر دیتا ہے میں ایک مسلم ملک، مسلم معاشرے کی پروردہ ہوں، کیا عجب کہ میرے والدین بھی مسلم ہی ہوں۔ کیا انہوں نے کبھی سوچا ہوگا کہ انہوں نے جو اولاد پھینک دی تھی اگر وہ کتے بلیوں سے اور موسم کی سختی سے بچ گئی ہے تو کس گود میں پل بڑھ رہی ہے؟'' میری ''گوڈ'' میں آنے والا ہر نیا بچہ میرے ذہن میں بڑے ہی عجیب سوالوں کے جھاڑ جھنکاڑ بکھیر دیتا ہے جن سے نجات پانے میں دن لگ جاتے ہیں۔

''کیا میری ماں کی گود کبھی مجھے یاد کر کے بلکی ہوگی؟'' کیا میرے باپ کو کبھی اس لمحہ پر پشیمانی محسوس ہوئی ہوگی جب وہ ایک ذی روح کو وجود میں لانے کا باعث بنا۔

''کیا کبھی میرے باپ کی انگلی نے میری ننھی ہتھیلی کے لمس کی گرمی کو یاد کیا ہوگا؟''

ہر چند کہ میری آنکھوں نے خوابوں کی رنگین ردا پھینک کر سرمئی رنگ سے سر رنگ لیا ہے۔ زندگی کی رنگینیوں میں اب سفید یا سیاہ رنگ ہی دیکھ پاتی ہوں۔ پھر بھی...... پھر بھی عجیب بات ہے کہ مایوس نہیں ہوں شاید اس لیے کہ مجھے لگتا ہے کہ اس عالم رنگ و بو میں آنے والا ہر نیا بچہ مستقبل کی اچھی امید بن کر آتا ہے اور یہ بھی اس مالک کائنات کی مہربانی ہے کہ مستقبل کی امید 'بچہ' میں کچھ بچوں کا نگران و نگہبان اس نے مجھے بننے کا موقع دیا ہے۔

ہر چند میرے آنچل میں ماں، بہن، باپ، بھائی کسی کی بھی دعاؤں کے پھول نہیں...... اور دعاؤں کے محتاج تو ہم ہمیشہ رہتے ہیں ناں۔

سو مجھے اطمینان یہ ہے کہ ''گوڈ'' میں سمائے بچوں کی مسکراہٹیں میرے لیے دعا کا کام کریں گی۔ میں تہی دامن و تہی دست ہوتے ہوئے بھی بہت ہی مالا مال ہوں۔

☆☆......☆☆

ناولٹ

مریم شاہ بخاری

جب جب دل ملے

"بیٹا جی...... آپ کو کورس کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی...... آپ میرے ساتھ آفس کیوں نہیں جوائن کر لیتی آخر ایک نہ ایک دن تو آپ نے سنبھالنا ہی ہے۔ ملک اتباع علی نے اپنی بیٹی کو محبت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ سامعہ ملک پہلو بدل کر رہ گئیں۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ......

"اصحب حیدر" تارکول کی لمبی سڑک پر تنہا چلتا ہوا اس وقت شدید مایوسی اور پریشانی کا شکار تھا راستے میں آئے ہر پتھر کو ٹھوکر کی زد سے اڑاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی زندگی بھی راستے کا پتھر ہے جسے ہر کوئی ٹھوکر مار کر گزرتا چلا جاتا ہے۔" ایم بی اے کی ڈگری کو اس نے غصے اور نفرت سے دیکھا تھا جس کا اسے ابھی تک کوئی فائدہ نہ ہوا تھا تین سالوں سے وہ اعلیٰ جاب کے لیے دھکے کھاتا پھر رہا تھا مگر کہیں سے بھی اس کی شنوائی نہ ہوئی تھی اس کے لیے تعلیمی ریکارڈ کو نظر انداز کر کے کوئی موٹی سفارش اور رشوت کا مطالبہ کیا جاتا تھا بھلا وہ غریب خاندان سے تعلق رکھنے والا ایک عام سا نوجوان کہاں سے لاتا رشوت یا سفارش جس کی تعلیم کے لیے اس کی ماں دن رات ایک کیے لوگوں کے کپڑے سیتی تھی اور وہ خود چھوٹی موٹی نوکری کر کے اپنا خرچ اٹھا رہا تھا آج کے تیز رفتار دور اور مہنگائی میں بھلا اس کی چھوٹی سی نوکری کی کیا حیثیت تھی لیکن وہ پر امید تھا کہ اس کے حالات اک روز ضرور بدلیں گے وہ بھی اچھی زندگی گزاریں گے مگر وہ روز کب آئے گا یہ اسے بھی خبر نہ تھی ابھی تک تو اس کے حصے میں صرف ناکامی ہی آئی تھی گھر واپس جاتے ہوئے اسے شرم محسوس ہو رہی تھی کیا جواب دے گا اپنی بوڑھی ماں کو...... کیسے دیکھے گا ان روشن آنکھوں میں دم توڑتی امید کو......؟" اصحب حیدر کی نگاہوں میں ماں کا چہرہ گھوم گیا تھا میرے اللہ میں کیا کروں......؟ اس نے بے بسی سے ایک بار پھر سے رستے میں پڑے پتھر کو زور سے ٹھوکر ماری تھی مگر دوسرے ہی پل درد کی شدت سے اس کے ہونٹوں سے آہ نکلی تھی زور سے ٹھوکر مارنے کی وجہ سے اس کے پاؤں کا انگوٹھا زخمی ہو گیا تھا نمناک نگاہوں سے اپنے پاؤں کے زخمی انگوٹھے سے رستے ہوئے خون کو دیکھا تھا۔

☆......☆......☆

شام ڈھلے جب وہ گھر لوٹا تو تھکن اور

پریشانی سے اس کا برا حال تھا اس کے چہرے پر واضح طور پر لفظ 'ناکامی' لکھا ہوا تھا زہرہ خاتون نے اپنے اکلوتے نور نظر کی حالت سے ہی جان لیا تھا کہ اس انٹرویو کا کیا ہوا ہوگا؟ ان تین سالوں میں وہ مکمل طور پر اس کی عادی ہو چکی تھیں لیکن پھر بھی اک آس تھی کہ شاید اب ایسا نہ ہو......

حالات بدل جائیں مگر ہر روز ہی ان کی امیدیں دم توڑ جاتی تھیں۔

اب تو انہوں نے سب کچھ تقدیر پر چھوڑ دیا تھا زہرہ خاتون نے اصحب حیدر سے نظر چرا کر اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کیے تھے اور اٹھ کر اس کے لیے کھانا لینے چل دیں جبکہ اس نے اپنی

ماں کے بوجھل قدموں اور لڑکھڑاہٹ سے جان لیا تھا کہ اس وقت ان کے دل پر کیا بیت رہی ہے دل جیسے ایک دم ہر چیز سے اچاٹ سا ہو گیا تھا۔

اس کی نگاہوں میں بے بسی تھی اور چہرہ غم زدہ سوچوں کی لکیروں کا غماز بنا ہوا تھا زہرہ خاتون نے کھانا اس کے سامنے لا کر رکھا تھا۔ اصحب حیدر کا کھانے کو بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن اپنی ماں کا دل بھی برا نہیں کرنا چاہتا تھا سو اس لیے خاموشی سے کھانا حلق سے نیچے اتارنے لگا اس کا یہ اداس اور مایوس کن چہرہ زہرہ خاتون کو ہولائے دے رہا تھا اس کی مسلسل چپ نے انہیں بے قرار کر دیا تھا اصحب بیٹا کچھ تو بولو۔ اس نے پل کی پل نظریں اٹھا کر ماں کو دیکھا تھا اس کی آنکھوں میں جانے کیا تھا کہ زہرہ خاتون کا کلیجہ منہ کو آ گیا...... میرے بچے۔ کچھ بول تو سہی...... ایسا کیا ہو گیا ہے......؟

کیا بولوں اماں میں اپ کو بھی سکھ نہیں دے سکتا...... وہ لاچاری سے بولا تھا جبکہ زہرہ خاتون تڑپ سی گئی نہیں ایسے تو نہ بولو...... مایوسی کفر ہے بیٹا اللہ طر بھروسہ رکھو کیوں ہمت ہار بیٹھے ہو صبر اور حوصلے سے کام لو۔

اماں کب تک صبر کروں خود سے گھن آنے لگی ہے مجھے میں کیسا بد نصیب بیٹا ہوں جو اپنی ماں کو آرام دینے کی بجائے ان پر بوجھ بنا ہوا ہے اس کے لہجے میں درد ہی درد تھا زہرہ خاتون کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے کیوں ایسی باتیں کر کے میرا دل دکھا رہے ہو اصحب حیدر بھلا اولاد بھی اپنے ماں باپ کے لیے بوجھ ہوتی ہے......؟ میں نے تجھے کبھی بوجھ نہیں سمجھا جو کچھ میں کرتی ہوں وہ میرا فرض ہے۔ ہاں ہر فرض آپ نبھاتی رہیں گی جبکہ میں...... وہ غصے سے بات ادھوری چھوڑ کر گھر سے باہر نکل آیا۔

☆......☆......☆

وہ اک نئی امید کے ساتھ منہا ٹیکسٹائل انڈسٹری میں انٹرویو کے لیے آیا ہوا تھا وہ اس کے تعلیمی ریکارڈ کو چیک کرنے کے ساتھ ساتھ اس سے مختلف سوالات بھی کر رہے تھے جن کے جوابات وہ نہایت اعتماد سے اور بے باک انداز میں دے رہا تھا۔ منہا ٹیکسٹائل انڈسٹری کے اونر ملک اتباع علی کی تجربہ کار نگاہیں اس کے چہرے پر لگی ہوئی تھیں وہ اس کے اعتماد خاص طور پر بے باک انداز سے متاثر ہوئے تھے میاں برخوردار کوئی رشوت یا سفارش وغیرہ بھی لائے ہو یا پھر انہوں نے بات ادھوری چھوڑی تھی۔ اصحب حیدر کے وجیہہ چہرے پر ایک سایہ سا لہرایا لیکن جب بولا تو اس کے لہجے میں وہی اعتماد اور بے نیازی تھی رشوت اور سفارش تو نہیں ہاں البتہ خدا کی ذات کے بعد بوڑھی ماں کی دعائیں ساتھ ضرور لایا ہوں اگر آپ کو رشوت یا سفارش درکار ہے تو پھر وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں مجھے اجازت دیجیے۔ وہ نہایت سنجیدگی سے کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا جبکہ ملک اتباع علی نے اپنے ہونٹوں پہ بے ساختہ امڈ آنے والی مسکراہٹ کو جلدی سے چھپا لیا تھا اصحب حیدر نے ایک پل کے لیے ان کی طرف دیکھا اور تیزی سے وہاں سے نکلتا چلا گیا جلدی میں وہ اپنی سی ویز لینا بھی بھول گیا۔

☆......☆......☆

اگلے روز وہ حیرت سے ہاتھ میں پکڑی ہوئی اپنی سی ویز کو دیکھ رہا تھا جس کے ساتھ ہی اسے اپائنٹمنٹ لیٹر بھی ایشو ہوا تھا اسے دو دن کے اندر بحیثیت کمپنی کے مینیجر کے ذمہ داریاں

سنبھالنے کو کہا گیا تھا ابھی سیٹ عارضی تھی مگر بعد میں اس کے کام کو دیکھ کر مستقل بھی ہو سکتی تھی ماہانہ تنخواہ بھی پرکشش تھی وہ بہت خوش تھا آخر اتنے سالوں بعد اسے اپنی منزل مراد جو مل گئی تھی زہرہ خاتون نے خوشخبری سنی تو فوراً ہی شکرانے کے نوافل پڑھنے چل دی کہ بے شک خدا ہی بہتر کارساز ہے۔

☆......☆......☆

باورے نیناں تن کو دیکھیں نہ یہ من کو پہچانے
کوئی نہ جانے جب یہ نیناں ہو جاتے ہیں دیوانے
اونچ نیچ کو یہ نہ دیکھیں یہ نہ پوچھیں نام
دو نینوں کا کام ہے سارا......
روشنیوں کا کام......!!

وہ آفس پہن کر جانے کے لیے چند جوڑے خریدنے مارکیٹ آیا ہوا تھا وہ اپنے خیال میں مگن بڑی تیزی سے جا رہا تھا کہ سامنے سے آتا ہوا وجود اس سے آن ٹکرایا۔ اف...... آہ...... ایک نسوانی آواز اس کے کانوں میں پڑی تھی۔

توبہ ہے بھئی۔ انسان ہو یا پتھر دماغ ہلا کے رکھ دیا...... وہ اپنا سر دباتے ہوئے بولی تھی۔ اصحب حیدر تو اس کی معصوم صورت میں کھویا ہوا تھا کیا ہے اب یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہے ہو پہلے کبھی کوئی لڑکی نہیں دیکھی۔ وہ غصے سے بولتی ہوئی نیچے جھک کر اپنا بیگ اٹھانے لگی جو زمین بوس ہو چکا تھا۔ جبکہ وہ بوکھلا سا گیا۔ جج...... جی آپ نے کچھ کہا۔ لڑکی نے بری طرح چڑ کر اسے دیکھا۔

جی ہاں محترم...... آپ سے غرض ہے کہ میرا راستہ چھوڑ دیئے۔ جم کر ہی کھڑے ہو گئے ہیں راستے میں وہ بڑبڑاتی ہوئی اس کے پہلو میں سے گزر کر آگے بڑھ گئی تھی۔ اصحب حیدر کو لگا تھا کہ جانے والی اپنے ساتھ اس کا دل بھی لے گئی ہے ایک دم ہی اسے اپنا آپ خالی خالی لگنے لگا تھا۔ عجیب طریقے سے واردات ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

ملک اتباع علی اصحب حیدر کی کارکردگی سے بے حد متاثر ہوئے تھے وہ بہت لگن اور محبت سے اپنا کام کر رہا تھا ملک اتباع علی بہت خوش تھے کہ ان کا انتخاب برا نہیں تھا۔ انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر اس نوجوان کو اپنے آفس میں رکھا تھا۔

''ملک اتباع علی'' صرف اس کی قابلیت سے ہی متاثر نہیں ہوئے تھے۔ اس کے پیچھے کوئی اور بھی وجہ تھی۔ جب وہ پہلی بار اس کا ریکارڈ چیک کر رہے تھے تو اُس کے والدیت میں لکھے ہوئے نام کو پڑھ کر وہ ٹھٹھک گئے تھے۔ پھر اسکی عادات اور بات کرنے کا انداز انہیں چونکا جاتا تھا۔

وہ ماضی کے دھندلکوں میں اٹی تصویر کے نقوش اس میں تلاشنے لگ جاتے تھے۔ عجیب سی کشش تھی جو اُس کی طرف کھینچنے پر مجبور کیے جا رہی تھی۔ انہوں نے کئی بار 'اصحب حیدر' سے استفسار بھی کرنا چاہا تھا مگر جھجک آڑے آ جاتی پھر اس کا محتاط رویہ بھی انہیں روک لیتا۔ بیس برس بیت چکے ہیں جانے وہ کس حال میں ہوگا؟ وہ سرد آہ بھر کر رہ جاتے۔

''تمہیں کہاں ڈھونڈوں اے اجنبی لڑکی......'' اصحب حیدر بے بسی کی تصویر بنا نزدیکی پارک میں بے سنگی بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ کیسے لمحوں میں تم نے مجھے اپنا اسیر کر لیا ہے۔ کیسے راستہ ڈھونڈوں تم تک آنے کا؟ میں جتنا تم سے

دور ہونا چاہتا ہوں تم اتنا ہی میرے قریب آتی جارہی ہو۔ کیا محبت ایسے بھی ہوتی ہے؟ خودتو دنیا کی بھیڑ میں گم ہوگئی ہو لیکن مجھے تنہا کر گئی ہو۔ میں کسی سے کہہ نہیں سکتا۔ میرے پاس کوئی اتا پتا نہیں تمہارا...... تمہارے نام سے بھی واقف نہیں، ہوا کے جھونکے کے مانند میری زندگی میں آئی اور چلی بھی گئی۔ کاش کہ میں تم سے نہ ملا ہوتا۔ نہ دیکھا ہوتا تم کو...... میرے دل کو اپنا کر کے، میری سوچوں اور احساسات پر اپنی محبت کا کڑا پہرہ لگا کر کہاں کھوگئی ہو اے پیاری لڑکی...... اس نے بے چین سا ہو کر پارک میں آتے جاتے لوگوں کو دیکھا۔ اور گھر جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔

☆......☆......☆

ملک اتباع علی ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھے اخبار پڑھنے میں مصروف تھے جبکہ ان کے دائیں جانب بیٹھی مسز سامعہ ملک اپنی بیٹی منہا اتباع علی کو دیکھ رہی تھی جو آج خلاف معمول خاصی خاموش، خاموش سی تھی۔ ناشتہ بھی ٹھیک سے نہیں کر رہی تھی۔ سامعہ ملک سے رہا نہ گیا تو انہوں نے اُسے ٹوک دیا۔ ''منہا گڑیا آپ ناشتہ کیوں نہیں کر رہی، طبیعت تو ٹھیک ہے ناں، یہ خاموشی کیوں؟'' سامعہ ملک کے کہنے پر ملک اتباع علی نے بھی چونک کر اپنی لاڈلی بیٹی کو دیکھا تھا جس کے چہرے پر خاصی سنجیدگی طاری تھی۔ ملک اتباع علی اور سامعہ ملک کی دو ہی اولادیں تھیں۔ بڑا بیٹا موتم الاشبال تھا جو کہ انگلینڈ میں اپنی بیوی اور دو جڑواں بچوں کے ہمراہ رہائش پذیر تھا۔ موتم الاشبال وہاں ایک غیر ملکی کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر کام کر رہا تھا۔ وہ ہر سال بچوں کو لے کر پاکستان ضرور آتے تھے جنہیں دیکھ اور مل کر دادا، دادی اور پھوپو کھل اٹھتے تھے۔ موتم الاشبال سے دس برس چھوٹی منہا اتباع علی تھی جو کہ ایم فل کرنے کے بعد آرام سے گھر میں بیٹھ گئی تھی۔ اس کا ارادہ ملک اتباع علی کا بزنس سنبھالنے کا تھا مگر فی الحال اس نے اپنا ارادہ کسی پر ظاہر نہیں کیا تھا۔

''بابا جان...... میں فارغ رہ کر بور ہوگئی ہوں۔ میں سوچ رہی تھی کیوں نہ کوئی چھوٹا موٹا کورس کرلوں......' اس نے سامعہ ملک کے سوال کو نظر انداز کر کے ملک اتباع علی کو مشورہ طلب نگاہوں سے دیکھا تھا۔

''بیٹا جی...... آپ کو کورس کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی...... آپ میرے ساتھ آفس کیوں نہیں جوائن کرلیتی آخر ایک نہ ایک دن تو آپ نے سنبھالنا ہی ہے۔ ملک اتباع علی نے اپنی بیٹی کو محبت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ سامعہ ملک پہلو بدل کر رہ گئیں۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ ہم اس کی شادی کر دیتے ہیں۔ اچھا ہے ناں اپنا فرض پورا کر دیں۔ آخر 22 سال کی تو ہوگئی ہے۔'' سامعہ ملک کی آنکھوں میں شرارت اور لہجے میں سنجیدگی تھی۔

''اوہ نو ماما پلیز...... ناٹ شادی وادی...... بابا میں آج ہی سے آپ کے ساتھ آفس چلوں گی۔'' وہ منہ بسورتے ہوئے بولی۔

تو ملک اتباع علی کے ساتھ ساتھ سامعہ ملک بھی ہنس دیں۔

''او کے بابا کی جان...... چلی چلنا...... لیکن......!'' وہ بات کرتے رُک گئے۔

''لیکن کیا؟'' اس نے ابرو اچکاتے ہوئے انہیں دیکھا تھا۔

''آپ کی ماما کی بات بالکل ٹھیک ہے۔ میرے خیال میں اب زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔'' ملک اتباع علی نے اپنی ہنسی دباتے

ہوئے اسے دیکھا تھا جس کے تیور بگڑ چکے تھے۔
''بابا جان......'' وہ خفگی سے بولی تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔

☆......☆......☆

اصحب حیدر کسی اہم فائل پر سائن کروانے کے لیے ملک اتباع علی کے روم میں داخل ہوا تھا۔
''سر...... یہ سائن کردیں۔'' وہ فائل ملک اتباع علی کے آگے رکھتے ہوئے بولا۔
''بیٹھو......'' انہوں نے اشارے سے اسے بیٹھنے کا کہا تو وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ ملک اتباع علی فائل چیک کرنے میں مصروف تھے جبھی ایک دم دروازہ کھلا تھا۔
''بابا جانی...... میں آپ سے ناراض ہوں۔ مجھے اپنے ساتھ لا کر بھول گئے۔ میں بور ہو رہی ہوں اکیلے......'' وہ تیز تیز بول رہی تھی۔ اصحب حیدر نے چونک کر آنے والی شخصیت کو دیکھا تھا۔ نگاہ نے جیسے پلٹنے سے انکار کردیا تھا۔
فیروزی اور پنک کلر کے کنٹراسٹ کپڑوں میں ملبوس، چہرے پر خفگی لیے وہ دشمنِ جاں اس کے سامنے کھڑی تھی۔ جسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ مایوسی کا شکار ہو چلا تھا۔ اک سحر سا اس پہ طاری ہو چکا تھا۔ وہ بنا پلک جھپکائے اس کو تکنے میں مصروف تھا۔ قدرت اس پر یوں بھی مہربان ہوگی اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ وہی خدوخال، وہی معصوم صورت...... منہا اتباع علی نے اچنبھے سے اصحت حیدر کو دیکھا جو اردگرد سے بے نیاز بس اسے دیکھے جارہا تھا۔
''اوہو بیٹا...... میں واقعی بھول گیا تھا آپ میرے ساتھ آئی ہو۔'' ملک اتباع علی کی آواز پر وہ ہوش کی دنیا میں واپس لوٹ آیا۔
''آؤ بیٹھو......'' وہ خفا خفا انداز میں چلتی دور رکھے صوفے پر جا بیٹھی۔ اصحب حیدر کی دھڑکنوں میں قیامت سی برپا تھی۔
منہا اتباع نے تیکھی نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔ ملک اتباع علی نے فائل اصحب حیدر کی طرف بڑھائی۔
''یہ لو اصحب بیٹا...... آپ کا کام ہوگیا۔''
اصحب حیدر نے 'تھینکس' کہہ کر فائل تھام لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔
''منہا بیٹی یہ اصحب حیدر ہے بہت ذہین اور شاندار بندہ ہے ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی اسے اپائنٹ کیا ہے۔ اور اصحب یہ میری پیاری بیٹی منہا اتباع علی ہے آج سے یہ بھی آفس جوائن کرچکی ہیں۔ ویسے میری بیٹی بالکل تمہاری طرح ذہین ہے اب دیکھتے ہیں کہ ان کی ذہانت کہاں تک کام کرتی ہے۔ ملک اتباع علی نے دونوں کا تعارف کرواتے ہوئے آخر میں شرارت سے کہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔
منہا اتباع علی نے سپاٹ نگاہوں سے اسے سرتاپا گھورا تھا۔
''سر میں چلتا ہوں۔'' اس کی اجنبی نگاہ سے گھبرا کر ملک اتباع علی سے اجازت لے کر روم سے نکل آیا۔

☆......☆......☆

منہا اتباع علی کو کام سمجھانے کی ذمہ داری رضوان ظفر اور اصحب حیدر کو سونپی گئی تھی۔ آفس ورک کے دوران منہا اتباع علی نے اصحب حیدر کو ہر طرح سے پرکھا تھا۔ وہ اس کی اپنے کام سے سنجیدگی اور ذہانت سے خاصی متاثر ہوئی تھی۔ منہا اتباع علی کو پورے اعتماد کے ساتھ اس نے بزنس کی اونچ نیچ سے آگاہ کیا تھا۔ ہر معاملے پر اس کی گہری نگاہ تھی۔ وہ اس کی ظاہری شخصیت ہی نہیں

بلکہ کردار کی بھی معترف ہوئی تھی۔ کام کے دوران کتنے ہی مواقع آئے تھے جب وہ بالکل تنہا تھے۔ مگر اصحب حیدر نے ان لمحوں میں ایک بار بھی اس پر نگاہِ غلط نہیں ڈالی تھی بلکہ پہلے سے بھی زیادہ محتاط ہو جاتا تھا۔ اس سے یہ ہوا تھا کہ منھا اتباع علی کے دماغ سے اس کا 'سڑک چھاپ' والا تاثر زائل ہو گیا تھا جو پہلی اتفاقیہ ملاقات سے اس کے ذہن نے بن ڈالا تھا۔ اسے اعتراف کرنا پڑا تھا کہ 'اصحب' وہ نہیں ہے جو اس نے سوچ رکھا تھا۔

☆......☆......☆

اصحب حیدر کے دل میں پھوٹنے والے جذبے سرد پڑ چکے تھے۔ جب سے منھا اتباع علی کی حیثیت اس کے سامنے کھل کر آئی تھی وہ خود کو کمتر محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ اپنی اوقات اچھی طرح سے جان گیا تھا اتنے کروڑوں کی جائیداد کی مالک منھا بھلا اس جیسے شخص کی محبت کو کیسے قبول کر سکتی تھی؟

وہ اپنے جذبوں کی پذیرائی کرنے کی بجائے خود بخود اپنے خول میں سمٹ گیا۔ اصحب حیدر نے اپنی ذات پر کڑے پہرے بٹھا لیے تھے۔ اس یکطرفہ محبت کی آگ کو بجھانے کے لیے منھا کو نظر انداز کرنے لگا تھا جب وہ سامنے آجاتی خود کو بے نیاز بنا کر دل کے مچلتے ارمانوں کو نظر انداز کرتا آگے بڑھ جاتا یا کام میں مصروف ہو جاتا۔ اُس کو دیکھنے کے لیے مچلتی بے قرار نگاہوں کو جھکا لیتا تھا۔

منھا واحد لڑکی تھی جو پہلی ہی نظر میں اس کے جسم و جاں کی مالک بن بیٹھی تھی۔ اس کی سادگی اور معصومیت سے بھرپور اداؤں کے سامنے یہ مضبوط اعصاب رکھنے والا اصحب حیدر بری طرح ہار گیا تھا مگر وہ اپنی ہار ظاہر کر کے اپنے مالک سے نمک حرامی کا طعنہ نہیں سن سکتا تھا۔ اسے محبت سے زیادہ اپنی عزت عزیز تھی۔

☆......☆......☆

کہتے ہیں کہ جذبوں کی سچائی اپنا رستہ خود بنا لیتی ہے۔ منزلیں آسان ہوتی جاتی ہیں۔ جذبوں کی صداقت آپ اپنے ہونے کی گواہی دینے لگتی ہے۔ شاید مجھے ابھی اس وقت کا انتظار کرنا ہوگا جب ہمارے جذبوں کی صداقت تمہارے دل پر دستک دینے لگے گی منھا۔'' اصحب حیدر نے ایک سرد آہ بھر کر اس کے خیالی پیکر کو مخاطب کیا تھا۔

☆......☆......☆

آج تیسرا روز تھا اصحب حیدر کو آفس سے غیر حاضر ہوئے۔ منھا اتباع علی کی بے چینیاں عروج پر تھیں۔ اس کے نہ آنے پر وہ پریشان سی تھی۔ مگر کسی سے پوچھنا بھی گوارا نہ تھا۔ جب وہ پاس تھا تو کبھی اسے دیکھا تک نہ تھا اور اب جبکہ اسے دور ہوئے تین روز ہی ہوئے تھے تو وہ اس کو دیکھنے کے لیے مچل رہی تھی۔ وہ اصحب حیدر کی آنکھوں میں جلتی محبت کی جوت کو اچھی طرح سمجھتی تھی لیکن جان بوجھ کر اسے اگنور کر دیتی تھی۔ کام کے دوران اسے بری طرح زچ کیے رکھتی تھی۔ اس سے بات کرتے ہوئے اپنے لہجے اور آنکھوں کو سرد رکھتی تھی۔ ساتھ ہی بغور اس کا جائزہ بھی لیتی رہتی جو اس کے اجنبی رویے پر افسردہ سا ہو جاتا تھا مگر زبان سے کبھی اظہار نہیں کیا تھا۔ منھا اتباع علی کی خواہش تھی کہ وہ اپنے جذبوں کو خود عیاں کرے۔ کوئی اقرار کا لمحہ سونپے لیکن وہ اسے نظر انداز کرنے لگا تھا۔ چند دنوں سے اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بدلنے لگا ہے۔ اصحب حیدر بھی اب اسے اجنبی طریقے سے پیش

آنے لگا تھا۔
یہی تو وہ نہیں چاہتی تھی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر آخر اس نے رضوان ظفر سے پوچھ ہی لیا کہ وہ کیوں نہیں آ رہا؟'' رضوان ظفر نے اسے بتایا کہ وہ تین روز سے بہت بیمار ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مزید چھٹیاں لے لے اور آفس نہ آئے۔
یہ سن کر وہ بے قراری ہو گئی۔ انٹر کام کر کے اس نے اکاؤنٹ سیکشن سے اصحب حیدر کے گھر کا ایڈریس لیا۔ اور خاموشی سے اس سے ملنے اور دیکھنے چلی دی۔ راستے میں اس نے خوبصورت سا پھولوں کا بکے بھی خرید لیا۔ آج خوشی اس کے انگ انگ سے چھلک رہی تھی۔ دل ایک الگ ہی انداز سے دھڑک کر اُسے پریشان کیے دے رہا تھا۔ اس کا خوبصورت چہرہ خوبصورت جذبوں کو محسوس کر کے دمک رہا تھا۔ ڈرائیور کو ایڈریس سمجھا کر وہ پچھلی سیٹ پر براجمان ہو گئی۔

☆......☆......☆

دروازے پر بیل ہوئی تو زہرہ خاتون نے چونک کر وقت دیکھا دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ اس وقت کون آ گیا۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی اپنے پلو سے پسینہ پونچھ کر اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ دروازے پر آئیں تو سامنے اک خوبصورت سی لڑکی کو کھڑا دیکھ کر ٹھٹھک گئیں۔
''جی فرمائیں!''
''السلام علیکم آنٹی...... کیا اصحب حیدر گھر پر ہیں؟'' اس نے نہایت ادب سے سلام کر کے سوال کیا تو زہرہ خاتون نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
''ہاں بیٹی...... آؤ اندر آ جاؤ......'' وہ ایک طرف ہوئی تو منہا اتباع علی دھیمی سی مسکان لیے گھر میں داخل ہو گئی۔ تین کمروں اور ایک کچن پر مشتمل یہ چھوٹا سا گھر تھا جس کی خستہ حالی سے ظاہر ہو رہا تھا اسے تعمیر ہوئے عرصہ گزر چکا ہے۔ زہرہ خاتون کی ہمراہی میں وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی۔
''اصحب حیدر کے کمرے کے سامنے آ رکی۔
یہ اس کا کمرہ ہے۔
''بیٹی...... آ جاؤ۔'' زہرہ خاتون بولتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔ اصحب حیدر نے ابھی کچھ کہنے کے لیے لب وا کیے ہی تھے کہ زہرہ خاتون کے ساتھ اندر آتی منہا اتباع علی کو دیکھ کر ساکت رہ گیا۔ بخار کی شدت کے باوجود وہ جلدی سے اٹھ بیٹھا۔
''اماں......! آپ منہا۔'' وہ اُلجھ سا گیا۔
منہا اتباع علی نے مسکراتے ہوئے پھولوں کا بکے اس کی طرف بڑھا دیا۔
''ہو گئے ناں آپ حیران...... اینی وے...... اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟''
''میں ٹھیک ہوں...... آیئے ناں بیٹھیے۔''
اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا تو وہ بیٹھ گئی۔
اصحب حیدر نے حیران حیران سی اماں کو دیکھا اور ہلکے سے مسکرا دیا۔
''اماں...... یہ میرے باس کی بیٹی ہیں منہا اور منہا یہ میری اماں جان ہیں۔ بہت اچھی اور بہت پیاری خیال رکھنے والی، آج جو کچھ بھی ہوں انہی کی دعاؤں اور محنت کی وجہ سے ہوں۔'' اس کے انداز میں عقیدت اور محبت چھلک رہی تھی۔
منہا نے اس کے خوبرو چہرے سے نظر ہٹا کر اس سادہ سی خاتون کو دیکھا تھا۔
جن کے سادہ مگر ممتا کا روپ لیے چہرے پر انوکھی سی کشش تھی۔ جانے کیوں اسے لگ رہا تھا کہ اس نے انہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے؟ کہاں

دیکھا ہے؟ اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ زہرہ خاتون نے منہا کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھا اور کولڈ ڈرنکس کے لیے کچن میں آ گئیں۔ اماں کے جانے کے بعد اصحب حیدر واپس اپنے بستر پر آ کے بیٹھ گیا اور اس کو دیکھنے لگا۔ وہ بے یقینی کی کیفیت سے نکل آیا تھا۔ منہا اتباع علی خود چل کر اس کو ملنے آئی تھی۔ بھلا اس سے بڑھ کر خوشی والی اور کیا بات ہو سکتی تھی۔ منہا اتباع علی نے اصحب حیدر کو دیکھا جس کی آنکھوں میں محبت اور یقین کی چمک نظر آ رہی تھی۔ اس کے خوبصورت گلابی ہونٹوں پر ایک بار پھر مسکراہٹ در آئی۔

''اصحب......!'' اس نے دھیرے سے پکارا تو اصحب سنبھل گیا۔

''جی......!'' اس کے مختصر سے ''جی'' کے جواب میں منہا کا دل چاہا تھا وہ سب کچھ بالائے طاق رکھ کر خود پر بیتنے والی واردات اسے لفظ لفظ کہہ سنائے۔ اپنی منتشر دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے وہ بمشکل گویا ہوئی۔

''بہت کمزور ہو گئے ہو...... کسی اچھے سے ڈاکٹر کو دکھا لیتے۔''

اصحب نے اسے گہری نظروں سے دیکھا تھا۔

''آپ آ گئی ہے ناں۔ میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔'' دل میں مچلتے جواب کو نظر انداز کر کے اس نے کہا تو صرف اتنا...... جی...... گیا تھا چیک اپ کے لیے...... بس موسمی اثرات ہیں۔

ڈاکٹر نے کہا ہے کہ تھوڑا آرام کرو گے بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ اسی دوران زہرہ خاتون کولڈ ڈرنک لیے آ گئیں۔

''یہ لو بیٹا......'' منہا نے شکریہ کہہ کر گلاس تھام لیا۔ زہرہ خاتون اِدھر ہی بیٹھ گئیں۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے منہا نے گھڑی کی جانب دیکھا جہاں تین بج رہے تھے۔

باتوں کے دوران وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ ماما اور بابا پریشان ہو رہے ہوں گے۔ یہ خیال آتے ہی وہ جانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اچھا اب مجھے اجازت دیں کافی دیر ہو گئی ہے۔

''بیٹھو بیٹا کھانا کھا کر جانا......'' زہرہ خاتون نے محبت سے کہا تو وہ مسکرا دی۔

''نہیں آنٹی...... مجھے کافی دیر ہو گئی ہے۔ ماما انتظار کر رہی ہوں گی۔''

''اچھا ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی...... جاؤ اصحب بیٹا...... منہا کو دروازے تک چھوڑ آؤ۔''

''جی......'' وہ دھیرے سے سر ہلاتا ہوا منہا کے پیچھے چلتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا تھا۔

تبھی منہا نے پلٹ کر اصحب کو دیکھا۔ اور ہولے سے اسے پکارا۔

''اصحب......''

''جی......!'' اس نے چونک کر اس کو دیکھا تھا جو کچھ کہنے نہ کہنے کی کیفیت میں گومگو کھڑی تھی۔

''وہ...... آپ...... آفس...... جلدی آ جائیں...... آپ کے بغیر کچھ اچھا نہیں لگتا۔'' منہا اتباع نے بمشکل کہا اور جلدی سے وہاں سے نکلتی چلی گئی جبکہ اصحب کو پہلے تو کچھ سمجھ میں نہ آیا جب اس نے منہا کے کہے لفظوں پر غور کیا تو اس پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ دل خوشی سے جھوم اٹھا تھا۔

☆......☆......☆

کلیوں والی سرخ و سفید کمبی نیشن لیے فراک پہنے...... اپنے سیاہ بالوں کو کھلا چھوڑے ہوئے وہ

جانے کو بالکل تیار کھڑی تھی۔ ہلکے ہلکے میک اپ نے اس کے سادہ سے حسن کو مزید جلا بخشی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر دلفریب سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ایک بے خودی اور سرشاری سی اس کے وجود پر طاری تھی۔ قد آدم آئینے میں اپنے دلکش سراپے پر اس نے نگاہ ڈالی اور جانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ آج اس کا ارادہ اصحب حیدر سے ملنے کا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے کمرے سے نکلتی۔ سامعہ ملک اس کے کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ اس کی تیاری کو دیکھ کر چونکی۔

''کہیں جارہی ہو؟''

''جی ماما...... اک دوست سے ملنے جارہی ہوں۔ اس نے آج شام چائے پر انوائٹ کیا ہے۔ ناں...... میں ابھی آپ کو بتانے آرہی تھی۔''

''اوہ...... لیکن آپ کو آج یہ پروگرام کینسل کرنا پڑے گا۔''

''لیکن کیوں ماما...... کوئی خاص بات ہے؟'' اس نے سوالیہ انداز میں آبرو اچکاتے ہوئے پوچھا تھا۔

''ہاں بیٹا...... آپ کے بابا کے دوست احتشام عیسیٰ اپنی مسز اور بیٹے کے ہمراہ چائے پر انوائیٹڈ ہیں۔ آپ کے بابا نے خاص طور پر تاکید کی تھی کہ آپ گھر پر ہی رہیں۔

''مما...... میرے ہونے یا نہ ہونے سے کیا ہوگا؟ پھر آپ سب ہیں ناں اُن کو کمپنی دینے کے لیے......''

''بیٹا بات کمپنی دینے کی نہیں ہے وہ خاص طور پر آپ سے ملنے کے لیے آرہے ہیں۔''

''مجھ سے ملنے کے لیے......'' اس کے چہرے پر حیرت در آئی۔

''ہاں آپ سے ملنے...... دراصل وہ آپ کو اپنی بہو بنانا چاہ رہے ہیں۔'' سامعہ ملک نے دھیمی سی مسکان لیے ہوئے کہا تھا۔

''واٹ؟'' اسے لگا تھا جیسے اس کے سپنوں کا تاج محل گر کر چکنا چور ہوگیا ہو...... آنکھوں میں حد درجہ حیرانگی سموئے وہ سامعہ ملک کو دیکھ رہی تھی۔

سامعہ ملک نے آگے بڑھ کر ہولے سے اس کے گال تھپتھپائے۔

''کم ان مائے چائلڈ، اپنی دوست سے فون پر معذرت کرلو۔'' وہ اپنی ساڑھی سنبھالتی ہوئی جاچکی تھیں۔ وہ بیڈ پر بیٹھی۔ تقدیر کی ہیر پھیر میں اُلجھ گئی۔ ابھی تو اس نے محبت کی جانب پہلا قدم بڑھایا تھا اور منزل اس سے دور ہوتی جارہی تھی۔ دل پریشان اور حواس گم ہونے لگے تھے۔

''ایسے کیسے ہوسکتا ہے؟'' میری زندگی ہے یہ فیصلہ میرے اختیار میں ہونا چاہیے۔

''ہاں میں بابا سے بات کروں گی۔ وہ دل ہی دل میں فیصلہ کر کے مطمئن ہوگئی۔ شام کو مہمانوں کو اٹینڈ کرتے ہوئے وہ بالکل سپاٹ اور سرد تاثرات لیے رہی۔ اس نے ایک نظر بھی ماموں عیسیٰ پر نہیں ڈالی تھی۔

☆......☆......☆

دوسری جانب زہرہ خاتون بیٹے کی آنکھوں میں جلتی جوت دیکھ کر دنگ رہ گئیں تھیں۔ تو کیا وقت خود کو پھر دہرانے جارہا ہے؟ اصحب حیدر اور منہا اتباع علی کے چہروں پر لکھی 'داستانِ محبت' ان کو ہولائے دے رہی تھی۔

''یا اللہ تو رحم فرما...... میرے بچے کو اپنی امان میں رکھ۔'' وہ جانتی تھیں یہ محبت کی آگ جس من میں لگ جائے۔ بجھائے نہیں بجھتی۔ اس منزل کے راہی اپنے نفع و نقصان کی پروا کیے بغیر انجانی

مسافتوں کو چھیڑ بیٹھتے ہیں جو انہیں جانے کہاں کہاں بھٹکائے رکھتی ہیں۔

''اے اللہ تو میرے بچے کو بھٹکنے سے بچالے۔'' ان کی نگاہوں میں ماضی کی فلم چل رہی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ آج ان کا بیٹا ایک امیرزادی کی محبت میں مبتلا ہو چکا تھا۔

☆......☆......☆

اصحب حیدر منہا اتباع علی کے روبرو بیٹھا ہوا تھا اس کے چہرے پر تفکر کے سائے لہرا رہے تھے۔ منہا نے اسے اپنے لیے آئے ہوئے پرپوزل سے آگاہ کیا تھا۔ جسے سنتے ہی وہ پریشان ہو اٹھا تھا۔ منہا کی نگاہیں اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

''اب کیا ہوگا منہا...... میں تو تمہارے بغیر جینے کا اب تصور بھی نہیں کرسکتا۔ جانتی ہو دن رات خدا سے صرف تمہیں پانے کی دعا کرتا ہوں۔ تمہیں پانے سے پہلے کھو دینے کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں منہا اتباع علی...... تمہیں حاصل کرنے کے لیے میں ہر رسم ورواج سے ٹکرا جاؤں گا۔ میں قسمت سے ہار نہیں مانوں گا۔

کیا محبت کے اس پُرخطر راہوں میں میرا سہارا بنوں گی؟ میرا ساتھ دو گی منہا؟ وہ آنکھوں میں یقین وامید کی قندیلیں روشن کیے بڑی آس سے پوچھ رہا تھا۔

اصحب حیدر کے چہرے پر الوہی جذبوں کی چمک تھی اس کا لہجہ چٹان سا مضبوط تھا۔

''کیا کرو گے تم اصحب حیدر، کیا مجھے بھگا کر لے جاؤ گے؟'' منہا نے اس کے سوال کو نظر انداز کر کے خود سوال کر دیا تھا جسے سن کر اُس کے وجیہہ چہرے پر سایہ سا لہرایا تھا لیکن دوسرے ہی پل وہ سنبھل گیا۔

''نہیں...... میں اپنی عزت خود داغ دار کیسے کرسکتا ہوں۔ میں تمہیں پوری عزت اور مان کے ساتھ تمہارے گھر سے رخصت کروا کر ہمیشہ کے لیے اپنے آنگن میں بسالوں گا۔'' اصحب حیدر کا تم سے وعدہ ہے منہا اتباع علی...... وہ ایسا کوئی کام نہیں کرے گا جس سے بعد میں تمہیں شرمندگی ہو۔ میں تمہارے والدین سے تمہیں مانگ لوں گا منہا...... ہمیشہ کے لیے، عزت کے ساتھ' اگر میرے والدین نے انکار کر دیا۔ میں تمہاری نہ ہوسکی تو پھر......تو پھر کیا کرو گے اصحب حیدر......''

''تو......تو سمجھ لینا منہا اتباع علی......تم اگر اس جہاں میں میری نہ ہوسکی تو اصحب حیدر کی زندگی کا وہ دن آخری دن ہوگا۔ اصحب حیدر تم سے جدا ہو کر مر جائے گا۔'' اصحب حیدر کے الفاظ نے اسے تڑپا کر رکھ دیا۔

''نہیں ...... تمہیں جینا ہے میرے لیے...... میری محبت کے لیے، میں تمہیں کبھی مایوس نہیں کروں گی۔ اگر تمہاری نہ بن سکی تو کسی اور کے ساتھ بھی نہیں جیوں گی، میری سانس سانس تمہارے لیے ہے۔ میری محبت صرف تمہارے لیے ہے۔ میری ذات تمہارے بغیر ادھوری ہے اصحب حیدر، میرا تم سے وعدہ ہے۔ ہر مشکل میں تمہارا ساتھ دوں گی۔'' منہا نے ایک عزم سے کہتے ہوئے اپنا نرم ونازک ہاتھ اس کے ہاتھوں پر رکھ دیا جسے اصحب نے مضبوطی سے تھام لیا۔

منہا اتباع علی اصحب سے مل کر اپنے کمرے میں پہنچی ہی تھی کہ ملازمہ ملک اتباع علی کا پیغام لے کر چلی آئی۔

''چھوٹی بی بی...... آپ کو صاحب اسٹڈی روم میں بلا رہے ہیں۔'' وہ جو فریش ہو کر سونے کا ارادہ کر رہی تھی چونک گئی۔

''اچھا...... تم چلو میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔''

''جی بی بی جی......'' ملازمہ کے جانے کے کچھ دیر بعد وہ اسٹڈی روم میں موجود تھی۔

''السلام علیکم بابا جان......'' ملک اتباع علی کو سلام کرتے ہوئے وہ ان کے سامنے نیچے بچھے قالین پر بیٹھ گئی۔

''وعلیکم اسلام!'' انہوں نے ہاتھ میں پکڑی کتاب سائیڈ پر رکھ دی۔

''بابا آپ نے بلایا تھا۔''

''جی میں نے بلایا تھا، آپ سے ضروری بات کرنی تھی۔'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

''کہیے بابا جان......'' وہ ہمہ تن گوش ہوئی۔

''سامعہ بتا رہی تھی کہ تم نے مامون عیسیٰ والے پرپوزل کو ریجیکٹ کر دیا ہے، وجہ جان سکتا ہوں......؟''

''بابا...... وہ......'' وہ بے چینی سے نظریں جھکائے انگلیاں چٹخانے لگی۔ وہ بغور اس کو دیکھ رہے تھے۔

''کہو بیٹا...... رُک کیوں گئیں؟''

''بابا دراصل

دراصل بس وہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔'' وہ ایکدم کہہ گئی۔ تو ملک اتباع علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''تو پھر کون اچھا لگتا ہے؟'' وہ شریر ہوئے تھے جبکہ منہا شرم سے گلابی ہوگئی۔

''بتاؤ ناں...... کون ہے؟'' انہوں نے دلچسپی سے اپنی بیٹی کے گلابی چہرے کو دیکھا۔ سامعہ ملک نے انہیں کہا تھا کہ وہ سختی سے باز پرس کریں مگر وہ اسے بہت چاہتے تھے یہی وجہ تھی کہ وہ اس سے سختی سے بات کر ہی نہیں پاتے تھے۔

منہا انہیں بہت عزیز تھی۔ انہوں نے آفس میں کئی بار نوٹ کیا تھا کہ وہ اور اصحب حیدر ایک دوسرے میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ لنچ بریک میں بھی ایک دوسرے کے ہمراہ ہوتے ہیں مگر وہ آفس ورک سمجھ کر نظر انداز کر گئے تھے۔ اصحب حیدر کی بیماری کی وجہ سے منہا کا بے چین ہونا اور گھر تک چلے جانا اور پھر اب اس پرپوزل کو ریجیکٹ کرنا...... کچھ تو تھا۔ یہی تو ملک اتباع علی جاننا چاہتے تھے۔

''پہلے آپ وعدہ کریں ناراض نہیں ہوں گے......''

''ٹھیک ہے بھئی وعدہ، میں بالکل بھی خفا نہیں ہوں گا۔ پکا وعدہ......''

''بابا جان...... وہ اصحب حیدر اور میں...... ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ بابا...... ناراض نہ ہونا پلیز وہ بہت اچھا ہے۔ آپ سے بات کرنے کے لیے اپنی والدہ کو لے کر آنا چاہتا ہے۔''

منہا کی گفتگو کے دوران ملک اتباع علی بالکل سرد اور سپاٹ تاثرات لیے بیٹھے رہے۔ جب وہ بول چکی تو صرف اتنا کہا۔

''تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ اس پر پھر بات کریں گے۔'' وہ سرد لہجے میں کہتے ہوئے خود بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ منہا اتباع ان کا سرد رویہ محسوس کر چکی تھی وہ سر جھکائے اور دل میں ڈھیروں خدشے لیے کمرے میں واپس آ گئی۔ ملک اتباع علی نے تصدیق کر لی تھی۔ اب آگے انہوں نے کیا کرنا تھا یہ وہ اچھی طرح جانتے تھے۔

☆......☆......☆

انہوں نے بالا ہی بالا اصحب حیدر کے متعلق معلومات اکٹھی کی تھیں۔ یہ معلومات اُن کے لیے کسی شاک سے کم نہیں تھیں جن کی تلاش میں وہ

ایک عرصے سے خوار ہو رہے تھے۔ وہ تو ان کی نظروں کے سامنے تھے۔ وہ عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گئے۔

انہوں نے اصحب حیدر کو اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ ان کے سامنے نظریں جھکائے بیٹھا تھا۔

''جی سر...... کوئی خاص کام تھا؟''

''ہاں بہت خاص......'' انہوں نے اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔

منھا سے کتنی محبت کرتے ہو؟'' ملک اتباع علی کے سوال پر وہ ٹھٹکا تھا۔

اسے منھا نے بتایا تو تھا کہ وہ اپنے بابا سے بات کر چکی ہے لیکن اصحب کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ یوں اس سے بغیر تمہید باندھے صاف صاف لفظوں میں پوچھ لیں گے وہ خاموش رہنا چاہتا تھا لیکن اپنے دل کی آواز اور منھا کی محبت کا تقاضا تھا کہ وہ بولے اور سچ بولے۔

اصحب حیدر نے ملک اتباع علی کو دیکھا جن کے تاثرات بالکل برفیلے تھے۔ کوئی لکیر تک نہ تھی جس سے وہ اندازہ لگایا تا کہ وہ خفا ہے یا...... واقعی جاننا چاہتے ہیں کہ وہ منھا اتباع علی سے کتنی محبت کرتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو کیا وہ انہیں یقین دلا پائے گا؟''

بہر حال جو بھی تھا وہ ان کا سامنا کرنے کے لیے بالکل تیار نہ تھا وہ سچ کہے گا چاہے کچھ بھی ہو وہ فیصلہ کر کے مطمئن ہو گیا۔ بولو اصحب ہابیل حیدر...... چپ کیوں ہو گئے......؟ ان کا انداز استہزائیہ تھا۔ سر میں نے منھا ر اتباع سے محبت کی ہے اس میں کوئی شک نہیں......

منھا سے محبت کی ہے یا اس کی دولت سے...... وہ ان کا لہجہ بدستور طنزیہ تھا۔

ایکسیوزمی سر مجھے دولت کی ہوس نہیں رہی منھا سے محبت کی بات...... میں تو اس وقت سے اس سے محبت کرتا ہوں جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا وہ بھی چند لمحے، وہ ایک چھوٹا سا حادثہ تھا جو مجھے اس سے جوڑ گیا۔ اس نے مختصر سے لفظوں میں اپنی منھا سے ہونے والی ملاقات کا احوال سنایا۔

سر میں محبت اور رشتوں کو دولت کے ترازو میں نہیں تولتا میں تو منھا کے نام سے واقف تک نہ تھا مجھے پھر اس کے دولت مند ہونے سے اپنی اوقات بھی یاد آ گئی تھی لیکن یہ محبت کہاں دیکھتی ہے امیری غریبی مجھے اس کی دولت سے نہیں حقیقتاً منھا اتباع علی سے محبت ہے اس کے لیے میں ہر شے سے ٹکرانے کا حوصلہ بھی رکھتا ہوں مگر میں نہیں چاہتا کہ میں اپنی محبت کو رسوا کروں میں اپنی والدہ کو آپ کے پاس لے کر آنا چاہتا تھا تاکہ اسے عزت سے رخصت کروا کر لے جاؤں مگر اس سے پہلے آپ کا بلاوا آ گیا۔ اصحب حیدر نے ملک اتباع علی کو دیکھا جن کے چہرے سے بے چینی ہویدا تھی۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر انہوں نے اس سے مخاطب ہو کر کہا کہ کل اپنی والدہ کو لے کر آ جانا...... اس بات کا فیصلہ ہی ہو جائے تو اچھا ہے۔ اصحب نے انہیں یوں دیکھا جیسے یقین نہ آیا ہو میں نے کہا ناں کل والدہ کو لے کر آ جانا...... میں جو بھی فیصلہ کروں گا سب کے سامنے کروں گا اور ہاں تمہیں وہ فیصلہ ماننا پڑے گا۔''

ٹھیک ہے سر میں کل ضرور آؤں گا...... وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ چلتا ہوں۔ وہ کمرے سے نکل گیا تو ملک اتباع نے اپنا سر کرسی سے لگا کر اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

انہوں نے اصحب حیدر کی باتوں کی سچائی کو پرکھا تو انہیں محسوس ہوا کہ وہ اس کے سامنے ہار چکے ہیں۔ وہ اس کی باتوں پر اعتماد کر چکے ہیں انہوں نے اک دنیا دیکھ رکھی تھی۔ طرح طرح کے لوگوں سے ملنا ملانا ہوتا رہتا تھا انہیں لوگوں کی پہچان ہو چکی تھی۔ اصحب حیدر کو تو وہ اول روز سے با اعتبار لوگوں کی فہرست میں شامل کر چکے تھے لیکن وہ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے ان باتوں کی تصدیق بھی کرنا چاہتے تھے جو انہیں معلوم ہوئی تھیں۔ اسی لیے تو انہوں نے اس کی والدہ کو سامنے لانے کے لیے اس سے کل آنے کا کہہ دیا تھا۔ وہ ماضی کے دھندلکوں میں اک بار پھر سے کھونے لگے تھے وہ جس کی کھوج میں تھے کاش کہ وہی ہو کاش......!!

میرے اللہ اب تو بچھڑوں کو ملا دے ان کی آنکھوں میں نمکین پانی جمع ہونے لگا تھا۔

☆......☆......☆

اصحب حیدر نے زہرہ خاتون کو منہا اتباع علی کے گھر جانے کے لیے راضی کر لیا تھا ویسے بھی وہ اپنے بیٹے کی خواہش کو کیسے پورا نہ کرتیں۔

ایک ہی تو بیٹا تھا جس نے زندگی کی دھوپ چھاؤں میں ہر لمحہ ان کا ساتھ دیا تھا انہیں اک لمحے کے لیے بھی تنہا ہونے کا احساس نہ دلایا تھا وہ اس کی پسند کو اپنی پسند بنا چکی تھیں مگر دل جانے کیوں بے قرار سا تھا۔ وہ اونچے خاندان کی لڑکی کیسے ایڈجسٹ کر پائے گی ان کے چھوٹے سے گھر میں ...... وہ اپنے دل میں ہزار وسوسوں اور خدشوں کو جگہ دیے ''اصحب حیدر'' کے ہمراہ جانے کو تیار کھڑی تھی خدا تعالیٰ سے دعا گو تھیں کہ وہ ان کے بیٹے کی دلی مراد پوری کر دے۔

☆......☆......☆

ملازمہ کے ہمراہ اصحب حیدر اور زہرہ خاتون نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھے تھے جہاں ان کے استقبال کے لیے بیٹھے ملک اتباع علی اور سامعہ ملک ان کا انتظار کر رہے تھے۔ زہرہ خاتون نے آگے بڑھی تو ملک اتباع علی اور سامعہ ملک انہیں دیکھ کر ساکت کھڑے رہ گئے اور خود زہرہ خاتون کی حالت 'کاٹو تو بدن میں لہو نہیں' جیسی ملک اتباع علی کے ہونٹوں نے جنبش کی تھی......زہرہ......

سامعہ ملک حیرت کی مورت بنی کھڑی تھی...... زہرہ خاتون کی آنکھیں بھیگتی چلی گئیں اصحب حیدر دم بخود کبھی ملک اتباع علی کو دیکھتا تو کبھی اپنی والدہ کو......وہ الجھ سا گیا۔''

☆......☆......☆

زہرہ خاتون کی کہانی عام سی کہانی تھی زہرہ خاتون نے ایسے خاندان میں آنکھ کھولی جو ایک امیر و کبیر کے گھر ملازم تھے اسی کے دیے ہوئے سرونٹ کوارٹر میں رہتے تھے زہرہ خاتون، رحمت اور بشیراں بی بی کی اکلوتی اولاد تھی جبکہ رئیس آغا احمد اپنے دونوں بیٹوں کے ہمراہ اس شاندار حویلی میں رہتے تھے ان کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا بڑا بیٹا ملک اتباع اپنے والد کے ساتھ بزنس سنبھال رہا تھا جبکہ ان کا چھوٹا بیٹا ہابیل بہت لاابالی اور نٹ کھٹ سا نوجوان تھا جو زہرہ خاتون کے ساتھ کھیل کر جوان ہوا تھا آغا احمد علی حاکمانہ اور سخت گیر طبیعت کے مالک تھے انہیں ملازموں کے ساتھ فری ہونا بالکل پسند نہیں تھا مگر وہ زہرہ خاتون کے معاملے میں ہابیل کی ضد کے آگے ہار جاتے اور انہیں اس کے ساتھ کھیلنے کی اجازت دینی پڑتی۔

جب دونوں نے لڑکپن سے نکل کر جوانی میں قدم رکھا تو آغا احمد کو محتاط ہونا پڑا۔ انہوں نے

ہابیل کو انگلینڈ بھجوانے کا انتظام کرلیا۔ یوں چند دنوں بعد وہ زہرہ خاتون سے دور چلا گیا زہرہ جیسے بجھ کر رہ گئیں۔ انہیں خبر ہی نہ ہوئی کہ وہ کب ہابیل کی محبت میں پور پور ڈوب چکی تھی۔ ادھر ہابیل کی حالت بھی کچھ مختلف نہ تھی مگر وہ بابا کی سخت گیر طبیعت سے بھی واقف تھا۔

اس لیے اس نے دل پر پتھر رکھ کر یہ دوری برداشت کرلی اور تعلیم حاصل کرنے لگا۔

چہکتی مہکتی زہرہ خاتون نے خاموشیوں کی ردا اوڑھ لی...... پانچ سال کب گزر گئے پتہ ہی نہ چلا...... ان پانچ سالوں میں بہت کچھ بدل چکا تھ ......زہرہ کی والدہ کا انتقال ہوگیا تھا۔ وہ روتی رہی مگر جانے والے لوٹ کر کب آتے ہیں۔ گزرتے وقت نے ان کے زخموں پر مرہم رکھ دیا۔ ہابیل کے بڑے بھائی کی شادی آغا احمد علی کی بہن کی بیٹی 'سامعہ' سے طے پا چکی تھی انہی دنوں اس دشمن جاں نے بھی لوٹ کر آنا تھا جب وہ آیا تو زہرہ اور ہابیل دونوں ہی مجسم حیرت بنے رہ گئے زہرہ کی خوبصورتی اور دلکشی پہلے سے بھی بڑھ گئی تھی۔ جبکہ وجیہہ اور جوبرو ہابیل بھی اپنے لاابالی پن سے نکل کر مردانہ وجاہت کا شاہکار بن چکا تھا۔

موقع ملتے ہی انہوں نے زہرہ کے سامنے اپنے دل کا حال کھول کر بیان کردیا جہاں ان پانچ سالوں کی جدائی کی داستاں رقم تھی۔

زہرہ کو جلتی دھوپ میں سائباں میسر آگیا۔ ہابیل اور زہرہ خاتون ایک دوجے کا ہاتھ تھامے محبت کی وادیوں میں کھو گئے ہوش تو تب آیا جب زہرہ خاتون کے والد نے اس کا رشتہ اپنے دور پار کے رشتے داروں میں طے کردیا۔ وہ ہکا بکا سی رہ گئی اس نے ہابیل کو بتایا تو وہ بے چین سا ہوگیا ۔اس نے آغا رئیس احمد کے سامنے اپنے دل کا مدعا رکھا تو وہ پھر بھڑک اٹھے۔

'ہرگز نہیں ہابیل......ایک ملازم کی بیٹی ملکوں کی بہو نہیں بن سکتی۔ ہم دنیا والوں سے کیا کہیں گے؟ یہ ممکن نہیں، ہابیل، بھول جاؤ۔'' وہ چنگھاڑے۔

''نہیں بابا...... میں نہیں بھول سکتا۔ میں زہرہ سے شادی کا وعدہ کرچکا ہوں اور ہر حال میں نبھاؤں گا۔'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا تھا۔

''تو ٹھیک ہے ہم بھی بھول جائیں گے کہ ہمارا تم سے کیا رشتہ ہے؟ اگر تم نے زہرہ خاتون سے شادی کی تو ہم تمہیں اپنی جائیداد سے عاق کرکے اس گھر کے دروازے تمہارے لیے ہمیشہ بند کردیں گے۔ ہم تم سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے۔ آغا احمد فیصلہ سنا کر جا چکے تھے۔ ملک اتباع علی نے بھائی کو سمجھایا تو ہابیل بھی ضد پر اتر آئے۔

''ٹھیک ہے اگر بابا کو اپنی اَنا بیٹے کی خوشیوں سے زیادہ عزیز ہے تو پھر میری رگوں میں بھی انہی کا خون دوڑ رہا ہے میں بھی اپنی ضد سے باز نہیں آؤں گا۔''

وہ اپنے بابا کے فیصلے کے خلاف ڈٹ گیا تھا۔ اِدھر بھی انکار ہی کی رٹ رہی۔ آغا احمد نے رحمت کو نوکری سے نکال دیا۔ وہ اپنا مختصر سا سامان باندھ کر سڑک پر آگئے۔ جب ہابیل کو پتا چلا تو وہ بھی غصے سے گھر چھوڑ کر ان کے ہمراہ چلا آیا۔

زہرہ کے باپ نے بہت منت سماجت کی کہ وہ چلا جائے۔ مگر وہ بھی اپنی ضد کا پکا نکلا۔ زہرہ سے شادی کی۔

سخت سے سخت حالات کا مقابلہ کیا۔ وہ رحمت کے آبائی گاؤں آگئے تھے جہاں اس کا اپنا ذاتی گھر تھا۔ رحمت کی وفات تک اسی گاؤں میں رہے جب زہرہ کے والد کا انتقال ہوگیا تو انہوں نے یہ گھر بیچا اور شہر میں چھوٹا سا گھر خرید لیا۔ ہابیل معمولی سی

نوکری کرنے لگا۔ جن کی آمدنی سے وہ بمشکل گزارا کرتے۔ اگر وہ حوصلہ ہار جاتا تو زہرہ کی بے لوث محبت کھودیتا۔ یہ زہرہ ہی کی محبت کا اعجاز تھا کہ وہ کسی بھی مرحلے پر ڈگمگایا نہیں تھا۔

اصحب کی پیدائش ان کی خوشیاں بڑھا گئی۔

''اصحب کو پاکر دونوں میاں بیوی بہت خوش تھے۔ اس کے مستقبل کے تانے بانے بنتے۔ اُس کی معصوم اداؤں پہ واری واری جاتے، انہیں پتا ہی نہ چلا وقت تیزی سے گزرا۔ اصحب میٹرک کے امتحان دے کر فارغ ہی ہوا تھا کہ ہابیل ایک ٹریفک حادثے میں جان گنوا بیٹھے۔ زہرہ خاتون کی زندگی میں اندھیرے چھا گئے۔ زندگی پہلے کبھی مشکل نہ لگی تھی۔ جتنی اب لگ رہی تھی۔ لیکن انہیں خود کو مضبوط بنانا تھا اپنے اصحب حیدر کے لیے سو وہ نڈر ہوگئیں۔

لوگوں کے کپڑے سی سی گزارہ کرنے لگیں۔ انہوں نے اصحب حیدر کو بھی نہیں بتایا کہ وہ ایک رئیس خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ اس کے والد کوئی معمولی انسان نہیں تھے۔ رئیس آغا احمد علی کے جگر کا ٹکڑا تھے۔ لیکن انہوں نے کبھی اپنے خون کی خبر نہ لی تھی۔ ہابیل نے بھی اپنی زندگی میں کبھی ان کا تذکرہ نہ کیا۔ زہرہ خاتون نے بھی ماضی میں جھانکنا چھوڑ دیا تھا۔

☆......☆......☆

ملک اتباع علی اپنے چھوٹے بھائی کی وفات اور حالات جان کر بہت روئے یوں لگ رہا تھا کہ ہابیل کی موت آج واقع ہوئی ہے۔ سامعہ ملک زہرہ کو ساتھ لگائے آنسو پونچھ رہی تھیں۔

''اصحب حیدر اور منہا اتباع علی'' بھی بھیگی آنکھوں کے ساتھ اپنے بچھڑوں کو دیکھ رہے تھے۔ جب آنسوؤں کا طوفان تھما تو ملک اتباع علی نے زہرہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''زہرہ بہن...... یہ نہ سمجھو کہ ہم نے تم لوگوں کو نہیں ڈھونڈا۔ بابا جان کے انتقال کے بعد میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ ہابیل کو ڈھونڈوں۔ وہ مل جائے لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ان دونوں بچوں نے ہمیں ملانا تھا۔ میری گزارش سمجھو یا پھر بڑے بھائی کا حکم...... واپس لوٹ آؤ...... یہ گھر...... صرف میرا اور میرے بچوں کا نہیں بلکہ یہ گھر اصحب کا اور تمہارا بھی ہے۔

''دیکھو مجھے مایوس مت کرنا۔ اپنے بھائی کو تو کھو چکا ہوں۔ اب تم لوگ ہی میرا سب کچھ ہو۔ وہ بڑے مان سے کہہ رہے تھے۔

☆......☆......☆

سب کچھ بہت جلدی ہوتا گیا۔ زہرہ خاتون اور اصحب ملک لاج میں واپس آ گئے۔ منہا اتباع علی اور اصحب کی شادی کا دن مقرر کر دیا گیا تھا۔

''ملک لاج کی خوشیاں اور رونقیں لوٹ آئیں تھیں۔ منہا اتباع علی اور اصحب کے جذبوں میں کوئی کھوٹ نہ تھا اس لیے راستے خود بخود آسان ہوتے گئے۔ انہوں نے اپنی منزل پالی تھی۔ ان کے چہرے سچی محبت اور خوشیوں سے چمک رہے تھے۔ آج دونوں کا نکاح تھا۔ نکاح ہوا تو ہر طرف سے مبارک سلامت کا شور بلند ہوگیا۔ اصحب نے مسکراتے ہوئے دلہن بنی منہا اتباع علی کا ہاتھ تھام لیا۔

''جانِ اصحب...... اپنوں کا ملن اور زندگی کا نیا سفر بہت مبارک ہو۔'' اس نے شرارت سے اس کی طرف جھک کر سرگوشی کی تو منہا نے دھیرے سے ''خیر مبارک'' کہہ کر سر جھکا لیا۔

اس کا دل آنے والے دنوں کا سوچ کر دھڑکا جا رہا تھا۔ منہا کو یقین تھا کہ آنے والا وقت بہت خوبصورت اور اپنے دامن میں ڈھیروں خوشیاں سمیٹ کر لائے گا۔ انشاءاللہ۔

☆☆......☆☆

افسانہ

دردانہ نوشین خان

سُنہری اوراق کی ناؤ

"آپ بے شک اچھے افسانہ نگار اور شاعر ہیں۔ میں نے بھی آپ کی غزلیں ایک آدھ بار پڑھی ہیں۔ مگر ڈرامہ رائٹنگ کی اپنی ڈیمانڈ ہیں۔ مگر ہم آپ کو گنوانا نہیں چاہتے کیونکہ آپ اچھا مکالمہ لکھ سکتے ہیں۔ آپ ایسا کریں ہمیں آج کل اس ٹاپک پر......

میثم راجہ کے پہلے افسانوی مجموعہ نے دنیائے ادب میں دھوم مچادی۔ شاعری کے بعد نثر نگاری میں بھی میثم راجہ کا ڈنکا بجنے لگا تھا۔ لکھنے کی یہ صلاحیت اکتسابی سے زیادہ خداداد تھی۔ تخیل و تخلیق کی باطنی تہذیب رکھتا تھا۔ دس سال پہلے جب یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ یونیورسٹی میگزین کا سب ایڈیٹر تھا، اپنے ذوق، اشتیاق وادبی اہتمام کے سبب اُسے منتخب کیا گیا تھا۔ وہ اُن دنوں مقامی اخبارات میں بھی لکھتا تھا۔ تب زبیر علی کا نام بھی اُس کے ساتھ ساتھ آتا تھا۔ زبیر علی سوشل سائنس ڈپارٹمنٹ کا طالب علم تھا جبکہ میثم راجہ اُردو کا تھا۔ تاہم دونوں اچھا لکھ رہے تھے۔ میگزین کے حوالے سے تعارف ہوا جو بعد میں دوستی میں بدل گیا۔

دونوں کا معاشی پس منظر حسرت زدہ تھا۔ کینٹین کی میز پر ایک ہی پلیٹ سے دہی بھلے کھاتے ہوئے زبیر علی کہتا۔

"پیارا سا گھر ہو...... چھوٹی سی گاڑی ہو...... کیوٹ سی بیوی ہو...... اور دو بچے۔" مگر میثم راجہ کے سپنوں میں بڑے ادباء شعراء کے ناموں کے ستارے چمکتے، وہ خود کو اس مقام پر دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ سمجھتا کہ تاباں ناموں کے ساتھ روزی جیسے مسائل کیونکر ہو سکتے ہیں۔ یہ چھوٹی باتیں چھوٹے لوگوں کی ہیں۔ اُس کے اس افلاطونی نکتہ نظر پر زبیر علی ہنستے ہوئے بولا۔

"جب میں نرسری پریپ میں ہوتا تھا۔ تو سوچتا تھا ٹیچر کبھی جمائی نہیں لیتی...... جمائیاں تو بچوں کو آتی ہیں۔" اس پر دونوں خوب ہنسے زبیر علی نے ہنس چکنے کے بعد کہا۔

"تو اب بھی یہی سوچتا ہے بڑے نام والے بڑے لوگ پیٹ نہیں رکھتے۔ جمائی، کھجلائی نہیں کرتے۔"

"وہ جمائی، کھجلائی کرتے ہیں۔ منہ پیٹ بھی رکھتے ہیں مگر ان کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیتے۔" میثم راجہ کا فلسفہ ہمیشہ زبیر علی کو مرعوب کردیتا۔ اُس دور کی باتیں کبھی کبھی یاد آجاتی تو دونوں ایک دوسرے کے بارے میں سوچتے وہ کہاں ہوگا کیا کررہا ہوگا۔

میثم راجہ ایم اے اُردو گولڈ میڈلسٹ کو SESE (مڈل اسکول ٹیچر) کی جاب نصیب ہوئی

تھی۔ وہ اپنے لکھنے کی دنیا میں ایسا اُلجھا کہ ایم فل نہ کرسکا۔ دو بچے، بیوی اور ماں کے ساتھ کمتر متوسط زندگی گزار رہا تھا۔

مگر اپنی بڑھتی ہوئی ادبی شہرت میں مگن رہتا۔ روکھی سوکھی کھاتا تازہ پانی پیتا، بجلی کا صرف ایک پنکھا چلاتا۔ بیوی کی شیمپو کنڈیشنر جیسی ضروریات کو فضول خرچی سمجھتا۔ بچوں کے کھلونوں کو بیہودی سازشیں قرار دے کر بچوں کو ان کے قریب پھٹکنے نہ دیتا۔ اس کے ہاں سرما کی مہمان داری پھیکی چائے اور بیکری کے کھلے بسکٹ تھے۔ گرمیوں میں چینی کے شیرے میں دو چمچ لال شربت گھول کر جگ بھر دیا جاتا۔ نیند کے لیے بہترین دن عید کا دن تھا۔ بچوں کی حسرتوں پر اُس نے جگر پتھر کر لیا تھا۔ آنکھیں پتھر کر لی تھیں مگر تنہائی میں اِن پتھروں سے پانی ٹپکتا تو روح فرسا تحریریں جنم لیتیں۔ پھر اُن کا نام چھپتا...... چھپے ہوئے نام کو دیکھنا ہی کل انعام تھا۔

اُس کے چھپے ہوئے نام کی شہرت زبیر علی تک جا پہنچی۔ اخبار میں میثم راجہ کا ''غیر متوازن معاشرے کا نوحہ'' آرٹیکل چھپا تھا۔ ایسا جاندار تھا کہ زبیر علی پڑھ کر تڑپ اٹھا۔ معاشرے پر تڑپنے کا مشترکہ مرض تو دونوں کا تھا۔ کہیں نہ کہیں سے میثم کا فون نمبر حاصل کر لیا۔ پُر جوش مکالموں کا تبادلہ ہوا۔

''یار...... میں تو تمہارا مضمون پڑھ کر حیران رہ گیا۔ تم اتنا زبردست لکھنے لگے ہو۔ دلی مبارکباد ...... کتنے ایوارڈ پالیے؟'' اور پھر گھریلو احوال...... احوال پرت در پرت کھلتے چلے گئے۔ زبیر علی کسی پرائیویٹ ادارے میں جاب کر رہا تھا۔ سننے میں اُس کی تنخواہ اور مراعات بھی زیادہ نہ لگیں۔ بچے اس کے بھی دو تھے مگر اسکولوں کے نام خاصے مہنگے تھے۔ پھر اس نے اپنی گاڑی کا بھی ذکر کیا۔ میثم راجہ نے

سوچا۔ کوئی ابا، دادا کی وراثت کا مال ملا ہوگا۔ بات چیت سے پرانی دوستی ہری ہوگئی ملنے ملانے کے وعدے ہوگئے۔ پھر یہ بات بھول بھال گئی۔ زندگی کا بیل اپنے کولہو کے گرد طے شدہ رفتار سے گھومتا رہا۔

میثم راجہ کے بچے PEF کے اسکول میں پڑھتے۔ کتابیں مفت، دودھ بھی مل جاتا۔ وردی کی شرط نہ تھی۔ مگراس کے ساتھ حقیقی تدریس برائے نام تھی۔ حقیقی تدریس یعنی بورڈ کی پوزیشنز والی پڑھائی تو مہنگی اکیڈمیز میں ہوتی تھی۔ ساری گدڑیوں میں لعل نہیں ہوتے۔ میثم کے بچے درمیانہ درجہ کے طالب علم تھے مگر اُن کی پہچان اُن کا باپ تھا۔ جہاں جاتے تعارف آسان ہوجاتا۔ میثم کو اُس کے شہر میں کون نہیں جانتا تھا۔ ادبی علمی تقاریب میں تو ہمیشہ اسٹیج پر بٹھایا جاتا۔ صدارت کرائی جاتی شہرت ایک نشہ ہے نشہ چھوٹا ہو یا بڑا کافر ہوتا ہے۔

میٹرک کے سالانہ امتحان شروع ہوئے۔ چار اضافی پیسوں کی کمائی کی خاطر میثم راجہ نے کہہ سُن کر ڈیوٹی لکھوالی۔ مگر یہ ڈیوٹی اُس شہر میں تھی جہاں زبیر علی رہتا تھا۔

اس سے ملاقات کو دل مچلنا فطری بات تھی۔ اگرچہ میثم کی رہائش اسکول میں تھی۔ اُس نے فون ملایا۔

''میں تمہارے شہر میں سانس لے رہا ہوں۔''

''کیا مطلب یار؟ مجھ سے آسان لفظوں میں بات کیا کر میں کوڑھ مغز ہوں۔''

''کوڑھ مغز...... تیرے شہر میں سیکنڈری اسکول اگزام میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کی ڈیوٹی ہے میری...... آج تیسرا دن ہے۔''

''تین دن سے اِدھر ہو...... رہ کہاں رہے ہو...... ایڈریس بتاؤ ابھی آتا ہوں۔'' زبیر علی نے گاڑی نکالی اور تیس منٹ میں گورنمنٹ سیکنڈری اسکول کے گیٹ پر پہنچ گیا جہاں میثم راجہ اُس کا انتظار کررہا تھا۔

برانڈڈ ڈریس شرٹ، جمے ہوئے کالز کریز لگی پینٹ، قرینہ سے رکھی ہلکی داڑھی جس میں کہیں کہیں سفید بال' آنکھوں پر سُنہری فریم کا چشمہ' یہ زبیر علی تھا۔ دس گیارہ سال پہلے والے زبیر سے بہت مختلف Refinedاور Improved......

اِدھر دُبلا پتلا لمبا میثم راجہ آسمانی رنگ کے واش اینڈ ویئر شلوار قمیض میں ملبوس آستینوں کو اوپر کی طرف اُڑسے ہاتھ میں چھوٹا کالا پرانا موبائل لیے آگے بڑھا۔ دونوں کے حلیے زبان حال سے بولتے تھے۔ زبیر علی کو اتنا ترقی یافتہ دیکھ کر میثم پر جو حیرتوں کے پہاڑ گرے وہ گاڑی میں بیٹھ کر مسلسل گرتے ہی رہے۔ ڈرائیونگ کے دوران زبیر علی اپنے فون پر متوجہ ہوا اُس کا دو ہاتھ چوڑا موبائل میثم راجہ کو اُس کی ''بالائی آمدنی'' کا پکا یقین دلانے لگا۔

گاڑی رُکی ڈبل اسٹوری گھر، چمکتے گیٹ کے ساتھ گملوں پھلواری کی آؤٹ لک، ٹھنڈے ٹھار ڈرائینگ روم کی سجاوٹ، خاطر تواضع کے سامان سے لدی ہوئی ٹرالی۔ واہ زبیر واہ...... تیری تو قسمت بدل گئی۔ ہاں مگر میز پر رکھے اخبار کے ادبی ایڈیشن میں میثم راجہ کی نثرنگاری پر مشہور تبصرہ نگار کا تحسین بھرا مضمون چھپا تھا۔ میثم راجہ کی تصویر لگی تھی۔ جسے دکھا کر زبیر علی کہہ رہا تھا۔

''یار...... تیری کیا بات ہے۔ میں تو فخر سے اپنے بچوں کو بتاتا ہوں یہ میرا یار ہے بچے ابھی آتے ہوں گے۔''

اسٹرابری کے تازہ جوس کا گلاس بڑھاتے ہوئے زبیر علی مسکرایا۔ مزید کہا۔

''ہم آج بھی لنگوٹیا یار ہیں...... میرے بچے تیرے ساتھ تصویر بنوانے کو بے چین ہیں۔ اپنے موبائل لیے آنے والے ہیں۔ اب آٹوگراف والا دور تو چلا گیا۔ فیس

بک واٹس اپ پر تصویریں لگائی جاتی ہیں۔
میثم راجہ کے بچوں کے پاس موبائل تو کُجا آٹو گراف کی بکس بھی نہ تھیں۔ وہ آٹو گراف سے بھی پیچھے کے دور میں جی رہا تھا۔ دو کمروں کا گھر، بیٹھک میں گھسی کپڑے کے غلاف والی کرسیاں اور قناعت کا بول بالا...... عدم سیرابی سے خواہشوں کے سارے پیڑ پودے جل چکے تھے۔
ابھی اندر کی کشمکش سوال بن کر لبوں پر آئی نہ تھی کہ جواب ازخود سامنے آ گیا۔ زبیر علی کہہ رہا تھا۔
"تم نے پچھلے دنوں مشہور چینل پر چلنے والا ڈرامہ 'آپے رانجھا ہوئی' دیکھا ہوگا ابھی Last Monday کو ختم ہوا ہے۔ وہ میں نے لکھا تھا۔ ہماری یہ بدقسمتی ہے کہ ہم تو پانی پر لکھے نام ہیں۔ تم تاریخ کے سُنہرے ورق ہو۔"
"اسکرپٹ رائٹر کب سے بن گئے؟"
"بیٹھے بٹھائے بن گیا...... ایک اسکرپٹ ہٹ ہوا۔ پھر تو جھولا ئن لگ گئی۔ مگر اس فیلڈ میں پابندیاں ہیں۔ جو ڈائریکٹر کہے ویسا لکھنا پڑتا ہے۔ اب تو فون آتا ہے زبیر علی ایک پلے لکھنا ہے...... ایک خبیث بڑھیا...... سوئمنگ پول ہو...... کم عمر لڑکیاں...... پُرانہ تانگہ...... بس اسٹوری بنالو...... یعنی کچھ منظر تھما دیتے ہیں۔ تانا بانا ہمیں بُننا ہے۔ موضوع تو ہمیشہ طے شدہ ہوتے ہیں۔ دنوں میں کیا گھنٹوں میں تیار چاہیے۔" وہ دل کھول کر ہنسا۔
"گویا ڈکٹیشن ماننا پڑتی ہے؟"
"ہاں یار بالکل ماننا پڑتی ہے۔ میں بھی آسمان پر اونچی اڑتی پتنگ تھا مگر زمین قبول کر لی، چیک ملتے ہیں پیارے نوٹ ملتے ہیں۔ میں نے بھی دو کتابیں چھپوائی تھیں۔ اپنے پیسے لگا کر چھپوائی۔ اپنے پیسے لگا کر بانٹی...... ایک دو مہینے بعد ذکر ہی ختم ہو جاتا ہے...... بس پھر آسمان پر کمند ڈالنے کا خیال چھوڑ دیا۔

"مگر یار انسان کب کسی کے کہنے لکھوانے سے لکھ سکتا ہے۔" موڈ جیسا بھی ہو حالات جیسے بھی ہوں اطاعت گزاری کرنا پڑتی ہو۔ جب بندھ گئے تو پھر انکار کیسا...... حاکم اور ملازم والا ناطہ ہے۔ حکم ماننا پڑتا ہے؟ مانتے ہو؟"
"بالکل ماننا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی ساری رات جاگتا ہوں۔ ڈکٹیشن لینا پڑتی ہے۔ لاکھوں کے چیک یونہی نہیں دیتے۔"
"مگر یہ ادیبوں کی صف میں نہ احترام ادب؟ اور اگر آج کچھ نام ہے بھی تو کل کون یاد رکھے گا؟ ہمارا ادبی سرمایہ قاسمی، کاظمی، فیض، اقبال ہیں۔ یہ ہماری دنیا بھر میں پہچان ہیں۔ میثم راجہ دلائل دینے لگا۔ تب ہی زبیر علی کا دس سالہ بیٹا اور نو سالہ بیٹی جینز شرٹس میں ملبوس موبائل کیمرے آن کیے داخل ہوئے۔
"انکل...... Pix پلیز۔" تصاویر کے مختلف زاویے دیتے ہوئے میثم راجہ کہہ رہا تھا۔
"نا بھئی...... میں اپنا خیال اور لفظ نہیں بیچ سکتا۔ ان کا کوئی بھاؤ نہیں ہے۔ میرے کردار میری تخلیق ہیں میں انہیں پابہ زنجیر نہیں کر سکتا۔ قابل توجہ ہمارے آدرش ہیں نہ کہ کمرشل دماغوں کے ٹھونسے ہوئے خیال...... میری تو ایک سطر کوئی بدلے تو برداشت نہ کروں۔" زبیر علی نے بچوں کو فارغ کر کے بھیجتے ہوئے کہا۔
"برسوں کی خواری کے بعد میں سمجھ گیا۔ بھوک ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ بھوک پر لکھی یا بولی گئی تقریر ٹھوس حقیقت نہیں ہے...... ویسے تُو عظیم ہے...... میں تری عظمت کو سلام کہتا ہوں...... میں تری تردید نہیں کرتا۔"
ڈیوٹی کے دنوں میں دونوں کی کئی بار ملاقاتیں ہوئیں۔ زبیر علی نے ایک رات اسے فائیو اسٹار ہوٹل میں ڈنر کرایا اور روانگی پر اُس کے بچوں کے لیے تحفے بھی ساتھ کر دیے۔ جبکہ میثم راجہ جب پہلی بار گیا تھا تو ایک دَرجن

کیلئے (اپنے تئیں بہت مہنگے شمار کر کے) لے گیا تھا۔
سچ تو یہ ہے کہ میثم راجہ حساس دل لکھاری تھا۔ سب دیکھتا اور سمجھتا تھا۔ اُس کے ذہن میں کھچڑی سی پکنے لگی تھی۔ جب واپس گھر پہنچا تو آگے گھریلو مسائل کا انبار منتظر تھا۔ دو دن سے پانی والی موٹر خراب تھی پانی پڑوس سے بھر کر لایا جا رہا تھا۔ 4600 روپے کا بجلی کا بل آیا رکھا تھا۔ جس کے بھرنے کی آخری تاریخ کل تھی گروسری کا سامان ختم ہو گیا تھا۔ بچے تو زبیر علی کے مہنگے تحفے پا کر نہال ہو گئے۔ میثم نے ڈیوٹی کے T.A/D.A کی آس میں اُدھار روپیہ پکڑ کر مسائل حل کیے۔ اس کے بعد نیٹ کیفے گیا۔ اُس کے پاس ذاتی کمپیوٹر یا لیپ ٹاپ نہیں تھا۔ اپنی میلز چیک کیں، بے شمار میسج، میلز اُس کی عدم موجودگی کو مس کیا گیا تھا مگر پتا نہیں کیوں پہلی بار اُس کو اِن چیزوں نے خوش نہ کیا۔
اب جب بھی وہ لکھنے بیٹھتا یہی خیال آتا اس افسانے کو ڈرامہ بنا دوں تو کیسا رہے گا؟ پھر سوچتا میرا اتنا یونیک پلاٹ چھپ کر بھلا دیا جائے گا۔ مجھے کیا فائدہ ہے؟ اب اس کے دماغ نے اپنی ہی تردید کیخلاف دلائل اکٹھے کرنا شروع کر دیے تھے۔ وقت زمانہ ادوار اور اقدار بدلتے رہتے ہیں۔ نئی سوچوں کے ساتھ چلنے والے کامیاب رہتے ہیں، امتیاز علی تاج نامور ڈرامہ نگار تھے۔ میں بامقصد اور اعلیٰ اقدار کو لے کر لکھوں گا جلد ہی وہ خود کو منوانے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر اُس نے سوچ کے گھوڑے دوڑانے شروع کیے جلد ہی ایک اچھوتا خیال سوچا۔ سجا سنوار کر اسکرپٹ بنایا، ڈرامہ پروڈیوسر کو فون ملایا۔ اپنے مشہور افسانہ نگار، مقبول شاعر وغیرہ وغیرہ ہونے کا تعارف کرا کے دھاک جمائی۔ اپنی کتب کی تعداد بتائی۔ اُدھر سے سادہ سا جواب......
''اسکرپٹ بھیجیے ...... دیکھ کر ہی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔'' بھیج دیا گیا۔ کئی دن انتظار رہا۔ کوئی فون نہ آیا۔ آخر کار خود ہی فون کیا۔
وہ کہہ رہا تھا۔
''آپ بے شک اچھے افسانہ نگار اور شاعر ہیں۔ میں نے بھی آپ کی غزلیں ایک آدھ بار پڑھی ہیں۔ مگر ڈرامہ رائٹنگ کی اپنی ڈیمانڈز ہیں۔ مگر ہم آپ کو گنوانا نہیں چاہتے کیونکہ آپ اچھا مکالمہ لکھ سکتے ہیں۔ آپ ایسا کریں ہمیں آج کل اس ٹاپک پر کھیل کی ضرورت ہے۔ ٹاپک یہ ہوگا کہ......'' مزید کہا۔
''میثم راجہ صاحب...... ایک تو سیریز ہوتی ہے۔ اس کی دس گیارہ قسطیں ہوتی ہیں اس سے آگے کی بات ابھی کرنا قبل از وقت ہے۔ آپ اناڑی ہیں۔ آپ سنگل پلے لکھیں...... ابھی آپ یہ کریں...... آپ کو سات دن دیتا ہوں۔ سات دن بہت ہوتے ہیں۔ کام مقررہ وقت میں کرنا بہتر ہوتا ہے۔ یہ کام اچھا ہوا تو کام آپ کو ملتا رہے گا۔ اور...... معاوضہ آپ کی توقع سے زیادہ ہوگا۔ کہیے قبول ہوا؟''
''جی...... مجھے منظور ہے۔''
طے شدہ موضوع...... وقت...... کردار سب زنجیریں قبول ہوئیں۔ جان گیا تھا کہ بھوک ایک ٹھوس حقیقت ہے بھوک پر لکھی گئی تقریر حقیقت نہیں ہے۔ ٹھوس حقیقت کو عملی حل درکار ہوتا ہے الفاظ کا غوغا حل نہیں دیتا۔
الیکٹرانک میڈیا نے کاغذ کی دنیا کو بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ تاثر قائم کرنے میں، پیغام عام کرنے میں، محفلوں کا ذکر ہونے میں، نئی نسل کا جنون ہونے میں، اپنی زندگی بدلنے میں چنانچہ پانیوں پر نام لکھنے میں کوئی حرج نہ تھا۔
میثم راجہ نے بھی اپنے قیمتی خیال کی ناؤ بنا کر پانی میں چھوڑ دی۔

☆☆......☆☆

"دیکھو ابوذر میں تمہارے سامنے نہیں آئی، وقت نے ایسا چاہا، تم مجھے وعدہ خلاف مت سمجھنا، وہ اپنے یہاں ہونے کی دلیل دے رہی تھی۔ ابوذر کے ساتھ ساتھ خود کو بھی......
اور ابوذر...... وہ ایک سرد سی آہ بھر کر رہ گیا۔ "مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔" وہ دونوں اب......

نیلے آکاش پر پرندے اپنی اڑان بھر رہے تھے، بارش کے بعد مطلع صاف ہو گیا تھا۔ وہ آخری کلاس لے کر یونیورسٹی سے نکل آئی۔ اسے گھر جا کر تیاری بھی کرنی تھی۔ "شفق" پکار پر اُس کے قدم تھم گئے۔
"تمہیں پتہ چلا کچھ؟" اور پھر تیمور نے جو کچھ کہا وہ شفق کے حواس سلب کر گیا۔
"تم جانتی ہو نا شفق میں تمہیں کس قدر چاہتا ہوں، اُس دن میں کتنا خوش تھا اپنے ڈیڈ اور ممی کے ساتھ تمہارے گھر آنے والا تھا مگر......" آنکھوں میں آئی نمی نے ابوذر کو مزید بولنے نہ دیا۔
"مجھے ہر چیز کا احساس ہے ابوذر تمہارے ڈیڈ کے چلے جانے کا مجھے بے حد افسوس ہے، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ جس کیفیت سے تم گزر رہے ہو، میں شاید اُس کا اندازہ نہ کر سکوں، مگر یہ بات بھی یاد رکھنا کہ

رنج و خوشی کے ہر پل میں، میں تمہارے ساتھ ہوں، خود کو کبھی تنہا مت سمجھنا۔'' وہ اس کی اُداس آنکھوں میں پڑتے دکھ کو محسوس کرتے ہوئے بولی۔

''شفق میں فی الحال تم سے شادی نہیں کر سکتا ہے۔'' چند ثانیے کی خاموشی کے بعد وہ بولا، انداز ایسا تھا جیسے جبراً کہلوایا گیا ہو۔ شفق ایک ٹک اس کی جانب دیکھتی رہی۔

مختار صاحب کے انتقال کے بعد ساری تو نہیں مگر کچھ ذمہ داری ابوذر کے کندھوں پر آ گئی تھی۔ اس کی والدہ مڈل اسکول میں پڑھاتی تھیں۔ ابوذر کے علاوہ گھر میں ایک چھوٹی بہن اور سترہ سالہ شرجیل تھا، سو اس نے اپنے گھر والوں کو یتیمگی کے احساس سے بچانے کے لیے اپنا کردار تو بہرحال ادا کرنا تھا۔ اور ان حالات میں شفق سے شادی کی بات دوبارہ گھر میں کرنا نہایت نامناسب تھا۔ اپنے دل کو بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر اس نے شفق سے تب تک کا وقت مانگ لیا۔ جب تک گھر کے حالات پہلی ڈگر پر نہ آ جائیں۔ اور شفق...... اسے انتظار کرنا ہی تھا۔ صرف شادی ہی مقصدِ حیات نہ تھی اس کا اور بھی ترجیحات تھی۔ محبت کے سوا، لہٰذا وہ صبر کو تیار تھی۔ اُس نے یونیورسٹی جانا جاری رکھا بلکہ P.H.D میں اسکالرشپ کے لیے بھی اپلائی کر دیا۔ دل میں ابوذر کے لیے جو پسندیدگی تھی وہ یاد کا دیا بن کر جلتی رہی۔

اس کا یونیورسٹی میں M.Phil کا آخری سال تھا۔ وہ ماریہ کے ساتھ لائبریری سے نکلی تھی جب اس نے IR ڈیپارٹمنٹ کے سامنے اسے دیکھا۔ ابوذر اپنے دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا، کسی بات پر تیمور کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنستے اُس نے سر اُٹھا کر دیکھا تو اُس کا قہقہہ یوں تھما جیسے موٹر سے چلتے تیز رفتار ٹیوب ویل کو اچانک بریک لگے ہوں...... ابوذر کے ذہن کے پردے پر دو سال پہلے کا منظر رقص کرنے لگا۔

''ابوذر میں تم سے وعدہ کرتی ہوں آج کے بعد تمہیں نظر نہیں آؤں گی، جب تک تم نہیں چاہو گے۔ جب تک تم اپنے گھر والوں کے لیے کسی مقام پر پہنچ نہیں جاتے، میں تمہارے راستے کی دیوار نہیں بنوں گی، میں تمہاری مجبوری و پریشانی سمجھ سکتی ہوں۔''

''ابوذر......!'' وہ حال میں واپس آیا۔

''شفق تم......!''

''دیکھو ابوذر میں تمہارے سامنے نہیں آئی، وقت نے ایسا چاہا، تم مجھے وعدہ خلاف مت سمجھنا، وہ اپنے یہاں ہونے کی دلیل دے رہی تھی۔ ابوذر کے ساتھ ساتھ خود کو بھی...... اور ابوذر...... وہ ایک سرد سی آہ بھر کر رہ گیا۔

''مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔'' وہ دونوں اب کیفے میں تھے۔

''میں نے ممی کو ہر طرح سے قائل کرنے کی کوشش کی مگر وہ کسی صورت راضی نہیں ہو رہی ہیں اور جب سے فارحہ نے خودکشی کی دھمکی دی ہے ممی اور خالہ بہت ڈر گئے ہیں۔'' وہ لہجے میں دنیا بھر کی مجبوری سموتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''اور تمہاری بہن نینا اور شرجیل تمہارا بھائی......؟ اُن کا کیا ہوا؟'' وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوا تو شفق نے نجانے کس انداز میں ان دونوں کا پوچھا۔

''نینا تو شادی کے بعد کینیڈا چلی گئی تھی اور شرجیل پڑھائی کے ساتھ ایک زبردست سی جاب کر رہا ہے۔'' وہ اب مسکراتے ہوئے اپنے گھر والوں کا حال بتا رہا تھا جن کے بارے میں وہ کچھ عرصہ قبل نہایت فکرمند تھا۔ شفق نے اپنی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو بمشکل بہنے سے روکا۔

''تمہیں ضرور اپنی خالہ زاد کو حرام موت سے بچا کر ثواب کمانا چاہیے جو تمہاری چاہت میں مر رہی ہے۔'' وہ کہہ کر رُکی نہیں تھی۔

وقت کا پہیہ تیزی سے گھوما اور پانچ برس اس کی چکی میں پس گئے۔ شفق ایک ہفتہ قبل ہی جرمنی سے پی ایچ ڈی کر کے لوٹی تھی۔ وہ اپنی بہن کے ہمراہ اسپتال کے کوریڈور میں جانے کس کا انتظار کر رہی تھی جب اپنے پیچھے آہٹ پر اُس نے مڑ کر دیکھا۔ اور اس لمحے اُس نے شدت سے چاہا کہ سامنے کا منظر خواب ہو جائے یا وہ خود کسی جادو کی چھڑی سے غائب ہو جائے، مگر نہ تو منظر خواب ہوا اور نہ کوئی جادو کی چھڑی ہی اسے غائب کر سکی، وہ اکیلا نہیں تھا اس کے ساتھ ایک ڈیڑھ برس کا بچہ اور ستائیس کے لگ بھگ کی ایک لڑکی تھی جو اپنا نمبر پکارے جانے پر بچے کو ساتھ لے کر ڈاکٹر کے روم میں چلی گئی۔

''شفق مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔''

''مجھے بھی......'' وہ اپنی بے بسی پر خود ترسی کا شکار دکھائی دی۔ کچھ لمحے خاموشی کی نظر ہو گئے۔

''میں نے تمہیں پل پل یاد کیا شفق...... جانتی ہو۔''

''مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے ایکسکیوز می!'' اس کے نمبر کی پکار ہوئی تو وہ ابوذر کی بات کاٹ کر کہتے ہوئے چلی گئی۔

''شفق وقت گزرا ضرور تھا پر ختم نہیں ہوا، ہمارے پاس ایک چانس ہے اپنی زندگی سنوارنے کا...... تمہیں میرا ساتھ دینا ہو گا۔'' ابوذر کے اصرار کرنے پر وہ تین دن بعد اس کے ساتھ سی ویو کے ساحل پر تھی۔

''تمہاری بیوی اور بیٹا؟'' شفق نے سمندری موجوں کی بے چینی کو اپنے اندر محسوس کیا۔

''وہ میری ترجیحات کبھی بھی نہیں رہے اور نہ آئندہ کبھی ہو سکتے ہیں۔''

''ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو، لیکن ابوذر میری زندگی کا مقصد بدل چکا ہے، پہلے تم تھے کبھی میری Priority، لیکن اب میرے نزدیک محبت کا مل جانا ہی سب کچھ نہیں۔ تم جانتے ہو ابوذر تم ایک انتہائی موقع پرست انسان ہو...... تم اب آئے ہو۔'' آنسو اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

''تمہیں یاد ہے ایک وقت تھا جب تم بھی تھے اور میں بھی مگر وقت اچھا نہیں تھا، پھر کچھ ماہ و سال بعد یوں ہوا کہ وقت مہربان ہو گیا اور تم غیر...... اور اب وقت سمیت تم لوٹ آئے ہو، لیکن مجھے اپنی جگہ چھوڑنی پڑھ رہی ہے کیونکہ تم اپنے ساتھ میری جگہ پر کسی اور کو لے آئے ہو...... جانتے ہو میں نے آج زندگی سے کیا سبق سیکھا ہے۔ محبت ایسے شخص سے کرو جس سے کوئی نہ کرتا ہو، تاکہ وہ کبھی بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے۔

''کسی اور کے پکارنے پر محبت کو یوں بے مول نہ کر دے اور میں نے یہ بھی سیکھ لیا کہ آپ کی فیملی سے بڑھ کر آپ کے ساتھ کوئی اور وفادار نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بھی کہ کسی بھی تعلیم گاہ کو جھوٹی اور فریبی محبت کا ذریعہ بنا کر بدنام نہیں کرنا چاہیے۔ تم اپنے بیٹے کو تعلیم اور محبت کا احترام کرنا سکھانا۔''

''ابوذر ان گزرے برسوں میں زندگی نے مجھ سے تھوڑا سا لے کر مجھے بہت کچھ دیا ہے، میں نے اپنی پڑھائی مکمل کی، اپنی بیمار بہن کا علاج کرایا، عرصے سے وہیل چیئر پر بیٹھے اپنے باپ کو اس کے پاؤں پر چلتا دیکھتی ہوں تو جو خوشی ہم سب گھر والوں کے چہروں پر رقص کرتی ہے وہ ناقابل بیان ہے۔''

''تم سے ایک وعدہ لینا ہے مجھے۔'' شفق کے انداز و لہجہ دونوں بدلے تھے۔

''آج کے بعد زندگی بھر میرے سامنے مت آنا، امید ہے تم میرے وعدے کا مان رکھو گے۔ بس اور کچھ نہیں کہنا مجھے۔'' کہہ کر وہ چل دی اور ابوذر وہیں وقت کے ہاتھوں مجبور لاجواب سا کھڑا رہ گیا۔ وقت اور ساحل کی ستمگر ریت اُس کی آنکھوں میں گھس کر اسے بے چین کرتی رہی۔

☆☆......☆☆

دردِ دل کے واسطے

''اوہو! بھئی یہ ظلم نہیں ہے یہ بہادری ہے آخر مرد بچہ ہوں تم لوگوں کی طرح چوڑیاں پہن کر اور چڑیا سا دل لے کر گھر میں بیٹھنے سے تو رہا۔'' یہ اور بات کہ اس وقت وہ مرد بچہ ہم سے صرف تین سال بڑا اور بارہ سال کا تھا۔ اور اس مرد بچے کو اپنی بہادری کا ٹھیک ٹھاک خمیازہ بھگتنا پڑا۔ جب......

میں اور سویرا بچپن کی دوست تھیں۔ ہم دونوں آپس میں کزنز بھی تھے۔ وہ میری خالہ زاد تھی وہ ہمارے ہی علاقے میں رہائش پذیر تھی۔ بس بلاک کا فرق تھا۔ ہمارا اسکول ہماری وین ایک ہی تھی۔ ہم کلاس فیلو تھے۔ ہم دونوں ایوریج اسٹوڈنٹ تھے نہ کبھی فیل ہوئے نہ ہی کبھی ابتدائی تین پوزیشنز حاصل کیں نہ کبھی حاصل کرنے کی تگ ودو کی۔

ہمارے تمام شوق ایک جیسے تھے میوزک سننا، کتابیں پڑھنا، پاکٹ منی سے صرف کتابیں خریدی جاتیں۔ ہمارے خصائل بھی تمام ایک سے تھے، ہم دونوں بلاک کے رحم دل تھے انسان تو انسان ہم جانوروں کو بھی تکلیف میں دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔

اور موہی ہم سے قطعی اُلٹ تھا۔ تایا اور تائی کا نورِ نظر ان کی آخری اولاد بقول میرے کھرچن......اور اس نام پر وہ اکثر چڑ جاتا تھا۔

''ہاں میں کھرچن اور تم بگھار۔'' وہ میرے اکلوتے پن پر کوئی اور مثال نہ ڈھونڈ پاتا۔

''واقعی بگھار اپنے پاپا اور ماما کی زندگیوں کی ہانڈی کو خوشبودار اور پُر لذت بنانے والی۔'' میں مزید جلاتی۔

''پُر لذت نہیں جلا ہوا بگھار اس کے اصل ذائقے اور خوشبو کو بھی ختم کر دینے والی۔'' وہ جل کر کہتا۔

''وہ کیسے؟'' میں شرارتی ہنسی ہنستی۔

''وہ ایسے کہ جب سے تم آئی ہو وہ بیچارے اس پہاڑ کو کھسکانے کی تگ ودو میں جوڑ توڑ میں مصروف رہنے لگے ہیں۔'' اس نے مجھے جلانے کی کوشش کی۔

''اس کی تم فکر نہ کرو مابدولت شادی اس سے کریں گے جو صرف ہم سے شادی کرے نا کہ جہیز سے۔'' میں نے شاہانہ انداز میں کہا۔

''ناں! کبھی جہیز سے نفرت کرتی ہوئی لڑکوں کی ماؤں بہنوں کو دیکھا ہے تم نے؟ انہیں لڑکی سے زیادہ جہیز سے دلچسپی ہوتی ہے۔'' وہ مزے

سے حقیقت آشکارتا۔
''لڑکے کی ماؤں بہنوں کو یا خود لڑکے کو۔''
میں چھیڑتی۔
''لڑکے اور ان کے باپ کبھی جہیز نہیں مانگتے۔'' وہ اپنی صنف کا دفاع کرتا۔
''ہاں گھر کی عورتوں کو آگے کر دیتے ہیں ناں!'' میں ہنسی اور وہ تپ گیا۔
''کیسے؟'' اس کا لب ولہجہ تپش سے پُر تھا۔
''بھئی سامنے کی بات ہے لڑکوں کو لڑکی پسند نہ ہو تو کہرام مچا ڈالتے ہیں اور اپنی پسند کی ہی لاتے ہیں مگر جہیز کی ناپسندیدگی کے باوجود منہ میں گھگھنیاں ڈالے بیٹھے رہتے ہیں۔
اور بھئی صحیح بھی تو ہے کسے بری لگتی ہے نئی کراکری' نیا فرنیچر' نئے الیکٹرونکس' کپڑے' لتے' زیورات' نہ بیڈ پر بچھنے والی بیڈشیٹس کی فکر نہ باتھ رومز میں لٹکنے والے ٹاولز کی فکر اور نہ ہی سردیوں میں کمبل اور رضائیوں کی خواری میں طنزیہ کہتی چلی گئی تو اس کے لبوں پر بڑی شرارتی مسکراہٹ در آئی۔
''اور بیوی بونس میں۔'' میں نے اس کی شرارتی مسکراہٹ کو نظرانداز کر کے کہا۔
''ہاں کسے برا لگتا ہے چلو پھر میں تم سے شادی کرلوں گا مگر جہیز کے ساتھ۔'' اس نے شرارت سے کہا۔
''آخر تم سے شادی کرنے کی کوئی وجہ بھی تو ہو۔'' وہ فل شرارت کے موڈ پر آچکا تھا۔
''منہ دھو رکھو مجھے بندر قطعی پسند نہیں ہیں۔'' اب تپنے کی باری میری تھی۔
''مگر فکر نہ کرو مجھے بندریا بہت پسند ہے۔'' اس نے مزے سے کہا اور میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ دیکھا کرسٹل کا شوپیس اُٹھا کر اسے دے مارا جسے اس نے کمال مہارت سے کیچ کرلیا اور ساتھ ہی نعرہ لگایا۔
''آؤٹ ہے۔'' اور میں تلملا کر اس کے پیچھے بھاگی مگر وہ تیزی سے بھاگ کر اپنے پورشن میں چلا گیا۔

☆......☆......☆

مگر یہ بہت بعد کی بات ہے ہاں تو وہ ہم سے قطعی مختلف انتہائی ظالم انسان تھا۔ دن بھر اس کی کیٹی اس کی جینز میں پھنسی رہتی تھی۔ اور وہ معصوم پرندوں اور ان کے گھونسلوں کو نشانہ بناتا رہتا تھا۔ اور شام میں فخریہ اپنا شکار لا کر ہمیں دکھاتا تھا۔ اور میں اور سویرا ضرور اس کے ظلم پر اسے لعن طعن کرتے اور وہ کہتا۔
''اوہو! بھئی یہ ظلم نہیں ہے یہ بہادری ہے آخر مرد بچہ ہوں تم لوگوں کی طرح چوڑیاں پہن کر اور چڑیا سا دل لے کر گھر میں بیٹھنے سے تو رہا۔'' یہ اور بات کہ اس وقت وہ مرد بچہ ہم سے صرف تین سال بڑا اور بارہ سال کا تھا۔
اور اس مرد بچے کو اپنی بہادری کا ٹھیک ٹھاک خمیازہ بھگتنا پڑا۔ جب اپنی بہادری کے ہاتھوں ایک دن وہ کوے کے گھونسلے کو نشانہ بنا بیٹھا۔ پھر تو موہی صاحب جب گھر سے نکلتے ان پر ٹھونگیں پڑنا شروع ہو جاتی تھیں اور وہ گھبرا کر گھر میں بھاگ آتے۔ اور میں اور سویرا ہنستے ہنستے دوہرے ہو جاتے۔
''مسٹر موہی! آپ کی وہ مشہور زمانہ بہادری کیا ہوئی۔'' میں اس کے زخموں پر نمک پاشی کرتی۔
''مس شیزا! اس ہوائی مخلوق کو کیا بہادری دکھانا ہوتا کوئی مرد بچہ تو بتاتا۔'' مشکلات اپنی جگہ مگر اس کی ڈینگیں اپنی جگہ......

بڑی مشکلوں سے کوے اپنی جنگ سے دستبردار ہوئے اور موہی کی جان چھوٹی۔

☆......☆......☆

میری اور سویرا کی ہمدردی کی کئی مثالیں موجود تھیں۔ جنہیں سب اب تک یاد کرتے ہیں ایک بار ہمارے اسکول میں بلی نے بچے دیے۔ ان میں سے ایک بچہ یا تو پیدائشی معذور تھا یا بعد میں کسی حادثے کا شکار ہوگیا تھا کہ وہ پچھلی دو ٹانگیں گھسیٹ کر چلتا تھا۔

بلی اپنے باقی کے دو بلونگڑوں کے ساتھ کہاں کی کہاں نکل جاتی۔ اور یہ وہیں گھسیٹ رہے ہوتے تھے۔ جب بلی باقی کے دونوں بلونگڑوں کو محفوظ مقام پر چھوڑ دیتی تو اس بچے کو منہ میں دبا کرلے جاتی۔

ایسے ہی ایک دن کی بات ہے بلی اپنے بچوں کے ساتھ آگے نکل گئی تھی ہم دونوں انتہائی ہمدردی سے اس بھورے کنجی آنکھوں والے بلونگڑے کو دیکھ رہے تھے کہ گھات میں بیٹھا ہوا بلا اس پر جھپٹا اور اس سے پہلے کہ وہ اسے لے کر ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ ہم نے پتھراؤ کر کے اس بلے کو بلونگڑے کو چھوڑنے پر مجبور کر دیا شکست کھا کر بلا بھاگ نکلا اور اہم بچے کو لے کر کلاس روم میں آگئے۔

اس حملے نے بچے کو اور بھی زخمی کر دیا تھا اس سے چیخا بھی نہیں جا رہا تھا۔ ہم نے چھٹی تک اسے ڈیسک میں چھپا کر رکھا پھر گھر لے آئے سویرا اپنے گھر چلی گئی۔

امی نے کتنا چاہا کہ میں بچے کو باہر پھینک دوں مگر میں نہیں مانی شام میں ابو سے اصرار کر کے میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی۔ انہوں نے نا صرف اس کی مرہم پٹی کی بلکہ اس کے پیروں کے لیے بھی دوا دی دنوں میں وہ بھاگنے لگا اور اب تو وہ سب کا لاڈلا مونو ہے۔ اس بات کو بھی اب تو آٹھ سال ہو گئے۔

ایسے ہی ایک دن موہی کے شکار سے ایک طوطا اُٹھا کر اس کی مرہم پٹی کی تھی اور اسے پین کلرز کے ننھے ننھے ٹکڑے کھلاتے تھے۔ تو وہ ٹھیک ہوگیا۔ وہ بہت چھوٹا طوطا تھا۔

غالباً اس کے پیرنٹس اُسے اڑنا سکھا رہے تھے جب وہ موہی کا شکار بنا پھر ہم نے اسے اڑنا سکھایا۔ ہم میں سے ایک اس طوطے کو اوپر سے چھوڑ دیتا اور ایک اسے کیچ کرنے کے لیے نیچے کھڑا ہو جاتا تھا۔ وہ اپنی زندگی کی بقا کے لیے اپنے پروں سے اڑنے کی کوشش کرتا۔

اور پھر نیچے کھڑے ہوئے کی جھولی میں گر جاتا اسی طرح اس نے اڑنا سیکھا پھر وہ ہمارے گھر کا آزاد پنچھی بن گیا جب موڈ ہوتا آ جاتا۔ جب موڈ ہوتا چلا جاتا اب تو ایک عرصے سے نہیں آیا پتا نہیں زندہ ہے یا مر گیا یا کسی کا قیدی بن گیا۔

اسی طرح ایک دن میں چھوٹے چاچو کے ساتھ جا رہی تھی ان کی بائیک پر وہ مجھے سوئٹس دلانے لے جا رہے تھے کہ اچانک ہی ایک پپی چاچو کی بائیک کے سامنے آ کر زخمی ہوگیا۔

چاچو کا رکنے کا قطعی کوئی ارادہ نہیں تھا مگر میرے آنسوؤں نے ان کے ارادوں کو پاش پاش کر دیا۔ اس پپی کے لانے پر سب سے زیادہ واویلا امی نے کیا بقول ان کے ''یہ نجس جانور ہے یہ گھر میں ہو تو فرشتے نہیں آتے۔'' تب میں نے کہا۔

''تو کیا! ہم اس وجہ سے اسے تڑپ تڑپ کر مرنے کے لیے چھوڑ دیں کیا اس بے رحمی پر خدا ہم

سے خوش ہوگا۔'' اور امی چپ ہوگئیں ان دنوں میں 8th اسٹینڈرڈ میں تھی۔ اور اسکول کی بہترین ڈیبیٹر تھی۔ مجھے اس عمر میں بھی تقریر پر عبور حاصل تھا تو سامنے والے کو متاثر کیوں نہ کر پاتی اور وہ بھی جب میری ماں ہو۔

ہاں یہ ضرور کیا کہ ٹھیک ہونے پر اس پپی کو باہر کا راستہ دکھا دیا۔ مگر آج جب وہ ایک خوبصورت Dog میں تبدیل ہو چکا ہے گھر سے باہر نکلوں تو آ کر میرے پیروں میں اپنا منہ رکھنا نہیں بھولتا۔ اور یہ صفت جانوروں میں ہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے محسن کو نہیں بھولتے۔

☆......☆......☆

موہی صاحب ذرا بڑے ہوئے تو ان کے ہاتھوں میں غلیل کے بجائے ایئر گن آ گئی اور میں جل گئی۔

''کتنے سنگدل ہو تم موہی!'' میں نے اس کے ایئر گن کے کارناموں کی تفصیل سن کر کہا۔

''سنگ معنی پتھر اور دل معنی تو دل ہی ہوتا ہے یعنی کہ تم مجھے پتھر دل کہہ رہی ہو۔'' اس نے بڑے مزے سے پوچھا۔

''میں نے تم سے اُردو کا پوسٹ مارٹم کرنے کو نہیں کہا۔'' میں نے جل کر کہا۔

''تو پھر کیا اپنا پوسٹ مارٹم کرنے کو کہا ہے، ویسے بائی دا وے جل کیا رہا ہے؟'' اس نے شرارت سے ناک پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

''تمہارا ہی دماغ جل گیا ہوگا بشرطیکہ ہو۔'' میں آتش فشاں کے دہانے پر جا بیٹھی۔

''ویسے ایک بات ہے غصے میں عورت کا حسن دو آتشہ ہو جاتا ہے۔'' اس کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

''عورت ہوں گی تمہاری ہوتی سوتیاں I Am A Girl, Only Twelve Years Old۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''حد ہوتی ہے مبالغے کی یار! باقی کے چار سال کہاں گئے۔'' اس نے مجھے چھیڑا۔

''اتنی عمر چھپانا عورت کا پیدائشی حق ہے۔'' میں نے بغیر چھڑے کہا۔

''اور تم حقوق نسواں کی علم بردار۔'' اس نے مجھے دیکھا۔

''نہیں تمام Living Beings کے حقوق کی علمبردار۔'' میں نے آرام سے کہا اور وہ کھل کر ہنس پڑا۔

☆......☆......☆

تائی امی شروع سے کہا کرتی تھیں کہ وہ اپنے دونوں بیٹوں کی شادیاں سگی بہنوں سے کریں گی اس کی وجہ میری امی اور چچی تھیں ان دونوں کی آمد سے قبل تائی امی نے گھر بڑا اچھا سنبھالا ہوا تھا۔ سب کے دل خدمتوں سے جیتے ہوئے تھے۔ مگر میری امی اور چچی نے آ کر سب ملیا میٹ کر دیا۔ یہ دونوں بہترین دوستیں تھیں اور انہوں نے ایک اور ایک گیارہ والے مقولے پر عمل کیا۔ تائی کے ہر اچھے کام کو برا اور ہر اچھائی کو برائی میں تبدیل کر دیا۔

وہ سب جو ان سے محبت کرتے تھے ان سے شاکی ہوگئے۔ اور وہ دونوں پورے گھر پر چھا گئیں۔ سو تائی اپنے گھر میں سکون بحال رکھنے کے لیے کہا کرتی تھیں کہ وہ دو سگی بہنوں کو لائیں گی۔''

اب اس میں بھی کچھ تحفظات تھے کہ ان کی دونوں دیورانیوں کے ہاں ایک ایک ہی لڑکی تھی تو خیر سے اکلوتی تھی ہی چھوٹے چاچو کے بھی دو بیٹے اور ایک بیٹی، حسن' حسان اور عائلہ تھے جبکہ تائی

کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں جن میں سے تو بی اور نازی آپی کی شادیاں ہو چکی تھیں صرف منعم بھائی اور ماہیر عرف موہی باقی تھے اور میں یعنی شانزے عرف شیز اپنے والدین کی اکلوتی نور نظر تھی ہمارے گھر میں لڑکے اور لڑکیوں کا ریشو برابر یعنی 4/4 تھا۔

امی اور چچی جب ساتھ ہوتیں تو اپنے کارنامے یاد کر کے خوب ہنسا کرتی تھیں۔

''ہونہہ! بڑی تھیں تو چاہتی تھیں کہ سب پر ان کا رعب ہو سب ان کی عزت کریں آگے پیچھے پھریں۔'' میرا بچپن گزرا تھا ایسی باتیں سنتے اور اب تو میں شعور کی عمر میں آ گئی تھی۔

''لیکن چچی! اس میں برا ماننے والی بات کہاں ہے۔ یہ تو بڑے کا حق ہوتا ہے۔'' ایک دن میں نے جی کڑا کر کے کہہ ہی دیا امی کی طرف سے دھپ پڑنے کا خطرہ جو موجود تھا۔

''تمہیں نہیں پتا تمہاری تائی کتنا بڑا فتنہ تھیں۔'' چچی نے ناگواری سے مجھے دیکھا۔

''چچی! فتنہ ہوتا ہے تو نظر آتا ہے ہمارا بھی بچپن اسی گھر میں گزرا ہے۔

میں نے تائی کو ہمیشہ سب کی بے لوث خدمت کرتے اور محبت کرتے دیکھا ہے اور آپ دونوں کی طرح میں نے کبھی انہیں آپ کی برائی کرتے ہوئے بھی نہیں دیکھا اور پھر پروپیگنڈے کی ضرورت کہاں ہوتی ہے۔ یہ آپ مجھ سے بہتر جانتی ہیں۔'' میں نے ٹھہر ٹھہر کر کہا اور امی اور چچی نے ایک دوسرے کو دیکھ کر آنکھوں آنکھوں میں اشارہ کیا اور خاموش ہو گئیں اور پھر اس موضوع پر میرے سامنے انہوں نے کبھی بات نہیں کی پھر وہ اب اتنی با اختیار بھی نہیں رہی تھیں کیونکہ اب پورشنز الگ تھے۔

☆......☆......☆

اس دن میں موتو کو نہلانے کے بعد ڈرائر سے خشک کر رہی تھی کہ موہی اور سویرا آ گئے۔

''یہ تمہارے Pet House کی کسی دن چھٹی بھی ہوتی ہے۔'' اس نے مین سوئچ آف کر کے ڈرائر بند کیا اور موتو کو بقول اس کے میری ظالمانہ گرفت سے آزاد کیا۔

''تمہیں کوئی پرابلم ہے کیا؟ اپنے پورشن میں سکون سے نہیں بیٹھ سکتے۔'' میں اس دخل در معقولات پر چڑ گئی۔

''کیا کروں دل تو یہاں پڑا رہتا ہے۔'' اس کی شرارت عروج پر تھی۔

''دیکھو حرکتیں درست کر لو نہیں تو مجھے تایا ابو سے تمہاری شکایت لگانی پڑے گی۔'' میں نے سلگ کر کہا۔

''اوہ! رئیلی کیا تم ایسا کرو گی Thanks پھر تو تم میری پرابلم Solve کر دو گی۔ وہ کیا ہے ناں! میں ہوں ایک مشرقی لڑکا...... اپنے منہ سے بتاتا کیا اچھا لگوں گا۔'' اس نے شرمانے کی بڑی جاندار ایکٹنگ کی اور میں باوجود غصے کے ہنس پڑی۔

''اسے کہتے ہیں بدلی سے چاند کا دیدار۔'' اس نے سینے پر الٹی طرف ہاتھ رکھ کر آنکھیں بڑے اسٹائل سے بند کیں۔

''یہ 1807ء کے استعارے اپنے پاس رکھو اور وجۂ نزول بتاؤ۔'' میں نے بغیر متاثر ہوئے کہا۔

''تو کیا تمہیں نئے انداز کا اظہار پسند ہے۔'' وہ سراپا اشتیاق بنا محوِ سوال تھا۔

''مجھے نئے انداز کی درگت پسند ہے جو تایا ابو سے اکثر تمہاری بنتی ہے۔'' میں نے حساب برابر

کیا تو وہ کھلکھلا ہنس دیا۔
''وجۂ نزول۔'' میں نے گھورا۔
''ارے کس قسم کی دوست ہو تم۔ تمہاری دوست کو یہ بتانے کے لیے کہ آج اس کا برتھ ڈے ہے خود آنا پڑا۔''
اس نے کاندھوں سے پکڑ کر سویرا کو آگے کیا جو روٹھی ہوئی لگ رہی تھی۔ اور میں نے دانتوں تلے زبان داب لی یہ نہیں تھا کہ میرا اس کو وش کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ گفٹ میں نے دو مہینے پہلے سے لے کر رکھا ہوا تھا۔ کارڈ بھی لکھا رکھا تھا بس آج کا دن نہ جانے کیسے دماغ سے محو ہو گیا تھا۔
''جب تم جیسے دماغ کو دہی بنانے والے ہر وقت سر پر موجود ہوں تو کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔''
میں نے جل کر کہا اور سویرا کو گلے لگا کر برتھ ڈے وش کیا اس کا گفٹ اور کارڈ دیا مگر پھر بھی اس کی ناراضگی ختم کرنے کے لیے جیب ہلکی کرنی پڑی پینی پیزا کا وزٹ کرنا پڑا اور مجبوراً موہی کی خدمات حاصل کرنا پڑیں۔
☆......☆......☆
انہی دنوں موہی نے تایا ابو اور تائی امی سے میرے لیے بات کی اور اپنا کارنامہ سنانے میرے پاس آ پہنچے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ تائی امی شدید مخالفت کریں گی وجہ وہی سگی بہنیں اور میں کلی اکلوتی، مگر ایسا کچھ نہیں ہوا تائی نے نا صرف موہی کو پسند کو اوکے کر دیا بلکہ میرے ساتھ ساتھ منعم بھائی کا رشتہ سویرا کے لیے دے دیا۔ مونی بھائی اور موہی میں کیا کمی تھی ہر لحاظ سے بے مثال تھے۔
تایا ابو کے بزنس میں ہاتھ بٹاتے تھے سو رشتے منظور ہو گئے اور میری تو یہ خبر سن کر تلووں سے جو لگی تو سر میں جا کر پھوٹی میں تنتناتی ہوئی موہی کے کمرے میں جا پہنچی وہ کمپیوٹر پر کسی کام میں معروف تھا مجھے دیکھتے ہی چہکنے لگا۔
''وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے کبھی ہم اُن کو کبھی گھر کو دیکھتے ہیں۔''
''کوئی اور گھسا پٹا شعر نہیں تھا۔'' میں نے طنز کیا۔
''ایک تو تمہاری جدت پسندی پھر کیا کہوں۔ بڑے بھاگ ہمارے جو وہ ہمارے گھر پدھارے۔'' اس نے لب شرارت سے بھینچے مجھ سے بات کرتے کرتے وہ کمپیوٹر پر بھی معروف تھا۔ میں نے بھڑک کر اسے دیکھا اور پیپر ویٹ اٹھا لیا۔
''کیا کرتی ہو شوہر بنانے سے پہلے شہید بنانا چاہتی ہو۔'' اس کی شوخی عروج پر تھی۔
''پچھتاؤ گے موہی تم مجھ سے بہت برا۔'' میں تلملا گئی۔
''اس انجام کا تو اس فیصلے کے ساتھ یقین ہے مجھے۔'' وہ بے چارگی سے بولا تو مجھے ہنسی آ گئی تب وہ بھی ہنس دیا۔
''ہاں یہ ہوئی ناں بات! اب بتاؤ مسئلہ کیا ہے، وجۂ نزول کیا ہے۔''
اس نے کمپیوٹر کی طرف رخ کر کے کوئی بٹن پش کیا اتنا تو اندازہ تھا کہ وہ کوئی پروفائل کھول رہا ہے مگر کس کی یہ نہیں پتا تھا۔
''میں تم ہلاکو خان سے شادی کے لیے تیار نہیں ہوں۔'' میں نے آرام سے کہا۔
''مجھے بھی کوئی شوق نہیں چڑھا تم ہٹلر کی جانشین سے شادی کرنے کا وہ تو امی کو تم پسند ہو تو میں نے سوچا کہ کر لیتا ہوں۔'' اس نے مسکین سی

شکل بنائی۔
"کیا میں ہٹلر کی جانشین ہوں۔" میں نے اسے کڑے تیوروں سے دیکھا۔
"ہٹلر معصوم کا نام تو میں نے خوامخواہ لے لیا۔ ورنہ تمہاری بڑھکیں تو ایسی ہوتی ہیں کہ پنجابی فلم کا ہیرو سن لے تو پھڑک کر مر جائے۔" اس نے بڑے مزے سے کہا اور باوجود غصے کے مجھے ہنسی آ گئی۔
"تم ٹام کروز بھی ہوتے تو بھی میں تم سے شادی نہ کرتی۔" میں نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔
"اور تم لارا دتہ بھی ہوتیں تو بھی میں تمہیں سے شادی کرتا۔" اس نے بڑی شان سے کہا اور میرا منہ لارا دتہ کی شکل کا تصور کر کے کڑوا ہو گیا۔
"اس سے تو میں اپنے گھر کا باتھ روم بھی نہ دھلواؤں۔" میں نے کڑے انداز میں اسے گھورا۔
"اور سلمیٰ ہائیک......" اس نے پوچھا اور اس کے ساتھ ہی کلک کیا تو سلمیٰ ہائیک کا پروفائل کھلنے لگا۔
"ہاں یہ میڈ اچھی بن سکتی ہے۔" میں نے سلمیٰ ہائیک کے پرکشش فیگر اور اٹریکٹو فیس کو دیکھا۔
"تو پھر ڈن ہے۔" اس نے پوچھا۔
"کیا ڈن ہے۔" میں نے پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا۔
"یا اللہ کیا کوڑھ مغز لڑکی نصیب میں لکھ دی ہے کب سے یوسف و زلیخا سنا رہا ہوں۔ اب پوچھ رہی ہے زلیخا عورت تھی یا مرد۔" اس نے سر تھاما اور میں نے مسکراتے ہوئے رُخ موڑ لیا۔
یہ نہیں تھا کہ موہی مجھے پسند نہیں تھا میرا تو خیال تھا کہ میرے لیے موہی ہی سب سے زیادہ بہتر ہے مگر ہر مشرقی لڑکی کی طرح میری بھی آرزو تھی کہ کبھی وہ ڈھنگ سے انسانوں کی طرح اپنی پسند کا اظہار کرے مگر موہی صاحب تو اظہار محبت بھی یوں فرماتے تھے گویا بھتہ وصولی پر نکلے ہوئے ہوں۔

☆......☆......☆

اس دن میں مونو کے لیے دودھ میں روٹی مل رہی تھی۔ تب موہی آ گیا۔
"اے رقیب روسیاہ! تم ذرا یہاں سے جاؤ ہمیں اپنی مستقبل کی تھانیدارنی سے بات کرنی ہے۔"
اس نے مونو کو باہر کا راستہ دکھایا۔
"سنیے! مسٹر ماہیر اکرام کیا آپ کو کوئی اور کام نہیں ہے جو آپ ہر وقت میرے سر پر سوار رہتے ہیں۔" میں نے خاصی تہذیب سے دریافت کیا۔
"اُف! مس شانزے قاسم میری ذات ناتواں اور یہ طرزِ تکلم! چٹکی تو کاٹنا کہیں خواب تو نہیں کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا۔" اس کی ریل چل پڑی۔
"چٹکی کیوں یہ چمٹا آگ پر تپا کر لگا دیتی ہوں لگتے ہی حقیقت کا ادراک ہو جائے گا۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔
"لڑکی! مجھے اپنا مستقبل خاصا مخدوش نظر آ رہا ہے۔" اس نے آہ بھری۔
"نظر ثانی کی اجازت ہے عالم پناہ!" میں کسی کنیز کی طرح کورنش بجا لائی۔
"مجھے آپ سے ہمدردی ہے عالم پناہ!" میں نے کہا اور وہ ہنس پڑا۔
"سنو تمہیں پتا ہے ناں کہ میں کھانے پینے کا

کتنا شوقین ہوں۔ تمہیں کچھ ڈھنگ کا پکانا آتا ہے نہیں تو فوراً سیکھو۔'' اس نے بڑے آرام سے حکمیہ انداز میں کہا۔

''اس انکشاف سے پردہ اٹھانے کو آپ کی صحت ہی کافی ہے۔ اور ذائقہ ذوق اور مصالحہ ہیں ناں! باقی رہے نام اللہ کا۔'' میں نے مزے سے کہا وہ ہی موٹا نہیں تھا مگر باقاعدگی سے جم جانے کے باعث اس کی باڈی بلڈ اچھی تھی۔ تو خوراک بھی اچھی تھی۔

''لڑکی! ہونے والے شوہر کو نظر لگاتی ہو اور ذائقہ، ذوق اور مصالحے کے کھانے کھانے کے بعد بس اللہ کا نام ہی رہ جائے گا۔'' وہ بے چارگی سے بولا تو میں کھلکھلا کر ہنس دی۔

☆......☆......☆

تائی امی نے میری اور سویرا کی تمام شاپنگ ایک سی کی تھی۔ یہاں تک کہ ولیمے اور ویڈنگ ڈریس ڈیزائن بھی سیم تھے۔ بس کلرز مختلف تھے اور وہ بھی اس وجہ سے کہ میرا کلر فیئر تھا۔

اور سویرا کی رنگ سلونی شام کی سی تھی۔ تائی امی نے ڈریس کلرز کے لیے امی اور چچی سے مشورہ کیا تھا امی نے سویرا کے کلر کی وجہ سے ولیمے ڈریس میں سویرا کے لیے ٹی پنک اور فیروزی کلر رکھوایا۔

میرا ٹی پنک اکلر تھا۔ ویڈنگ ڈریس دونوں کے ڈیپ ریڈ تھے۔ سویرا کا رنگ اس کے ددھیال پر تھا میرا تو ننھیال اور ددھیال دونوں خوب گورے چٹے تھے۔

شادی سے دو دن پہلے ہم دونوں سروس کے لیے پارلر آئے تو سویرا نے ولیمہ ڈریس کلر کے بارے میں ناپسندیدگی ظاہر کی اور میں منہ کھول کر نہ کہہ سکی کہ اس کلر کو اس کی رنگت کی وجہ سے لیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ میری کزن دوست اور اب جٹھانی بھی بننے جارہی تھی اور ایسا کہنے سے اس کی دل آزاری کا خدشہ تھا۔

یہ نہیں تھا کہ رنگت کی وجہ سے وہ کسی سے کم تھی اس کی اس سلونی شام کی سی رنگت میں کئی دل اٹکے ہوئے تھے۔ اور جو اس کے ولیمہ ڈریس کا کلر تھا وہ اس کا فیورٹ کلر تھا مگر اس وقت وہ کہہ رہی تھی۔

''تمہارے ولیمہ ڈریس کا کلر میرے کلر سے اچھا ہے۔''

''اوہو! سویرا بی بی بندہ سدا سے ناشکرا ہے اب مجھے تمہارے ڈریس کا کلر پسند آرہا ہے اور تمہیں میرے لو جی گل ہی مک گئی۔'' میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا اور اس نے مجھے مشکوک انداز میں دیکھا۔

''ایسا کرتے ہیں ڈریس بدل لیتے ہیں میں نے تو تائی امی سے کہا بھی تھا مگر وہ کہہ رہی تھیں میری سویرا پر یہ کلر بہت اٹھتا ہے اور مونی بھائی نے تو اپنی پسند سے تمہارے لیے یہ ڈریس لیا ہے مگر پسند تو اپنی ہی ہونی چاہیے کیوں ہے ناں!'' ہم دونوں ڈریس بدل لیتے ہیں گھر کی تو بات ہے۔'' میں نے بے نیازی دکھائی۔

''ایویں ہی بدل لیں کل کو تم کہو گی کہ دولہا بھی بدل لیتے ہیں۔'' وہ بے ساختہ بولی۔

''اوہو ہو! تو بات یہاں تک پہنچ گئی ہے۔'' میں نے اسے چھیڑا تو اس کے گال دہکنے لگے اور میں نے سوچا چھوٹے سے جھوٹ سے اگر دلوں کے تفرقے مٹ جائیں تو کیا برا ہے اور یوں بھی کسی دانا کا قول ہے کہ ''نقص امن کے خطرے والے سچ سے جھوٹ بہتر ہے۔''

☆......☆......☆

اور اس دن مہندی تھی میری مہندی ایک دن پہلے ہو چکی تھی آج سویرا کی مہندی تھی۔ یہاں مایوں پر بھی خوب رونق لگی ہوئی تھی۔ حسن حسان نے تسلے بجا بجا کر ہنگامہ مچا رکھا تھا۔

عائلہ نے موہی کی سالی بننے میں فائدہ محسوس کیا۔ سو وہ ہماری طرف سے تھی۔ یہ الگ بات کہ دروازہ رکوائی میں وہ موہی کی بہن بننے والی تھی۔ اور آج گھر خالی تھا سب سویرا کی طرف گئے ہوئے تھے۔

کل موہی اور مونی بھائی کی اکٹھی مہندی لان میں ہونی تھی۔ میں سر ٹکا کر لیٹی ہی تھی کہ موبائل دہائیاں دینے لگا میں نے دیکھا موہی کی کال تھی سو ریسیو کر لی۔

''یار! ابھی بھی دو دن کی دوری باقی ہے۔'' اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

''بکواس بند کرو اور وہ بکو جس کے لیے فون کیا ہے۔'' میں نے چڑ کر کہا۔

''لڑکی! تمیز سے بات کرو اب میں باضابطہ طور پر تمہارا شوہر ہوں۔'' اس نے خاصے رعب سے کہا ہمارا نکاح مایوں میں ہی ہو چکا تھا۔

''تم بتاؤ گے یا میں فون بند کروں۔'' میں نے دھمکی دی اور اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''آہ ہاہ!''

''کاش تم بھی یہاں ہوتیں تو دیکھتیں۔ کیسی کیسی حسین صورتیں تمہارے شوہر پر فدا ہیں۔ پچھلے آدھے گھنٹے سے تین حسینائیں لائن مار رہی ہیں مگر میں قطعی مشرقی شوہر ہوں نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا حالانکہ سفید کپڑوں والی تو اپسرا لگ رہی ہے اور بال اُف کیا بال ہیں اور مسٹرڈ سوٹ والی تو کیا بتاؤں۔'' اس کی ریل چل پڑی۔

''نہ بتاؤ اور نہ میرے کان کھاؤ جا کر تینوں کی لائن ریسیو کر کے ثواب دارین حاصل کرو۔'' میں نے بے نیازی دکھائی۔

''بعد میں روؤ گی تو نہیں۔'' اس نے شرارت سے پوچھا۔

''نہیں رلاؤں گی پرامس۔'' میں نے کہا تو اس کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

☆......☆......☆

یوں ہی شادی کا دن آ پہنچا گھر کی بات تھی اس لیے باہم مشورے سے ایک ہی ہال بک کروالیا گیا تھا۔ اس طرح یہ مرحلہ بھی بخیر و خوبی نمٹا۔

توبی اور نازی آپی نے ہماری تمام رسوم پوری کروا کر ہمیں ہمارے کمروں میں پہنچا دیا۔

پتا نہیں اس رشتے میں کیا کمال ہے کہ یہی بندہ جس سے زندگی کی ہر بات شیئر کی تھی آج اس کی آمد سے قبل دل پسلیاں توڑ کر نکلا جا رہا تھا۔ پھر وہ کمرے میں داخل ہوا پھر نہ جانے آدھے گھنٹے تک کون سے ضروری امور نمٹاتا رہا۔ کبھی یہاں آتا، کبھی وہاں جاتا۔

میرا تھکن سے برا حال تھا اور اس کے ضروری کام ختم ہی نہیں ہو رہے تھے آخر جب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے کے قریب ہو گیا تو وہ آ کر میرے قریب بیٹھ گیا اور اس نے گھونگھٹ اٹھایا۔

''ارے! میں تو سمجھا تھا لارا دیتہ ہو گی مگر یہاں تو کیٹ ونسلیٹ نکلی۔'' اس کی شوخ آواز آئی۔

''حالانکہ سلطان راہی کو ملنی تو لارا دیتہ ہی چاہیے تھی۔'' میں کہاں چپ رہنے والی تھی۔

''ہاں اب لگ رہی ہو ناں! میری بیوی۔'' اور میری بیوی اس نے اس استحقاق سے بوجھل لہجے میں کہا کہ میری پلکیں بوجھل ہو کر جھک گئیں۔

''ارے! تمہیں یہ انداز بھی آتے ہیں باخدا! قلمازیہ کی تمام پرانی ہیروئنز یاد آ گئیں۔'' اس کی ٹیون پھر بدل گئی۔

''مگر تمہیں دیکھ کر ایک ہی اداکار کا خیال آتا ہے رنگیلے کا۔'' ٹیون اس کی بدلی تو میرا بھی انداز بدل گیا۔ اور وہ بے ساختہ ہنستے ہوئے میرے سامنے بیڈ پر لیٹ گیا۔

''واہ! مزا آ گیا کیا جواب ہے۔'' وہ ہنسے چلا جا رہا تھا میرے بھی لبوں پر مسکراہٹ آ گئی اچانک وہ اٹھ بیٹھا۔

''چلو! فضول باتیں بہت ہو گئیں اب کچھ کام کی باتیں کر لیتے ہیں۔'' اس کا لہجہ پھر بوجھل ہونے لگا میں چپ رہی کیونکہ یہ تو مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس بندے کا سیریس رہنا ناممکن ممکنات میں سے ہے۔

''کتنا ظلم کرتے ہیں ناں! یہ مشرقی لوگ دلہن پر کتنا لاد دیتے ہیں اور اسٹیچو کی مانند بٹھا دیتے ہیں اب دیکھو تم پر بھی کتنا لادا ہوا ہے بالکل بکری لگ رہی ہو۔

بقرعید کے لیے سجائی گئی بکری۔'' اس کا بوجھل لہجہ آخر میں مائل بہ شرارت ہو گیا۔

''تم خود بکرے لگ رہے ہو۔'' مجھے ایک دم سے تپ چڑھی۔

''آخر بکری کے مجازی خدا کو بکرا ہی ہونا ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا اور میں اس کے اور اپنے رشتے کا خیال کیے بغیر دونوں ہاتھوں کے ناخن اٹھا کر اس پر چڑھ دوڑی تب ہی اس نے میرے بائیں ہاتھ کو پکڑ کر ہلکا سا جھٹکا دیا تو میں اس کے سینے سے جا لگی میرے اندر ڈھیروں شرم اتر آئی اور میں نے چہرہ اس کے سینے میں چھپا لیا اور اس نے مجھے سمیٹ لیا۔

اب جب ہماری شب زفاف ایسی تھی تو باقی زندگی کیسی ہوئی تھی یہ تو ظاہر تھا۔

☆......☆......☆

ماہیر نے مجھے وائٹ گولڈ اور گولڈ کا لاکٹ سیٹ دیا تھا۔ لاکٹ اور ٹاپس میں درمیان میں نسبتاً بڑے اور درمیان میں چھوٹے ڈائمنڈز لگے ہوئے تھے۔

سویرا کو مونی بھائی نے بریسلیٹ دیا تھا گولڈ کا بھاری بریسلیٹ جن میں زنجیروں سے بال لٹک رہے تھے اور ان میں زرقون لگے ہوئے تھے سویرا نے میرا سیٹ دیکھا تو پھر گلہ اس کے لبوں پر اتر آیا۔

''ہاں بھئی اپنی اپنی قسمت ہے تمہاری تو ہر چیز شاندار ہے۔'' اور اس بار میں رہ نہ سکی۔

''سویرا! کیا ہمارے رشتے میں جیلسی کی کہیں گنجائش ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''یہ جیلسی نہیں ہے۔'' اس نے اپنا دفاع کیا۔

''تو پھر کیا ہے؟ پہلے بھی کبھی تمہاری چیز مجھ سے اچھی ہوتی تھی کبھی میری تم سے مگر ہم ایک دوسرے کی چیزوں کی کھلے دل سے تعریف کرتے تھے۔ کبھی تقابل نہیں کیا۔ ہمارے درمیان کبھی حسد کا رشتہ نہیں رہا۔

پھر اب مجھے ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے کہ کہیں کچھ غلط ہے سویرا! رشک اور حسد میں بڑی باریک سی لکیر ہے کبھی اس لکیر کو کراس مت کرنا صرف دلوں میں بسنا مشکل ہے دلوں سے نکلنا بالکل نہیں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''تمہیں برا لگا سوری۔'' اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''نہیں سویرا! برا نہیں لگا میں نے تمہیں ہمیشہ

اپنی کزن سے زیادہ بہن سمجھا ہے۔ اس لیے تمہیں سمجھا دیا ورنہ دل میں بغض پال کر بیٹھ جاتی۔'' میں نے اسے گلے سے لگالیا۔

انہی دنوں میڈیا پر چار سالہ معصوم بچی کے ساتھ اس کے بہنوئی کی زیادتی کی خبر گرم تھی۔ اس ظالم شخص نے زیادتی کے بعد اسے دوسری منزل سے نیچے پھینک دیا تھا جس سے اس کا ہاتھ اور پیر ٹوٹ گئے تھے آنکھ ضائع ہوگئی تھی۔ اور اندرونی نظام تو الگ ہی تباہ ہوگیا تھا۔

میں نے سنا تو میری حالت بری ہوگئی ایک چار سالہ بچی اور اتنا ظلم...... میں کتنا روئی تھی اس خبر پر اور میں سویرا سے جب بھی اس خبر پر بات کرنے کی کوشش کرتی سویرا بات بدل دیتی۔ مجھے لگتا سویرا بات نہیں بدلتی وہ خود بدل رہی ہے۔

اس دن میں تفصیلات دیکھ رہی تھی کہ وہ آ گئی۔

''ارے! بھئی یہ کیا لگایا ہوا ہے۔ میرا فیورٹ ڈرامہ آنے والا ہے۔'' اس نے ریموٹ میرے ہاتھ سے لے کر کہا۔

''سویرا! یہ تم ہو اس ایشو کو چھوڑ کر ڈرامہ دیکھنا چاہ رہی ہو۔'' میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''ہاں تو کیا میری پوری قسطیں چل رہی ہیں اور کل تو بہت Exiitng Situation پر ختم ہوا تھا۔'' اس کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا۔

''سویرا! کیا میں اسی سویرا سے مخاطب ہوں جسے میں بچپن سے جانتی ہوں جو میری طرح تمام Living Being سے محبت کرتی تھی۔ اور ان کے دکھ درد پر تڑپ اٹھتی تھی۔ اور آج وہی لڑکی حقیقت کی تلخیوں سے نظر چرا کر ڈراموں کی دنیا میں کھوئی رہتی ہے۔

انٹرنیٹ پر نہ جانے کیا الم غلم دیکھنے میں مصروف رہتی ہے۔ میڈیا کچھ زیادہ ہی ایڈوانس ہوتا جارہا ہے۔ اب تو فیملی کے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے ہوئے گھبراہٹ سی محسوس ہونے لگی ہے۔ میں نے اُسے ٹوکتے ہوئے اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔

''ہاں! تو ہمارے گھر والے تو سیدھے کے سیدھے تھے ہمیں کچھ سکھایا ہی نہیں۔ اب اس جنجال پورے میں رہنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو سیکھنا ہی پڑے گا۔'' اس نے نخوت سے کہا۔

''سویرا! کچھ تو خدا کا خوف کرو تم اس گھر کو جنجال پورہ کہہ رہی ہو جتنا سکون اس گھر میں ہے کہیں نہیں ہے کسی کو بھی ہمارے گھروں کی طرح چیخ چلا کر بات کرنے کی عادت نہیں ہے۔ اخلاق، تمیز، رواداری، شرافت اس گھر پر ختم ہے۔'' میں نے اس کے سلونے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''گھنا پن کہو میری جان گھنا پن، ہنہ تمیز، رواداری، شرافت ہی گھنے کیا کم ہیں کہ اس پر دو عدد نندیں مع اہل وعیال ہر وقت یہاں پڑی رہتی ہیں۔'' اس مبالغے پر میں نے تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھا تو بی اور نازی آپی دونوں پندرہ دن میں ایک بار میکے آتی تھیں۔

ہاں دونوں آتی ساتھ تھیں تو بی آپی کے دو بچے جبکہ نازی آپی کی ایک ہی بیٹی تھی۔ ان کے شوہر دروازے پر صبح چھوڑ کر جاتے تھے اور رات کو لینے آتے تھے۔ دونوں کے بچے انتہائی تمیز دار تھے نانی کے گھر آ کر آپے سے باہر نہیں ہوتے تھے۔

''بس تم ہی آنکھیں بند کر کے اُن کی آرتی اتارتی رہو۔'' اس کی سوچ ہی نہیں الفاظ بھی انڈین فلموں سے متاثر تھے۔

''نازی آپی اور تائی آپی کو تو چھوڑو بس اس عورت کا سوچنا جس پر تم ہر دوسرے دن بطور نند جا کر پڑ جاتی ہو۔'' مجھے بھی غصہ آ گیا ایک تو مجھے اس بچی کا ہی بڑا غم تھا اوپر سے کوئی غم بٹانے والا نہیں۔

''خدا! میرے ماں باپ کو سلامت رکھے میں تو ایسے ہی جاؤں گی۔'' اس نے چڑ کر کہا۔

''خدا! سب کے ماں باپ اور ان کے مان کو سلامت رکھے۔

مگر تم جیسے لوگ آسان ہدف ہوتے ہیں میری ماں اور میری چچی جیسی عورتوں کا۔'' میں یہ بات کافی عرصے سے محسوس کر رہی تھی کہ امی اور چچی کی مجھ سے مایوس ہو کر سویرا کے ساتھ نشستیں طویل ہونے لگی ہیں۔

''تم تو مشکل ہدف ہونا تو خوش ہو جاؤ۔ تمہیں آتا ہی کمال ہے؟ اپنی تائی کی طرح سوائے چرب زبانی کے، تمہیں تو یہ بھی نہیں پتا کہ میرا تم سے رشتہ کیا ہے تمہارا جب دل چاہتا ہے میری ماں بن کر میرے سر پر سوار ہو جاتی ہو۔'' اور اس کے ساتھ ہی اس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا گھر کے سب افراد گھبرا کر باہر نکل آئے تایا ابو، تائی امی مونی بھائی اور موہی......

''کیا ہوا؟'' تائی امی کے چہرے پر گھبراہٹ تھی ان کے گھر کے در و دیوار نے اتنی بلند آواز کبھی نہیں سنی تھی۔

''ہونا کیا ہے؟ آپ کی لاڈلی کو کسی رشتے کا لحاظ ہی نہیں ہے۔ جب دیکھو منہ کو آتی ہے اس سے کہیں کہ مجھ سے سوری کرے۔ اس نے میری پوزیشن آکورڈ کر دی تھی۔''

''تمہیں اگر میری بات سے تکلیف پہنچی ہے تو میں......'' میں نے رفع شر کے لیے سوری کرنا چاہا مگر مونی بھائی نے مجھے درمیان میں روک دیا۔

''شیزا! کوئی ضرورت نہیں ہے سوری کرنے کی، یہ اس گھر کی بڑی نہیں ہے ابھی بڑے بیٹھے ہیں فیصلہ کرنے کے لیے اور سویرا! تم جن چکروں میں روزانہ یہ ڈرامے Create کر رہی ہو اس ہدف کو کبھی نہیں پاسکو گی چاہے کچھ کر لو۔'' انہوں نے سخت لہجے میں کہا۔

''کوئی مجھے بھی بتائے گا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔'' تایا ابو نے غصے سے کہا۔

''ضرور ابو! آپ کی بڑی بہو صاحبہ کو الگ گھر چاہیے۔ یہ ڈرامے اس ہدف کے حصول کا ذریعہ ہیں۔'' مونی بھائی نے کہا تو تائی امی نے بے ساختہ سویرا کو دیکھا۔

''ڈرامے کرنے کی بھی مونی آپ نے خوب کہی میں ایسا کروں گی کہ آپ کو میری خواہش پوری کرتے ہی بنے گی۔'' سویرا نے مونی بھائی کو دھمکی دی۔

''دیکھتے ہیں۔'' مونی بھائی نے بے نیازی دکھائی۔

''مونی! اوپر کا پورشن ٹھیک کروا کر تم دونوں وہاں منتقل ہو جاؤ۔'' تایا ابو نے کہا۔

''نہیں ابو! ہم یہیں رہیں گے رشتے ضدوں سے نہیں چلتے اور نہ ہی ضدوں سے مشروط و مضبوط ہوتے ہیں اگر ایسا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ ٹوٹ جاتے ہیں۔'' مونی بھائی نے بے لچک لہجے میں کہا۔

''تو بیٹا! یہ بات تم کیوں نہیں سمجھ لیتے۔'' تائی امی نے گفتگو میں پہلی بار حصہ لیا۔

''امی! آپ شروع سے جانتی ہیں کہ مجھے صرف محبت رام کر سکتی ہے۔ ضدیں میرے اندر بھی ضد بھر دیتی ہیں۔'' مونی بھائی نے کہا اور پھر

تایا ابو تائی امی نے مونی بھائی کو کافی سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر انہوں نے ایک نہ سنی اور سویرا اپنے میکے جا بیٹھی۔

اس دن میں بہت روئی ایک تو بچی والا معاملہ اور دوسرے ہمارے گھر کا ایشو' موہی مجھ سے بہت محبت کرتا تھا مگر اس کا نان سیریس رویہ عام طور پر تو وہ جیسا بھی تھا۔ مگر تنہائی میں تو اس کا مسخرہ پن عروج پر ہوتا تھا ایسے میں۔ میں اس سے کیا شیئر کرتی مگر وہ میرے آنسو دیکھ کر تڑپ اٹھا۔

''شیزا! میں اس گھر میں تمہیں آنسو بہانے کے لیے نہیں لایا بتاؤ کیا بات ہے۔'' اس نے پوچھا اور مجھے تو کاندھا چاہیے تھا۔ میں بکھرتی چلی گئی اور وہ مجھے سمیٹتا رہا۔

''یہی ادا تو بھائی تھی مجھے تمہاری...... تمہاری نرم دلی اور تمہاری فطرت کی نیکی۔'' وہ آہستگی سے میرے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔

''جبکہ تم تو انتہائی ظالم رہے ہو۔'' میں نے گلہ کیا۔

''صرف تمہیں دکھانے کے لیے یا پھر بچپن میں ورنہ ایئر گن سے تو میں نے کبھی مکھی اور مچھر بھی نہیں مارا۔'' اس نے مجھے گدگدایا پھر وہ اس بچی سے مجھے ہاسپٹل میں ملوا کر لایا۔

☆......☆......☆

سویرا کے میکے بیٹھنے سے امی اور چچی بہت خوش تھیں اور میں امی سے ناراض تایا ابو اور تائی امی سویرا کو لینے جانا چاہتے تھے۔ مگر مونی بھائی نے سختی سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس معاملے کو خود ہینڈل کر لیں گے اس سلسلے میں تو میں خود بھی بہت پریشان تھی موہی سے کہتی تو وہ کہتے کہ......

''جب بھائی کہہ رہے ہیں کہ وہ ہینڈل کر لیں تو وہ کر لیں گے۔'' اس کا اطمینان قابلِ دید تھا۔

ان دنوں میں نے تجزیہ کیا تو جانا کہ واقعی کسی کو جاننے کے لیے اس کے ساتھ رہنا بسنا بہت ضروری ہے کہ وہ موہی جو کہ کبھی مجھے چنگیز خان سے کم نظر نہیں آیا وہ کتنا نیک فطرت اور نرم مزاج ہے اور وہ سویرا جو کہ کتنی گھل مل کر رہنے والی لڑکی لگتی تھی اور جو دوسروں کے دکھوں پر میرے ساتھ روتی تھی۔ وہ بالکل الگ فطرت نکلی وہ آج دنیاوی دکھوں کو For Granted لینے لگی تھی۔

میں امی کی طرف پچھلے پورے ہفتے سے نہیں گئی تھی کہ امی خود آ گئیں۔

''سچ کہا ہے کسی نے بیٹی شادی کے بعد پرائی ہو جاتی ہے۔'' وہ آتے ہی شروع ہو گئیں۔

''ہاں تو اس میں غلط کیا ہے؟ اور مبارک ہو آپ کو امی آپ نے اپنا ٹارگٹ گین کر لیا ہے۔'' میں نے سرد مہری سے کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' انہوں نے تیوری چڑھا کر کہا۔

''مطلب یہ ہے کہ جس کی زندگی سے آپ کھیل رہی ہیں وہ آپ کی سگی بھانجی ہے اور اس کا اثر میری زندگی پر بھی پڑ سکتا ہے۔'' میں نے بغیر لاگ و لپیٹ کر کہا۔

''کیوں کچھ کہا ہے بھابی نے؟'' انہوں نے تیوری مزید چڑھا کر کہا۔

''خدا کا شکر ہے میری ساس، سسر، نندیں، جیٹھ اور شوہر بہت نیک فطرت لوگ ہیں اور آپ تو بخوبی واقف ہیں ان کی فطرت سے۔'' میں نے تاک کر نشانہ لگایا اور امی خاموش ہو گئیں۔

پھر امی ہی کی زبانی پتا چلا کہ خالو سویرا کو بٹھانے کے حق میں نہیں تھے۔ مگر خالہ نے ان کی ایک نہ مانی تو اس پر خالو نے کہا کہ......

''رکھنا ہے تو رکھو۔ مگر مجھ سے کسی جانبداری کی امید مت رکھنا غلطی جس کی ہوگی اسے جھکنا پڑے گا اور غیر مشروط۔''

تب سے بھائی اور بھاوج کا رویہ سویرا کے ساتھ برا تھا اور بہت بری طرح سے وہاں رہ رہی تھی۔ مونی بھائی جھکنے کو تیار نہیں تھے۔ تب ہی میرے زور دینے پر ابو نے خاندان کے بڑوں کو بٹھایا۔ وہاں تمام باتیں سننے کے بعد خالو جان نے کہا کہ......

''ٹھیک ہے تمہیں الگ ہونا ہے تو پہلے تمہاری بھاوج کو یہ حق ملنا چاہیے کیونکہ وہ پانچ سال سے ہمارے ساتھ ہے۔ پہلے یہ الگ ہو جائے پھر تم بھی ہو جانا۔'' اور خالہ اور سویرا ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگیں۔ یوں بالکل غیر مشروط طور پر سویرا کی واپسی ہوگئی اور شریکوں کے ہاں سوگ پڑ گیا۔

☆......☆......☆

سویرا کی واپسی کے بعد میں نے خود کو محدود کر لیا وہ بے تکلفی جو ہمارا خاصا تھی اسے ختم کر دیا۔ اور یہ اسی صورت ممکن تھا جب میں اسے سویرا کہنا چھوڑتی۔ اور میں نے جب پہلی بار اسے بھابی کہا تو وہ چونکی۔

''آپ دن بدن منمی نہیں بنتی جا رہی ہیں۔'' اس نے چبا چبا کر طنز سے کہا۔ یہ آج کل اس کا انداز ہوتا جا رہا تھا۔

''منمی نہیں، تم نے اس دن مجھے باور کروا دیا تھا کہ تم میری دوست سویرا نہیں میری جٹھانی سویرا ہو۔'' میں نے کہا تو اس کے چہرے پر شرمندگی جھلکنے لگی۔

''شیزا! پتا نہیں مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ میری خود سمجھ نہیں آتا کہ معمولی باتوں پر میرے اندر کیوں الاؤ بھڑکنے لگتے ہیں۔'' وہ بے طرح شرمندہ تھی۔

''اس کی وجہ ہے کہ اپنے ذاتی معاملات کو دوسروں کی نظر سے دیکھو گی تو یہی ہوگا۔ میں نے کہیں پڑھا یا سُنا تھا کہ دیہاتوں میں گھر کچے ہوتے ہیں ان میں سوراخ ہو جاتے ہیں جن سے سانپ گھروں میں آ جاتے ہیں تو گھر کچے بھی ہو سکتے ہیں۔ ان میں سوراخ بھی ہو سکتے ہیں مگر باہر کے سانپوں کو اِن کا پتا نہیں چلنا چاہیے۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔

''ہاں میں کوشش کروں گی۔'' اس نے کہا۔

☆......☆......☆

پہلا رمضان ہمارا اس گھر میں پانچ ماہ بعد آیا اور اس رمضان میں 18 اکتوبر کا وہ خوفناک زلزلہ آیا جس نے 18 دیہات صفحۂ ہستی سے ہی مٹا دیے اور کتنے ہی علاقے کھنڈر کر دیے ان دنوں میں اور سویرا ہم دونوں ہی پریگنیٹ تھے۔ ان دنوں کی جذباتی کیفیت ہی مختلف ہوتی ہے اور اوپر سے یہ امتحان، آزمائش یا عذاب......

میری حالت بری ہونا شروع ہوگئی۔ ڈاکٹرز نے میری کمزوری کے باعث یوں بھی مجھے ٹینشن فری رہنے کو کہا تھا۔ مگر ٹی وی پر ایسے ایسے مناظر دکھائے جاتے کہ میں بامشکل ہی اپنے جذبات پر قابو پاتی تھی۔

موہی مجھے ٹی وی دیکھتے ہوئے دیکھتے تو فوراً ٹی وی بند کر دیا کرتے تھے۔ میرے رونے پر انہوں نے کہا کہ ''رو کر ہم انہیں کیا فائدہ پہنچا رہے ہیں ان کے لیے وہ کرو جو فائدہ مند ہو۔''

اور بات میری سمجھ میں آ گئی۔
میں نے اپنی پوری سلامی تمام سیونگ اُٹھا کر زلزلہ زدگان کو دے دی۔ اپنے کمبل، رضائیاں، سوٹ، دوائیں، پانی، جوسز، دودھ اور بسکٹ کے ڈبے، تائی امی نے جہیز کی چیزیں دینے پر کہا تھا کہ "بیٹا! گھر میں بہت کچھ ہے جہیز میں سے مت دو جہیز لڑکی کو بہت پیارا ہوتا ہے اور تمہاری امی کو بھی برا لگے گا۔"
"مگر امی! قربانی تو وہی ہوتی ہے جو اپنی عزیز چیز کی دی جائے۔" میں نے کہا تو وہ مسکرا دیں اور انہوں نے میری پیشانی پر پیار کیا۔
"تم ہمارے گھر کے لیے رب کا انعام ہو۔" انہوں نے محبت سے کہا تو میں مسکرا دی۔ امی کو پتا لگا تو وہ غصے میں آ گئیں۔
"تمہاری تائی نے دلوائی ہیں نا یہ چیزیں۔" انہوں نے غصے سے کہا۔
"نہیں انہوں نے منع کیا تھا۔" میں یہ کہتے کہتے رہ گئی کہ وہ بھی آپ کی فطرت سے واقف ہیں۔
"ڈالتی رہو پردے ایک دن پچھتاؤ گی۔" انہوں نے مجھے ڈرایا۔
"یقین مانیں امی! ایسا نہیں ہوگا۔" اور میرا دل کہہ رہا تھا کہ اگر ایسا ہوا بھی تو کم از کم آپ کے پاس نہیں آؤں گی۔ امی "ہونہہ" کہہ کر چلی گئیں۔ وہ عید بھی بس یونہی تھی حالانکہ شادی کے بعد پہلی عید تھی۔

☆......☆......☆

پورے ایک سال بعد سویرا کے ہاں بیٹی نے جنم لیا جس کا نام اس نے نویرا رکھا اور اس کے ڈیڑھ ماہ بعد میرے گھر جڑواں بیٹوں نے جنم لیا۔ جن کے نام تائی امی اور تایا ابو کی پسند سے شہیر اور سمیر رکھے گئے اور سویرا کو اس پر بھی اعتراض تھا بقول اس کے "خدا! کچھ لوگوں کو بے سبب نوازے چلا جاتا ہے۔" اور میں نے اس تبصرے پر کچھ نہیں کہا اس ناشکرے کو کچھ کیا کہنا! جو خدا سے شکوے پر اتر آئے۔ جو نعمتوں پر شکر بجائے حساب کتاب کرے۔ خدا نے اسے اولاد سے نوازا تھا تو بجائے اس کا شکر بجا لانے کے وہ لڑکا نہ ہونے پر ناشکرا پن کر رہی تھی۔
موحد آئے تو بہت خوش تھے خوشی ان کے چہرے ان کے ہر انداز سے چھلک رہی تھی میں انہیں دیکھے گئی اور انہوں نے محسوس کر لیا۔
"کیوں کیا نظر لگانے کا ارادہ ہے۔" اس نے شوخی سے مجھے دیکھا۔
"وہاں مصطفیٰ قریشی کو صرف روبینہ قریشی کی ہی نظر لگ سکتی ہے۔" میں نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔
"واہ! بیوی مزہ آ گیا آج بہت دنوں بعد فارم میں آئی ہو۔" اس نے خوشدلی سے کہا۔
"ہاں تو کیا کروں شادی کو یونہی تو بور کے لڈو نہیں کہا گیا۔" میں نے کہا۔
"یعنی تم ہمارے گھر میں ناخوش ہو، میرے ساتھ۔" وہ ایکدم سنجیدہ ہو گیا۔
"ارے مسٹر موراتیلی جنٹ! یہ میں نے کب کہا تمہارے ساتھ تو میں اتنی خوش ہوں جس کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا اصل میں شادی کے بعد ہماری زندگیوں سے غیر متعلقہ افراد کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے آگ لگا کر تماشہ دیکھنے والوں کی ہاتھ تاپنے والوں کی اور وجہ کچھ نہیں ہوتی۔ محض کہانی میں مصالحہ ڈالنا اور چٹخارے لینا۔" میں نے کہا تو اس کے چہرے کی مسکراہٹ بحال ہو گئی۔

’’ہاں کہ تو تم درست رہی ہو۔ اس کے علاوہ بے فکرا پن بھی ختم ہو جاتا ہے۔ ذمے داریاں بڑھ جاتی ہیں۔‘‘ اس نے میری بات کی تائید کی۔
ڈاکٹرز نے کہا تھا کہ میرے گھر پہلے بچے ٹوئنز ہوئے ہیں اس لیے آئندہ بھی ٹوئنز کی امید ہے اور موہی مجھے چھیڑتا۔
’’مجھے تو ویسے بھی کرکٹ ٹیم بنانی ہے اور یہاں تو چھ مرتبہ میں ہی With Extra پوری ٹیم تیار ہوگی۔‘‘ بچوں کے آتے ہی اس کی شوخیاں ایک بار پھر عروج پر تھیں۔
’’منہ دھو رکھو کم بچے خوشحال گھرانہ۔‘‘ میں نے اسے منہ چڑایا۔
’’مجھے بد حال گھرانہ منظور ہے بارہ بچوں کے ساتھ۔ سوچو کیا مزیدار سین ہوگا آگے آگے والدہ محترمہ اور پیچھے چوزوں کی طرح بارہ بچوں کی لائن۔‘‘ میں اس کی کھینچی ہوئی تصویر پر خود بھی ہنس پڑی۔
سویرا کے ہاں اگلے ہی سال بیٹے نے جنم لیا تو بھی وہ خوش نہیں تھی۔
’’گیپ نہیں آسکتا تھا ابھی تو نوریا ہی نہیں سنبھلتی۔‘‘ اور میں نے سوچا انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا بیٹے کا نام اس نے ارحم رکھا۔
میں کیونکہ جہاں تک ممکن ہوتا خود فیڈ کرواتی تھی۔ اور خود فیڈ کروانے سے قدرتی طور پر بچوں میں گیپ آجاتا ہے سو میں بچی ہوئی تھی اور سویرا کو خود فیڈ کروانا چھچھور پن لگتا تھا سو وہ پھنس گئی اور فیڈ نہ کروانے کی وجہ سے وہ پھیل بھی خوب گئی تھی۔

☆......☆......☆

شہیر اور سمیر کے تین سال بعد میرے گھر میں ایک ننھی پری نے جنم لیا اور موہی نے ٹھنک کر کہا۔
’’یار! کتنے جھوٹے ہوتے ہیں یہ ڈاکٹرز کہا تھا اب ہر بار ٹوئنز ہی ہوں گے میری گڑیا اکیلے آتے کتنا ڈری ہوگی۔‘‘ موہی کے مسخرے پن کا اب بھی وہی حال تھا۔
’’انہوں نے امکان ظاہر کیا تھا اسٹامپ پیپر پر لکھ کر نہیں دیا تھا۔‘‘ میں نے ہنس کر کہا۔
’’پھر بھی مجھے ایک گڑیا اور چاہیے گڈوں کا تو جوڑ ہے گڑیا کا بھی جوڑ ہونا چاہیے۔‘‘ اور میں طمانیت سے مسکرادی۔
بیٹی کا نام ہم نے علیزے رکھا اب تو وہ بھی سال بھر کی تھی۔ وقت کافی گزر چکا تھا اس عرصے میں کئی واقعات ایسے ہوئے جنہوں نے رُلا دیا۔
ساتھ ساتھ غربت اور مہنگائی کا عفریت قتل و غارت گری عام، بم دھماکے، خودکش حملے، اسلام کے نام پر ایسی سختیاں کے لوگ مذہب سے بھاگنے لگیں۔
’’لوگ بھوک سے تنگ آکر اپنے جگر گوشوں کو سر بازار نیلام کرنے آگئے۔‘‘
’’بھوک سے بے قابو ہوکر ماں باپ اولاد سمیت خودکشی پر مجبور۔‘‘
’’نرس کے ساتھ ڈاکٹر اور وارڈ بوائز کی زیادتی مجروح نرس نے چوتھی منزل سے چھلانگ لگادی۔‘‘
اور اس نرس کی حالت دیکھ کر میرے آنسو نہ رکتے تھے یا خدا! کیا اب اپنے گھر کی کفالت کرنا بھی جرم ہوگیا۔ وہ عورت کہاں جائے؟ جس کے گھر میں کوئی مرد نہ ہو لیکن کچھ نہ ہوا۔ نہ زمین لرزی نہ آسمان گرا سب کچھ پھر رواں دواں ہوگیا جیسے کہ یہ سب کچھ ایسے ہی ہونا تھا اور ایسے ہی ہوگا۔

☆......☆......☆

ہماری شادی کو پانچ سال ہو چکے تھے موہی اب بھی ویسا ہی تھا۔ میں اپنا ہر دکھ اس کے کاندھوں پر سر رکھ کر کہہ دیتی تھی۔ جہاں ممکن ہوتا وہاں وہ مجھے لے جاتا ورنہ دلاسے سے کام چلالیتا۔

رمضان المبارک شروع ہو چکا تھا۔ آدھے سے زیادہ ملک سیلاب کی لپیٹ میں تھا۔ دل یوں بھی اپنوں کے لیے اُداس تھا۔ تائی امی بھی افسردہ تھیں۔ ہم لوگوں نے کافی کچھ سیلاب زدگان کو دیا تھا۔ تائی امی کہہ رہی تھیں۔

''اب تو رمضان بھی سکون سے نہیں گزرتے ہر بار کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے کبھی زلزلہ' کبھی سیلاب' کبھی دہشت گردی' کبھی اور کچھ نہیں تو زلزلے کے جھٹکے' کہیں خدا ہم سے ناراض تو نہیں ہے۔''

اور میں نے پہلی بار امتحان اور آزمائش سے ہٹ کر سوچا کہ واقعی یہ اعمال اور عذاب تو نہیں ہے ورنہ ہر کوتاہ نظر انسان کی طرح میں بھی اپنی کوتاہیوں کو بھول کر ہر بات کو آزمائش اور امتحان بنا دیتی تھی۔ خدا ہم سے آزمائش اور امتحان کیوں لے گا ہم کون سے ایسے مقرب اور فرمانبردار بندے ہیں جن کے ایمان کی مضبوطی دیکھنے کے لیے وہ ہم پر امتحان و آزمائش ڈالے اور ہم میں سے جو بچے ہوئے ہیں اس کی وجہ بھی پتہ نہیں کون ہے ہم تو نہیں ہو سکتے۔

☆......☆......☆

اس دن چوتھا روزہ تھا۔ موئی بھائی عصر کے بعد ٹی وی لگا کر بیٹھ گئے انہیں نیوز چینل سے شغف تھا۔ اس وقت وہ 'GEO' لگائے بیٹھے تھے۔ میں اور سویرا کچن میں مصروف تھے۔ تائی امی فروٹ چاٹ بنا رہی تھیں۔ اور پانچوں بچے ان کے گرد مکھیوں کی مانند منڈلا رہے تھے۔ میں ان دنوں پریگنیٹ تھی حالانکہ میرا خیال تھا کہ یہ تین بہت ہیں مگر موہی کو ایک گڑیا اور چاہیے تھی اور تائی امی بھی انہی کا ساتھ دیتی تھیں۔

''کتنی معصوم سی خواہش ہے میرے بیٹے کی۔'' وہ ہنستے ہوئے کہتیں۔

''آپ کا بیٹا بھی تو بہت معصوم ہے۔'' میں بھی مسکرا دیتی۔

''بلاشک وشبہ۔'' موہی چراغ کے جن کی مانند حاضر......

''موہی! نویرا ہے ناں! علیزے کی جوڑی دار۔'' میں ٹھنک کر کہتی۔

''شیزا! سویرا بن سکی تمہاری جوڑی دار' کزن کزن ہوتا ہے اور بہن بھائی، بہن بھائی!'' وہ سنجیدگی سے کہتا۔

''وہ ایک الگ میٹر ہے موہی! دیورانی جٹھانی میں نہ چاہتے ہوئے بھی کلسل آ جاتی ہے اور اس کو بہکانے والے دوسرے عناصر تھے۔'' میں نے سویرا کا دفاع کیا بہرحال وہ میری اچھی دوست رہ چکی تھی۔

''اور وہ ننھی بچی تھی بہکاوے میں آ گئی۔ تم کچھ بھی کہو مجھے میری گڑیا کی بہن چاہیے سگی والی...... اور دوسری بات ابھی ہم ساتھ ہیں کل کا کیا پتہ؟ جو طوفان دب گیا ہے۔ وہ پھر کبھی بھی تو سر اٹھا سکتا ہے۔'' اس کی سنجیدگی برقرار تھی۔

روزے کا وقت قریب تھا روزے میں ہم سحری اور افطاری ڈائننگ ٹیبل کے بجائے نیچے دسترخوان بچھا کر کرتے تھے۔ نوری (میڈ) نے دسترخوان بچھا کر افطاری رکھی تو کھیاں دادی کے پاس سے دسترخوان پر آ گئیں۔

اور اسی وقت ٹی وی پر وہ سب نظر آیا کہ میری بے ساختہ چیخ نکل گئی۔

''موہی! موہی یہ دیکھیں یہ کیا ہے۔ روکیں اسے پلیز رکوائیں اسے پلیز۔'' میری حالت غیر ہونے لگی۔ ٹی وی اسکرین پر جو کچھ نظر آ رہا تھا۔ وہ مہذب دنیا کے باشندے کر ہی نہیں سکتے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا وحشی درندے دو انتہائی کم عمر لڑکوں کو ڈنڈوں سے بری طرح پیٹ رہے تھے۔ انہیں رسیوں سے باندھ کر زمین پر گھسیٹ رہے تھے۔ انہیں الٹا لٹکا کر مار رہے تھے۔ اور اس سارے عمل میں ایک تو ختم ہو گیا تھا اور دوسرا قریب الختم تھا۔ ان دنوں میری حالت کے پیش نظر مجھے ڈاکٹرز نے ٹینشن زدہ خبروں اور حالات سے دور رہنے کو کہا تھا کیونکہ میں شدید ویک تھی۔ تایا ابو نے ریموٹ لے کر ٹی وی آف کر دیا۔ سب میرے ہاتھ پاؤں سہلانے لگے، میں روزے کی حالت میں تھی اور روزہ بھی آخری لمحوں میں، اذان ہوتے ہی سب نے ایک ایک کھجور لے کر سب سے پہلے مجھے شربت وغیرہ پلایا میری حالت میں بہتری آئی تو سب نے افطار کیا۔

اور پھر یہ تو ابتدا تھی اس کے بعد تو ہر نیوز چینل پر یہی کچھ تھا ان مظلوم و معصوم و بے بس بھائیوں کی زندگی کے آخری تکلیف دہ لمحات، ان کے مجروح جسم اور لوگوں کی بے حسی اپنے اپنے موبائلز سے بے فکری سے مووی بناتے لوگ جیسے یہ سب کسی انسان نہیں جانور، کتے، بلی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اور لوگ تو جانوروں پر بھی ظلم نہیں دیکھ پاتے اگر انسان ہوں تو مگر وہاں کون انسان تھا سب درندے تھے خونخوار بھیڑیے۔

اور میری نمازیں اور دعائیں طویل ہو گئیں نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہی ان بچوں کی بے بسی پر میرے آنسو گرنے لگتے۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ میرے دل کو کوئی مٹھی میں دبا کر رکھتا ہے۔ میرا دل لبریز ہو جاتا تھا اور میرے آنسوؤں کو بے قابو کر دیتا تھا۔ اس ماں کو سوچ کر کہ شدت غم سے جس کے آنسو منجمد ہو گئے تھے۔ جس کی دونوں نرینہ اولادوں کو ان درندوں نے درندگی سے مار ڈالا۔ اس باپ کو سوچ کر میرا دل شق ہونے لگتا تھا کہ یہ بتاتے ہوئے کہ غسل دیتے وقت اس کی حالت ناقابل بیان تھی جو شدت غم سے رو پڑا تھا۔

اس دن بھی میں ٹی وی لگا کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس وقت میں رو نہیں رہی تھی مگر آنکھوں میں نمی تھی۔ مذاکرے ہو رہے تھے۔ لوگ اس وحشیانہ حرکت کے خلاف دلائل دے رہے تھے۔ میری نظریں اسکرین پر اور ذہن وہیں پہنچا ہوا تھا۔ ٹی وی پر دکھائی جانے والی ان کی مختلف اوقات میں کھینچی جانے والی مختلف تصاویر میں سب سے نمایاں چیز جو تھی وہ ان کے چہروں کی معصومیت اور بھولپن تھا تب ہی سویرا آئی اور آتے ہی برس پڑی۔

''شیزا! یہ کیا نحوست پھیلا رکھی ہے ریموٹ دو مجھے۔ ذرا چینج کے دکھا دیکھنا ہے۔''

''سویرا! اس خبر کی موجودگی میں تمہارا دل چاہ رہا ہے اسٹار پلس دیکھنے کو اور وہ بھی رمضان میں اتنا واہیات پروگرام۔'' میرے اندر دکھ کی لہر سی اٹھی۔

''اوہو! اس وقت روزہ تھوڑی ہے پورے دن دیکھتے ہیں تمہارے نیوز چینل اور مائنڈ اٹ ڈاکوؤں کو ایسا ہی انجام ہونا چاہیے تاکہ عبرت حاصل ہو۔'' اس نے سخت دلی سے کہا۔

''ایک بات تو یہ ہے کہ وہ ڈاکو نہیں تھے یہ ثابت ہو چکا ہے اور فرض کر لیا جائے کہ وہ ڈاکو تھے تب بھی کسی کو حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی کو

اتنے بہیمانہ طریقے سے جان سے مارے۔ اور ایک بات سویرا! تمہارے اندر سے تمہاری فطری نرم دلی اور رحم دلی مفقود ہوتی جارہی ہے۔ اور سخت دلی بڑھتی جارہی ہے توبہ کا در بند نہیں ہوا ہے سویرا! خدا سے اپنے لیے نرمی مانگ لو مجھے ڈر لگنے لگا ہے تم سے۔'' میں خوفزدہ سی بولتی چلی گئی۔

''سخت دلی ماحول کی عطا کردہ ہوتی ہے شیزا! جیسے گھٹے ہوئے ماحول میں ہم رہ رہے ہیں وہاں دل کو سخت ہونا ہی ہے۔ تمہارا تو چلو شوہر تو تمہارا ہے۔ یہاں تو یہ بھی نہیں ہے۔'' وہ بے دلی سے بولی۔

''مجھے اپنے ساتھ شامل مت کرو سویرا! خدا کا شکر ہے بڑے اچھے گھر میں آئی ہوں۔ سب محبت کرنے والے اور خیال رکھنے والے ہیں۔ بہوؤں کو بیٹیاں سمجھنے والے۔ اور رہے مونی بھائی تو وہ ایک بات کے علاوہ ہر بات میں تمہارا فیور کرتے ہیں۔'' میں نے دوٹوک کہا۔

''ہونہہ!'' اس نے ہونہہ کہہ کر میرے ہاتھ سے ریموٹ لے کر اسٹار پلس لگا لیا اور میں وہاں سے اٹھ گئی۔

☆......☆......☆

اس دن کے بعد میں نے ٹی وی دیکھنا چھوڑ دیا۔ ہاں کسی کے بتانے پر یوٹیوب لگا کر میں اس دن بیٹھی ہوئی تھی۔ اور آخر میں جب انہیں الٹا لٹکا ہوا دکھا کر ان کے چہروں کے کلوز اپ دکھائے گئے تو میں نے اپنی برداشت کے قدموں پر سر رکھ دیا اور میں کی بورڈ پر سر لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی اس وقت مجھے اپنے کندھے پر دباؤ محسوس ہوا مجھے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

''شیزا! سنبھالو خود کو...... اس طرح سے خود کو اذیت دینے کا کوئی فائدہ ہے۔'' موہی نے ہولے سے کہا۔

''موہی! آپ ان معصوموں کے چہرے دیکھیں مکمل طور پر مسخ کردیے گئے ہیں۔ سوچیے موہی جب میرا یہ حال ہے تو ان کے ماں باپ کا کیا ہوا ہوگا؟'' میں سسکتے ہوئے بولی۔

''خدا ہے ناں! شیزا! صبر دینے والا وہ دے گا صبر بھی اور برداشت بھی۔'' اس نے دلاسہ دیا۔

''ان بچوں کے والدین کا تو نہیں پتہ موہی! کیا حال ہے مگر مجھے صبر نہیں آتا میرا دل کوئی مٹھی میں دبا کر رکھتا ہے۔'' میرے آنسو تواتر سے گر رہے تھے۔

''شیزا! اگر تم اسی طرح سے ٹینشن لو گی تو آنے والے پر کیا اثر پڑے گا'' انہوں نے مجھے سمجھایا۔

''موہی! آپ کو بھی اپنے ہی بچے کی فکر ہے وہ بھی تو کسی کے بچے تھے۔ موہی! جو دنیا میں نہیں آیا آپ کو اس کی فکر دامن گیر ہے کہ اسے کچھ نہ ہوجائے اور ان کا سوچیں جنہوں نے دنیا میں آ کر 16 اور 18 سال اپنے والدین کے ساتھ گزارے۔ کتنی اچھی اور پیاری یادیں ہوں گی ان کے ماں باپ کے پاس اور آخری تکلیف دہ یادیں۔ موہی! کیا ہم مسلمان ہیں کیا ہم مسلمان کہلانے کے لائق ہیں؟ موہی! جو مر رہے تھے وہ بھی مسلمان تھے اور جو مار رہے تھے وہ بھی مسلمان تھے مگر مارنے والے مرنے والوں کو ایسے مار رہے تھے جیسے وہ کسی اور مذہب کسی اور قوم کے باشندے ہوں جیسے فلسطین۔ جیسے کچھ عرصے پہلے بوسنیا وغیرہ میں یا اکثر انڈیا میں وحشیانہ سنگ دلانہ طریقوں سے مسلمانوں کو مارا جاتا ہے۔ بالکل ویسے بالکل ویسے۔'' میرے آنسوؤں میں

شدت آ گئی۔
"شیزا! تم کیا سمجھتی ہو ہمیں دکھ نہیں ہوتا۔ اگر ہم آنسو نہیں بہاتے تو ان حالات پر ہمارا دل نہیں روتا۔ اور شیزا! یہ تو واقعہ ہی ایسا ہے جس پر ہر صاحب دل رویا ہے۔ اور وجہ طریقہ قتل ہے اور مجھے پتہ ہے تمہاری بھی اتنی اذیت کی وجہ یہی ہے۔ اگر ان دونوں کو دو دو گولیاں مار دی جاتیں تو بھی تمہیں دکھ ضرور ہوتا کہ تم شروع سے نرم دل و رحمدل ہو لیکن ہر مسلمان کی طرح موت کے دن کے متعین ہونے پر یقین رکھتی ہو تو دکھ تو تمہیں ضرور ہوتا مگر اتنی اذیت میں تم نہ ہوتیں تمہاری اتنی اذیت کی وجہ ہی یہی ہے کہ جب ان کا مارنا طے تھا تو اتنی اذیت کیوں دی؟ مگر ہر بات کی طرح یہ بات بھی اوپر بہت پہلے سے طے ہوتی ہے کہ اس دن مرنا ہے اور اس طرح سے مرنا ہے۔ سو مالک کی رضا پر راضی رہنا ہمارا ایمان ہے۔" موہی نے آہستہ آہستہ سمجھایا اور میں حیرت سے اسے دیکھنے لگی کہ یہ شخص تو میرے اندر تک مجھے جانتا ہے اور واقعی میری اذیت کی وجہ یہی تھی۔
"موہی! ان حالات میں ہماری آئندہ نسل کا مستقبل کیا ہوگا؟" میں نے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے کہا۔
"خدا بہتر جانتا ہے شیزا! اور خدا سے ہی ہماری امیدیں خوش آئند ہیں۔ کیوں ہیں ناں!" انہوں نے میری طرف دیکھا اور میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

☆......☆......☆

اور ابھی آدھے ہی رمضان گزرے تھے کہ ایک اور نیوز آ گئی۔ "30 روپوں کی خاطر چار سگے بھائیوں کا قتل" اور میری روح تک لرز گئی۔
"یا اللہ! کیا ہو رہا ہے تیری دنیا میں ایک جان کی قیمت ساڑھے سات روپے لوگ کیسے مار ڈالتے ہیں کسی کو یہاں ٹیچر کسی بچے کو سزا بھی دیں تو وہ بچہ میرے ذہن سے نہیں ہٹتا حالانکہ نہ میں نے بچہ دیکھا ہوتا ہے نہ سزا۔ صرف بچوں کی زبانی سنا ہوتا ہے۔"
تائی امی کئی دن سے مجھ سے عید کی شاپنگ کے لیے کہہ رہی تھیں مگر میں ٹال رہی تھی۔ اس دن انہوں نے مجھے پکڑ لیا۔
"امی دل نہیں چاہ رہا۔" میں نے بے دلی سے کہا۔
"کیوں؟ کیوں نہیں چاہ رہا دل؟" انہوں نے پوچھا۔
"پتہ نہیں امی! عجیب سی بے کلی اور اداسی سی ہے حالات ایسے ہیں کہ دل ڈرا ڈرا سا رہنے لگا ہے۔" میں نے بتایا تو تائی امی نے میری طرف دیکھا۔
"اللہ سے مایوس ہو گئی ہو۔" انہوں نے میرے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔
"نہیں استغفر اللہ امی! قطعی نہیں ہاں مگر دنیا والوں سے۔" میں نے استہزائیہ کہا۔
"یہ بھی غلط ہے اگر دنیا قائم ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا ابھی اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہوئی۔" انہوں نے میری سوچ و فکر کو وسعت دی۔
"آپ کی بات بھی درست ہے دنیا اچھے لوگوں سے خالی ہوگئی تو قیامت برپا ہو جائے گی۔ مگر امی کیا قیامت کی ابتدا ہو نہیں چکی۔ پوری دنیا میں آئے دن کے زلزلے، سمندری طوفان، سیلاب، حادثے، قتل و غارت گری اور قیامت کیا ہوگی؟" میں نے تائی امی کی گود میں سر رکھ لیا۔

''یہ قیامت نہیں صرف جھٹکے ہیں جو خدا ہمیں بھلائی اور بہتری کے لیے دیتا ہے کہ اب بھی وقت ہے سدھر جاؤ۔ ورنہ میں نے دراز رسی کھینچی تو سب سرمہ ہو جاؤ گے۔'' تائی امی نے میرے ذہن کی ایک اور گرہ کھولی۔

''ہاں آپ ٹھیک کہتی ہیں۔'' میں نے ان کی بات مان لی۔

''تو پھر کب جاؤ گی شاپنگ کے لیے۔'' انہوں نے اپنا سوال دہرایا۔

''امی! میری طبیعت بھی خراب ہے اور دل بھی نہیں چاہ رہا موہی سے کہوں گی وہ لے آئیں گے۔ آپ کے ابو کے میرے اپنے اور بچوں کے یا آپ ساتھ چلی جایئے گا۔'' میں نے آپشن دیا۔

''ایک بات کہوں شیزا!'' تائی امی نے آہستہ سے کہا۔

''سو باتیں کہیے امی!'' میں نے بند آنکھوں سے کہا تائی امی جب بالوں میں انگلیاں پھیرتی تھیں تو اتنا سکون محسوس ہوتا تھا کہ میں اکثر ہی ان کی گود میں سر رکھ کر سو جاتی تھی موہی اکثر چھیڑتا۔

''امی! آپ نے اسے بہت سر چڑھا رکھا ہے۔ بہو ہے بہو کی طرح رکھیں کان کھینچ کر بیٹیوں کی طرح سر چڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''تمہیں بھی تو کافی سر چڑھا رکھا ہے۔ میں نے تمہارے بھی کان کھینچنے پڑیں گے۔'' تائی امی کہتیں اور میں موہی کا منہ چڑا دیتی۔

''بیٹا! تم موہی کے ساتھ کہیں باہر چلی جاؤ۔ تم ان حالات میں کسی کا تو نہیں اپنا بہت برا کر لو گی۔'' انہوں نے آہستگی سے کہا۔

''آپ کا مطلب ہے ملک سے باہر۔'' میں ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''ہاں۔'' انہوں نے نظریں چرا لیں۔

''قطعی نہیں ایک تو میں اپنی ماں کو چھوڑ کر کہیں جا ہی نہیں سکتی اور دوسرے امی حالات کہاں کے اچھے ہیں۔ اور پھر امی گھر کے حالات برے ہوں تو انہیں ٹھیک کیا جاتا ہے گھر چھوڑ کر تو نہیں چلا جاتا جاتا۔ اور امی! ہماری قوم بھٹک گئی ہے اسے درست راہ دکھانے کے لیے کسی خضرؑ کی ضرورت ہے اور وہ ہمیں ہی بننا ہے اور آپ نے وہ شعر تو سنا ہی ہوگا۔

اپنے کعبے کی حفاظت ہمیں خود کرنی ہے
اب ابابیلوں کا لشکر نہیں آنے والا

کیونکہ جو اس کے دیے ہوئے جھٹکوں سے بھی نہ سنبھلیں ایسی قوموں کو وہ دھتکار دیتا ہے۔ ٹھکرا دیتا ہے اور پھر ایسی قوم کے لیے سوائے تباہی اور بربادی کے کچھ نہیں بچتا وہ انہیں تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ ہمیں خدا کی ٹھکرائی ہوئی قوم نہیں بننا امی! ہمیں وہ قوم بننا ہے جن سے وہ خوش ہوتا ہے اور ان پر انعام واکرامات کی بارش کرتا ہے۔ ہمیں اپنی قوم اور اپنی آئندہ نسل کو سنوارنا ہے ہمیں اپنی قوم کا خضرؑ بننا ہے۔'' میں نے تائی امی کے گلے میں بانہیں ڈالیں۔

''لیکن ہم چند لوگ کیا کر سکتے ہیں؟'' تائی امی کے لہجے میں مایوسی تھی۔

''امی! آپ اور ایسی مایوسی آپ تو میری امید ہیں میرا عزم میری ہمت۔ ہم سب کر سکتے ہیں امی اور اس کی ابتداء ہمارے گھر سے ہی ہوگی۔ جو نسل ہماری گود میں ہے اس سے ہی ہوگی امی! آپ کو پتہ ہے حضرت عیسیٰؑ اور حضرت نوحؑ پر کتنے لوگ ایمان لائے تھے۔'' میں نے پوچھا۔

''غالباً حضرت نوحؑ پر 80 اور حضرت عیسیٰؑ کا پتہ نہیں ہے۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''بالکل درست اور حضرت عیسیٰ پر 12 افراد ایمان لائے تھے تو کیا امی! یہ ان دونوں انبیا کی ناکامی تھی۔'' میں پوچھا۔
''قطعی نہیں انہوں نے اپنا کام تو پورا کر دیا تھا۔'' تائی امی نے جواب دیا۔
''بالکل امی! بالکل یہ ان کی ناکامی نہیں تھی۔ انہوں نے اپنا کام پورا کر دیا تھا۔ انہوں نے چراغ روشن کر دیئے تھے اور ان چراغوں سے چراغ جلتے گئے۔ جلتے گئے آج دنیا میں ان 12 افراد سے جلنے والے چراغوں سے دنیا کی آدھی آبادی عیسائی ہے۔ پھر ہمارے نبیؐ نے چراغ جلائے اور ان کے امتی ہم ہیں ہمیں چراغ جلانے ہیں تاکہ اپنے امیؐ کے جس پیغام جن تعلیمات کو ان کے امتی بھول بیٹھے ہیں اس کا سفر جاری رہے۔ ہمارے حصے میں جو چراغ ہیں وہ ہم جلائیں گے۔ باقی آگے کے چراغ ان چراغوں سے جلتے چلے جائیں گے اور چراغاں ہو جائے گا۔'' میں نے تائی امی کے کاندھے سے سر لگا دیا۔

☆......☆......☆

میں شاپنگ پر نہیں گئی کچھ شاپنگ موہی نے کی کچھ میں تائی امی ان کے ساتھ چلی گئیں۔ سویرا نے بھی بڑی زبردست شاپنگ کی۔ جوں جوں عید قریب آ رہی تھی میری بے چینی بڑھ رہی تھی۔ ان دونوں کے ماں باپ کیسے عید منائیں گے؟ کیا حال ہوگا ان کا؟ کیسے وہ ماں بتاتی تھی کہ میرا حافظ قرآن بیٹا مجھے قرآن پاک سنا کر گھر سے نکلا تھا۔ اور چھوٹا بیٹا بہن کو ہٹا ہٹا کر ماں سے پیار وصول رہا تھا اور ماں کہتی تھی مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ آخری پیار وصول رہا ہے۔ اور میں اسے ڈانٹتی تھی کہ بیٹا بہن چھوٹی ہے کیوں تنگ کرتا ہے اور وہ مان نہیں رہا تھا۔

میں نے ہر ملنے والے کو اس واقعے پر غمگین پایا کیا اپنا کیا پرایا؟ وہ جو ہمارے کچھ نہیں تھے ہم سے بہت دور بستے تھے۔ مگر ہمارے دل ان کی اذیت ناک موت اور ان کے ماں باپ کے دکھ پر دکھتے تھے۔ میرا دماغ وہیں گھوم رہا تھا۔ اگر میں ہوتی تو ان گناہ گاروں کو کیا سزا دیتی میں نے سوچا ان سب کی ایک ہی سزا ہے جو سامنے ہیں جو پس پردہ۔ سب کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ان دونوں کے گھر والوں کے سامنے ڈال دیتی کہ جو چاہے سلوک کرو۔ اور ان دونوں کے اہل محلہ بھی کیسے روتے تھے کہ وہ دونوں معصوم تھے۔ اور سب کو چھوڑو اسنکرز تک رو دیے تھے۔

عید میں ابھی دو دن باقی تھے ہم سب روزہ افطار کر کے بیٹھے تھے تائی امی کہہ رہی تھیں کہ ''لگتا ہے اس بار 30 روزے ہوں گے۔'' اور میں نے ان کی تائید کی۔
''ہاں امی! لگتا تو ایسا ہی ہے۔''
''مگر 29 روزے ہوں تو عید کا مزہ آتا ہے، خوشی ہوتی ہے۔'' سویرا نے کہا۔
''بیٹا! اپنا اپنا ذہن ہے ابھی تمہاری عمر کم ہے تو تمہیں عید کی زیادہ خوشی ہوتی ہے اور ایک روزہ بڑھ جائے تو ہمیں خوشی ہوتی ہے کہ رمضان کی رحمتوں اور برکتوں سے مستفید ہونے کو ایک دن اور مل گیا۔'' تائی امی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
''امی! مجھے بھی 30 روزوں کی خوشی ہوتی ہے۔'' میں نے کہا تو سویرا نے منہ ہی منہ میں ''چچی'' کہا اور میں مسکرا دی۔
مونی بھائی سے ان کے بچے چشموں، گھڑیوں، پرس وغیرہ کی فرمائش کر رہے تھے۔

سویرا کو بھی ٹیلر کے پاس جانا تھا وہ چاروں ایک ساتھ نکلے۔ مونی بھائی نے سویرا کو ٹیلر شاپ پر ڈراپ کردیا جو گھر سے قریب ہی تھی واپس اسے خود آ جانا تھا۔ آدھے گھنٹے میں سویرا کی واپسی ہوگئی۔ مگر مونی بھائی اور بچے رات بارہ بجے تک واپس نہیں آئے پہلے تو سب نے یہی سمجھا کہ عید رش کی وجہ سے ایسا ہے مگر بارہ بجے سب کی پریشانی سوا ہوگئی۔ موہی انہیں ڈھونڈنے نکلا تمام دوست واحباب کو فون کردیے گئے مگر کہیں سراغ نہ ملا بالآخر سحری سے کچھ پہلے موہی دونوں بچوں کو لے کر واپس آ گئے۔ دونوں بچے زخمی تھے۔ جسم پر خراشیں وغیرہ تھیں ارحم کے بازو میں فریکچر تھا۔ پلاسٹر بندھا تھا۔ سویرا نے دیکھا تو چیختی ہوئی دونوں بچوں کی طرف بھاگی وہ بری طرح رو رہی تھی ہمارا گھر پورا بھرا ہوا تھا۔ برابر سے امی ابو، چچا، چچی، عائلہ، حسن، حسن اور سویرا کے گھر سے سب لوگ جمع تھے۔

سب نے موہی کو گھیرا اور تابڑ توڑ سوالات کا سلسلہ شروع کردیا۔ سب مونی بھائی کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ تب موہی نے بتایا کہ ان کا بہت زبردست ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ بچے معجزاتی طور پر بچ گئے ہیں جبکہ مونی بھائی کو کوئی اندرونی دماغی چوٹ آئی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ بے ہوش ہیں اور ڈاکٹرز نے اگلے 72 گھنٹے اہم بتائے ہیں۔ آپ سب ان کے لیے دعا کریں۔ یہ سننا تھا کہ گھر میں رونا پیٹنا مچ گیا سب نے تسبیح سنبھال لیں۔ 'یا سلام' کا ورد شروع ہوگیا۔

موہی صرف بچوں کو چھوڑنے آئے تھے وہ ہاسپٹل جانے کے لیے نکلے تو میں تایا، تائی اور سویرا بھی ساتھ ہولیے۔ میں نے بچے امی کے پاس چھوڑے سویرا نے نویرا اور ارحم کو ساتھ لے لیا۔

ہم سب سراپا دعا بنے ہوئے تھے۔ سب کا ایک قدم گھر میں اور دوسرا ہاسپٹل میں ہوتا تھا۔ مونی بھائی کو بھی خراشوں اور چھوٹے موٹے فریکچرز کے علاوہ سر پر چوٹ لگی تھی جس کے باعث وہ بے ہوش تھے اور ان کا کومہ میں جانے کا ڈر تھا۔ ہاسپٹل میں سویرا میرے سامنے بری طرح روئی تھی۔

"شیزا! تم دعا کرو کہ خدا مجھے معاف کردے۔ تم نے کہا تھا ناں! میرا دل سخت ہوتا جا رہا ہے۔ میرے اندر سے رحم ختم ہو رہا ہے۔ تم نے ٹھیک کہا تھا بڑے سے بڑا واقعہ ہوجاتا تھا مجھ پر اثر نہیں ہوتا تھا مجھے کسی پر رحم نہیں آتا تھا۔ کسی سے ہمدردی نہیں ہوتی تھی۔ اور ان دونوں بھائیوں کے واقعے نے پوری قوم کو رلا دیا مگر اس واقعے نے بھی میرے دل کو معمولی سا بھی نہیں چھوا تھا میں ہر چیز کو For Granted لینے لگی تھی۔ میں نے یہی سوچا تھا دنیا میں ہزاروں لوگ مرتے ہیں وہ دونوں بھی مر گئے۔ مجھے تم پر بھی غصہ آتا کہ بیگانوں کے دکھ پر ایسے رو رہی ہو کہ کوئی کیا اپنوں کو روتا ہوگا۔ مگر تم نے کہا تھا ناں! کہ خدا سزا سے پہلے جھٹکا ضرور دیتا ہے کہ سنبھل جاؤ۔ تم خدا سے دعا کرو کہ یہ جھٹکا ہی ہو سزا نہیں۔ آج نویرا اور ارحم کی خراشوں اور منعم کی بے ہوشی سے مجھے جو تکلیف ہو رہی ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ اور آج مجھے ہر ذی روح کی تکلیف کا اندازہ ہو رہا ہے مجھے اعتراف ہے کہ میں تمہاری اور امی کی باتیں چھپ کر سنتی تھی کہ تم میری برائیاں کرتی ہوگی۔ مگر ہر بار شرمندہ ہوتی کہ تم لوگ تو اپنی ہی باتیں کرتے تھے۔ آج خدا نے مجھے معافی مانگنے کا سنبھلنے کا موقع دیا ہے مجھے تم بھی

معاف کردو۔ مجھے آج ان تمام لوگوں کیا دکھ محسوس ہو رہا ہے۔ جس پر تم دکھی رہیں اور میں منہ پھیر کر گزرتی رہی کہ جس تن لاگے سوتن جانے آج خدا نے میرے دل کو گداز کر دیا ہے۔ تم خدا سے میرے لیے دعا کرو یہ آزمائش ہو عذاب نہیں۔'' وہ بری طرح رو رہی تھی۔

''میں کیوں سویرا! تم خود کیوں دعا نہیں کرتیں؟ تم کل رات سے یہاں ہو پریشان بھی ہو مگر نہ ہی نماز پڑھ رہی ہو۔ نہ ہی اس کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرتی ہو امی کو دیکھو۔'' میں نے نماز کے لیے بنی ہوئی جگہ کی جانب اشارہ کیا۔

''تم نے امی کے چہرے پر پریشانی دیکھی؟ میں نے تو نہیں دیکھی۔ تو کیا وہ مونی بھائی سے محبت نہیں کرتیں۔'' میں نے پوچھا۔

''ماں کی محبت پر تو شک کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ مگر دیکھو انہیں کتنا یقین کتنا بھروسہ ہے اللہ پر کہ وہ بغیر کسی پریشانی کے پورے یقین اور بھروسے کے ساتھ اس وحدہٗ لاشریک لہٗ کے آگے جھکی ہوئی مانگ رہی ہیں اس بے نیاز سے اس عالی صفات سے اور دیکھنا وہ انہیں دے گا مونی بھائی کی زندگی اور صحت۔ وہ تو اپنے بندوں کو یوں بھی مایوس نہیں کرتا۔ اور جو اتنے یقین سے مانگے اسے تو کبھی بھی نہیں۔ اور اس وقت تمہارے اور امی کے دل کو لگی ہوئی ہے اس وقت تمہاری اور امی کی دعاؤں اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوگا۔ جاؤ مانگو اس بے نیاز سے اس یقین کے ساتھ ہم مانگ رہے ہیں اور مانگیں گے مگر اس وقت تمہاری اور امی کی دعاؤں میں جو تاثیر ہوگی وہ ہماری دعاؤں میں نہیں ہوگی۔ اور اگر ہو سکے تو امی سے بھی معافی مانگ لینا۔ خلق خدا کے لیے دل گداز رکھو کہ مہربانی اہل جہاں پر کرنے سے خدا عرش بریں پر مہربان ہوتا ہے اور دل کھول کر صدقہ خیرات کرو۔'' میں نے اسے نئی راہیں دکھائیں اور وہ سر ہلاتی رہی وہ فطرتاً بری نہیں تھی بہکاوے میں آ گئی تھی۔ اس نے امی سے بھی معافی مانگی اور انہوں نے کھلے دل سے معاف کر دیا۔ صدقہ و خیرات کیا اور امی کے ساتھ بارگاہ لم یزل میں جھک گئی تو وہ کیسے نہ نوازتا۔ اسے اچھی طرح سے سمجھ آ گیا کہ رب نے دردِ دل کے واسطے انسان کو پیدا کیا ہے۔ ورنہ اس کی اطاعت کے لیے تو کروبیاں ہی کافی تھے۔

کہاں کی عید اور کیسی عید ساری تیاریاں دھری کی دھری رہ گئیں۔ عید کا پورا دن بھی ہاسپٹل کی نظر ہو گیا۔ مگر اس دن روزوں کا انعام خدا تعالیٰ نے مونی بھائی کو ہوش میں لا کر دیا۔ عید کی صبح 6 بجے مونی بھائی کو ہوش آ گیا اور گویا عید ہو گئی۔ مونی بھائی کا رائٹ سائیڈ متاثر ہوا تھا ڈاکٹرز نے اطمینان دلایا کہ فزیو تھراپی سے رائٹ سائیڈ بھی کام کرنے لگے گا۔ مونی بھائی ایک ہفتے ہاسپٹل میں رہے پھر گھر آ گئے۔ ان کے الٹے ہاتھ کی دو انگلیوں میں فریکچر تھا اور سیدھے پیر کے ٹخنے کی ہڈی اتر گئی تھی۔ سو انہیں لمبا آرام کرنا تھا اور پھر فزیو تھراپی......

مونی بھائی کی گھر واپسی کے چھٹے دن میرے گھر پری کی آمد ہوئی انوشے کی آمد...... مونی بہت خوش ہے۔ اس کی گڑیا کو بہن مل گئی ہے سگی والی...... اور میں اسے ہر بار دیکھ کر سوچتی ہوں کہ ہر نئی روح آ کر یہ بتاتی ہے کہ خدا ابھی بنی نوع انسان سے مایوس نہیں ہے تو پھر ہم کیوں؟

☆☆......☆☆

"بیٹا، ہم لوگ صرف دعا ہی کر سکتے ہیں خدا اس بچی کے حال پر رحم کرے۔ چلو اب جلدی سے تیار ہو جاؤ وین والا آتا ہی ہوگا، ابھی ناشتہ بھی کرنا ہے۔" مما احکام صادر کرکے، مجھے تشنہ لب چھوڑ کے کچن میں گھس گئیں اور مجھے چار و ناچار تیار ہونا پڑا سب......

آج پھر صبح صبح چیخ و پکار کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اس سلسلے کو شروع ہوئے آج تیسرا روز تھا۔ ہر روز کی مانند بے ہنگم اور کرخت آوازیں...... بلند و بانگ قہقہے...... غراتا لہجہ...... سنسناتے ماحول کے ساتھ ساتھ خوف کی دہلیز پہ دم توڑتی آہیں، ملتجی نگاہیں 'بے چارگی اور مظلومیت نے پوری فضا کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ ایک سوگواریت تھی۔ جو ہر طرف طاری تھی۔

''مما یہ کیسی آوازیں ہیں ایسا کیا ہو گیا ہے رقیہ کے گھر میں کہ اُن کی جان ہی نہیں چھوٹ رہی پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا ہمہ وقت سکون ہی سکون تھا اور آپ مجھے کچھ بتاتی کیوں نہیں؟'' میں نے سہمتے ہوئے دل اور سُن ہوتے جسم پر کنٹرول پانے کی اپنی سی کوشش کرتے ہوئے استفہامیہ نگاہوں سے مما کو دیکھا تھا۔

''کچھ نہیں بیٹا۔'' حسب معمول انہوں نے مجھے ٹالنا چاہا۔

''نہیں مما، آج آپ کو بتانا پڑے گا۔'' میں نے قدرے ہٹ دھرمی سے کہا تو وہ روہانسی ہو گئیں۔

''میں نے کہا ناں کہ کچھ نہیں۔'' انہوں نے پھر ''نہیں'' کی گردان کی تو میں نے ایک آخری حربے کے طور پر کہا۔

''ٹھیک ہے، آپ نہ بتائیں میں خود جا کر پوچھ اور دیکھ لیتی ہوں رقیہ سے، جا رہی ہوں میں اُن کے گھر۔'' میں نے یہ بات کہہ تو دی تھی لیکن خوف و ڈر دل میں آکٹوپس کی مانند پنجے گاڑے ہوئے تھا۔

''ہرگز نہیں، تم نہیں جاؤ گی ان کے ہاں، وہاں جانا تو موت ہے موت۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے کبھی سوچنا بھی مت کہ میں تمہیں وہاں جانے دوں گی۔''

مما نے مجھے اپنے بازوؤں میں لے کر اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ میں مطمئن سی ہو گئی۔

''بیٹا! رقیہ سے دانستگی یا نادانستگی میں کچھ ایسا ہو گیا ہے جو نہیں ہونا چاہیے تھا اور وہ ایک آسیب کے زیرِ اثر آ گئی ہے۔ جو اسے تڑپا تڑپا کے مار ڈالنا چاہتا ہے۔ اس کے گھر والوں نے بہت سعی کی ہے مگر لاحاصل۔ وہ آسیب نہ صرف روحانی طور پر بلکہ جسمانی طور پر بھی بہت تکلیف دے رہا ہے رقیہ کو۔ بیچارے بہت مشکل میں ہیں اتنا درد، اذیت اور رنج و الم ہے کہ دل کٹ کے رہ جاتا ہے۔''

پہلی بار مما نے یہ واردات میرے گوش گزار کی تھی۔ آسیب سے میری واقفیت صرف اتنی تھی کہ بچپن میں دیومالائی کہانیوں میں جابجا اس کا ذکر سُنا کرتی تھی۔ حقیقت میں اُس کا وجود تھا وہ انسانی جسم میں سرایت کر سکتا تھا یہ مجھے اب معلوم ہوا تھا۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا ایسا واقعہ تھا کہ میری روح تک کانپ گئی تھی۔

اس لڑکی نے میرے بچوں کی جان لی ہے اس نے وہ شاخ ہی اپنی دوستوں کے ساتھ مل کر کاٹ ڈالی جس پر وہ بسیرا کرتے تھے میرے بچے اس شاخ پر پھولوں کی صورت ایستادہ تھے مگر اس نے بے دردی سے سب پھولوں کو کچل ڈالا۔ یہ کسی معافی کے لائق نہیں۔ جان کے بدلے جان ہی جائے گی پہلے میں اسے خوب مزہ چکھاؤں گا اتنا تڑپاؤں گا کہ روح بلبلا اٹھے گی۔'' میری اور مما کی گفت و شنید جاری تھی کہ اب ہولناک آوازوں نے رونگٹے کھڑے کر دیے۔

''مما یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟ وہ

مر جائے گی کچھ کریں مما۔'' میرے حلق میں آنسوؤں کا پھندہ اٹکنے لگا۔

''بیٹا' ہم لوگ صرف دعا ہی کر سکتے ہیں خدا اس بچی کے حال پر رحم کرے۔ چلو اب جلدی سے تیار ہو جاؤ وین والا آتا ہی ہوگا۔ ابھی ناشتہ بھی کرنا ہے۔'' مما احکام صادر کر کے، مجھے تشنہ لب چھوڑ کے کچن میں گھس گئیں اور مجھے چارو ناچار تیار ہونا پڑا سب کچھ پسِ پشت ڈال کے۔

☆......☆......☆

ہر روز کی طرح آج بھی ماہم کوریڈور کے بالکل سامنے بنے کیفے ٹیریا میں فہد کے ساتھ براجمان دنیا و مافیہا سے بے خبر خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ حسبِ معمول اُس نے آج بھی اپنا سائیکالوجی کا لیکچر مس کر دیا تھا کیونکہ فہد کے سر نواز کے چھٹی پر ہونے کی وجہ سے کلاسز جو بنک تھیں۔ مجھے بے انتہا کوفت محسوس ہوئی۔ میں پاؤں پٹختی تن فن کرتی وہاں سے جانے لگی تھی کہ فہد کی مجھ پر نظر پڑ گئی اس نے وہیں سے ہانک لگائی۔

''آ جاؤ شمائل...... تمہاری پسند کی سب چیزیں یہاں موجود ہیں۔ بس تمہاری کمی ہے یہ بھی پوری کر دو۔''

جواباً ماہم نے بھی ہاتھ ہلایا مگر میں ٹس سے مس نہ ہوئی فہد کے انوٹیشن پر تو میرا حلق اندر تک کڑوا ہو گیا تھا۔

''نو تھینکس، نولفٹ کا بورڈ چہرے پہ آویزاں کیے میں منظر سے غائب ہونے والی تھی کہ ماہم آ ٹپکی اور میرا راستہ روک لیا۔

اور اسے ایسا کرنے کا حق حاصل تھا کیونکہ ماہم میری اکلوتی دوست تھی۔ یہ الگ بات کہ اب وہ فہد کے ساتھ کسی اور ہی دنیا کی اسیر ہو گئی تھی مگر تھی تو میری دوست ہی ناں۔''

کبھی ہم میں تم میں قرار تھا
تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

زیرِ لب یہ مصرعہ نوکِ زباں پر مچل اٹھا تھا۔

''آؤ شمائل کبھی ہمیں بھی کمپنی دے دیا کرو۔ فہد تمہیں بلا رہا ہے آج اُس کا برتھ ڈے ہے پپی برتھ ڈے ہی کہہ دو اُسے۔'' اُس نے بہت دُلار سے کہا۔

''میڈم مجھے ان فضولیات سے دُور ہی رکھو۔ فہد میرا کچھ نہیں لگتا جب تم دونوں کا کوئی رشتہ استوار ہو جائے گا تب اسے پپی برتھ ڈے بھی کہہ لوں گی۔'' میں نے غصیلی نظروں سے اسے گھورا تھا۔ اور لفظ ''فضولیات'' پر گہرا زور دیا تھا۔

''یار، تم کیا جانو محبت کس بلا کا نام ہے پیار کس پنچھی کو کہتے ہیں۔

محبت تو کسی وحی کی طرح دلوں پر اترتی ہے اور روح تک کو سیراب کر ڈالتی ہے کچھ مخصوص دلوں پر اس کا راج ہوتا ہے۔ اور وہیں یہ بسیرا کر لیتی ہے یہ ایک ایسی مئے ہے جو ہر دل کو مست کر دیتی ہے۔ بے خود کر دیتی ہے۔''

''بس بس ایسی بے خودی، ایسے مئے خود تک ہی رکھو۔ مجھے اُن کی چنداں طلب نہیں ہے۔''

اس کے مخمور لہجے و انداز کو میں نے بڑی سفاکی سے چکنا چور کر دیا تھا۔

مگر اس کے ماتھے پہ کوئی شکن نمودار نہ ہوئی اس کا انداز ہنوز برقرار تھا۔

''اگر اس محبت کے خول سے باہر نکلنے کا ٹائم ملے تو پلیز یہ سوچ لینا کہ تم نے سائیکالوجی کے اتنے اہم لیکچر مس کر کے اپنا کتنا نقصان کر لیا ہے۔'' میں نے پھر اسے گھر کا تھا۔

''محبت نفع و نقصان کب دیکھتی ہے۔ محبت کا

سبق پڑھ لیا وہی کافی ہے۔ دنیاوی اسباق سے میرا کیا لینا دینا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

اس کو چھٹی نہ ملی
جس نے سبق یاد کیا

سائیکالوجی جیسا خشک مضمون رکھنے کے بعد بھی ہم دونوں کا ادبی ذوق ذرا بھی ختم نہ ہوا تھا ہم دونوں اکثر اپنی بات شاعری کے پردے میں ہی کیا کرتی تھیں۔

''زیادہ فلاسفی جھاڑنے کی ضرورت نہیں اپنی سوچیں، اپنے خیالات خود تک ہی محدود رکھو مجھے اکیسویں صدی کی ہیر کا خطاب تمہیں دیتے ہوئے بہت دکھ ہو رہا ہے۔ اپنا تو نہیں خیال گھر والوں کا ہی کرلو۔ کتنی امیدیں، کتنی خواہشیں، کتنی حسرتیں، کتنی تمنائیں وابستہ ہیں۔ آنٹی لوگوں کی تم سے، اور تم پر، گزرتے دن کے ساتھ ان پر پانی پھیرتی جا رہی ہو کچھ ہوش ہے تمہیں کیا کر رہی ہوں۔ تم مستقبل کی سائیکاٹرسٹ بننے جا رہی ہو جبکہ تمہیں خود کسی سائیکاٹرسٹ کی ضرورت ہے۔''

میں نے ایک ہی سانس میں اسے سخت سُست کہہ ڈالا تھا۔

''میں کیا کروں شمائل، فہد کو چھوڑنا میرے بس میں نہیں ہے کیا کبھی زندگی کو زندگی سے بچھڑتے دیکھا ہے؟ بچھڑیں تو موت ہے موت اور میں مرنا نہیں چاہتی۔'' اس کی کمزوری چیخ چیخ کر بول رہی تھی لیکن میں سنی ان سنی کر کے لائبریری کی طرف بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

کالج واپسی پر گھر لوٹتے ہی پھر اُن بے ہنگم آوازوں سے سابقہ پڑ گیا تھا۔ شدید بھوک کی طلب ہونے کے باوجود تھوڑا سا کھانا بھی میں زہر مار نہ کرسکی۔ دفعتاً آوازیں بہت بلند ہوگئیں تو میں خوف کے مارے اپنے کمرے میں گھس گئی۔ اور بہ عجلت دروازہ بھی لاک کر ڈالا۔ دادو اور مما دونوں ہی گھر نہ تھیں۔ لہٰذا ماحول زیادہ سنجیدہ، گھمبیر اور سنسنی خیز محسوس ہو رہا تھا۔ پتہ نہیں میں کتنی دیر دروازہ لاک کر کے اس سے ٹیک لگائے کھڑی رہی۔ معاً دروازے پر دستک ہوئی تو میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں نے خشک ہونٹوں کو سیٹی کے انداز میں کھولا ہی تھا کہ مما کی آواز سنائی دی۔

''دروازہ کھولو شمائل، کیا سو رہی ہو؟ لنچ کر لیا کیا؟'' مما کو ہمیشہ میرے کھانے کی ٹینشن لگی رہتی تھی۔ کیونکہ میں اُن کی پہلوٹھی کی اولاد جو تھی۔ میرے بعد عدیم تھا جو مجھ سے پورے دس سال چھوٹا تھا سب کی آنکھ کا تارا لیکن لڑکا ہونے کے باوجود میری جگہ نہ لے سکا تھا۔

''نہیں مما!'' اتنا کہہ کر میں نے جلدی سے دروازہ کھولا اور ان سے لپٹ گئی۔ عموماً میں ان کے گرد اپنے بازو حمائل کر دیا کرتی تھی مگر اس وقت میں نے اُن کو ایک طرح سے دبوچ ہی لیا تھا۔

''مما! کیا یہ آسیب رقیہ کی جان نہیں چھوڑ سکتا۔ (رقیہ آنٹی نگہت کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی اور جماعت ہفتم کی طالبہ تھی) کب تک اس بیچاری پر یہ ظلم ہوتا رہے گا؟ وہ اتنا کیسے سہہ پائے گی۔''

میرا لہجہ درد سے لبریز تھا مما نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور میری پشت تھپکنے لگیں۔

''یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ رقیہ کی کب اس آسیب سے جان چھوٹتی ہے۔ چھوٹتی بھی ہے کہ نہیں؟ وہ بیچارے تو عاملوں کے پاس جا جا کر تھک گئے ہیں۔ ایسا ظلم آسیب ہے کسی کی پکڑ میں

ہی نہیں آرہا۔ آہستہ آہستہ گھر والے بھی مایوس ہورہے ہیں۔ کچھ چیزیں انسان کے اختیار سے باہر ہوتی ہیں۔ قسمت میں جو لکھا ہوتا ہے وہ درد، وہ تکلیف اسے مل کر رہتی ہے۔ ہم لوگ فقط کوشش کر سکتے ہیں۔''

مما نے دھیرے دھیرے مجھے سمجھایا تھا اور میں اب سنبھل گئی تھی کافی حد تک۔

''چلو جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جاؤ آج میں نے تمہاری پسندیدہ بریانی بنائی ہے۔ اکٹھے کھاتے ہیں۔'' مما کے منہ سے بریانی کا سن کر میں نہال ہوگئی تھی۔ سو فوراً واش روم کی جانب چل دی۔

☆......☆......☆

میری کزن ماریہ کی شادی عنقریب طے پانے والی تھی۔ رشتہ داروں میں ہی رشتہ ہوا تھا۔ سو ہمیں اچھی طرح معلوم تھا کہ بہت جلد وہ پیا دیس سدھارنے والی ہیں۔ میں نے مما سے ضد کر کے ان کو قبل از وقت ہی شاپنگ پہ آمادہ کر لیا تھا۔ دلیل یہ پیش کی تھی کہ ہمارے ٹیسٹ کسی وقت بھی شروع ہو سکتے تھے اور پھر کہاں وقت ملے گا من پسند شاپنگ کا۔

مما نے یہ دلیل مان لی تھی اور ہم خراماں خراماں شاپنگ مال چل دیے۔ میں نے دو فینسی اور ایک عدد سادہ سوٹ لیا تھا۔ کچھ کاسمیٹکس کی چیزیں لیں، کچھ جیولری لی ابھی شوز خریدنا باقی تھے کہ ٹانگوں نے چلنے سے انکار کر دیا۔

جسم میں کوئی انرجی باقی نہ رہی تھی۔ میں تقریباً گرنے والی تھی کہ مما نے صورتِ حال کو مدِنظر رکھتے ہوئے مجھے شاپنگ مال سے باہر نکالا اور قریبی ریسٹورا ن لے گئیں۔

وہاں مما نے بریانی اور کوک کا آرڈر دیا۔ میں اپنی موج میں مست ہو کر بریانی سے انصاف کر رہی تھی کہ میری نظر عقبی جانب اور ایک ٹیبل پر براجمان فہد پر پڑی وہ کسی لڑکی کے ساتھ باتوں میں اتنا محو تھا کہ اردگرد کی بالکل پروا اور خبر نہ تھی۔

دونوں کی نظروں میں ایک دوسرے کے لیے اتنا پیار اور اپنائیت تھی کہ میں گنگ ہوگئی تھی۔ مما نے مجھے دو تین بار ٹوکا بھی کہ میں کھانا ٹھیک سے نہیں کھا رہی مگر اب میرے حلق سے نوالا کیسے اُتر سکتا تھا؟ اسی گومگو کی کیفیت میں، میں نے دیکھا کہ وہ ہاتھ دھونے کرنے کی غرض سے واش روم کی طرف گیا ہے میں نے موقع غنیمت جانا اور مما سے اجازت لے کر صرف ایک منٹ کے لیے تقریباً بھاگتی ہوئی اس ٹیبل کی طرف آئی تھی۔ وہ تیکھے نقوش والی خاصی خوبصورت سی لڑکی تھی۔ بہت اسٹائلش اور زندگی سے بھرپور......

''ایکسکیوزمی! آپ کے بھائی کدھر ہیں، منیجر صاحب انہیں بلا رہے ہیں۔'' میں نے صریحاً جھوٹ بولا تھا۔

''وہ میرے فیانسی ہیں واش روم گئے ہیں آتے ہی بھیج دیتی ہوں۔'' اتنا کہہ کر وہ سامنے رکھے اسٹیم روسٹ کی طرف متوجہ ہوگئی جبکہ میں سناٹے میں آگئی۔ مرے مرے قدموں سے واپس آکر میں نے مما کو جلدی سے اس ریسٹوران سے باہر نکلنے کے لیے کہا۔ کیونکہ اگر فہد کی نظر پڑ جاتی تو بہت بُرا ہوتا، اب مجھے ماہم سے دوٹوک بات کرنا تھی۔

☆......☆......☆

''ماہم میں نے اُسے خود ایک لڑکی کے ساتھ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے آنکھوں میں بھرپور پیار لیے ایک ریسٹوران میں دیکھا ہے اور تم اس سے کچھ پوچھنے کی بجائے مجھے ہی جھٹلا رہی ہو۔''

''دیکھو شائل تم شاپنگ کر کے اتنا تھک چکی تھیں کہ کچھ بھی سجھائی نہ دے رہا تھا پھر وہ ٹیبل عقبی جانب تھا اور وہ لڑکی اس کی فیانسی تھی۔ سب چیزیں غلط ہیں۔ انسان سے دیکھنے میں بھول ہو سکتی ہے کچھ تم اسے اتنا ناپسند کرتی ہو کہ ہو سکتا ہے تمہیں کسی اور پر اس کی مشابہت کی وجہ سے دھوکہ ہوا ہو کہ وہ فہد ہی ہے۔''

ماہم کی بات بھی کسی حد تک ٹھیک تھی مگر میں نے پورے ہوش و حواس میں اسے دیکھا تھا۔ میں نے کوئی دسویں بار یہ بات اس سے کہی تھی مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی تھی۔

''مجھے خود سے بھی زیادہ اعتبار ہے فہد پر۔'' اس نے دو لفظوں میں بات ختم کر کے گویا مجھے چپ رہنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ میں تلملا کر رہ گئی تھی۔

☆......☆......☆

آج پہلا دن تھا کہ کالج سے واپسی پر رقیہ کے گھر سے آنے والی ہولناک چیخوں سے سامنا نہ ہوا تھا۔ میں بہت حیران تھی۔ مما نے میرے چہرے سے یہ حیرت بھانپ لی تھی۔

''تم یقیناً رقیہ کے ہاں سے آنے والی چیخوں کے تھم جانے کی بابت جاننا چاہتی ہوناں۔ تو پہلے منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو کر کھانے کی ٹیبل پر آ جاؤ۔ آج میں نے تمہارے پسندیدہ دہی بڑے اور اچار گوشت بنایا ہے۔''

''یا ہو۔'' میں ایک بازو ہوا میں لہراتی قدرے اُچھلتی واش روم چل دی۔

پہلا نوالہ حلق سے نیچے نہیں اُترا تھا کہ میں نے ممی کی طرف استفہامیہ دیکھنا شروع کر دیا۔

''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے رقیہ کو آسیب کی اذیت و مصیبت سے ہمیشہ کے لیے نجات دے دی ہے۔ سب گھر والوں کی نیندیں حرام ہو گئی تھیں۔ ایک لمحے کا سکون بھی غارت ہو کر رہ گیا تھا۔ کوئی روزن، کوئی سرا نظر نہیں آ رہا تھا۔ جس کو پکڑ کر وہ اس تکلیف سے نکل پاتے خدا بھلا کرے مولوی کرامت کا، جنہوں نے اپنے ایک جاننے والے کسی بہت پہنچے ہوئے بزرگ کا نہ صرف ان کے سامنے ذکر کیا بلکہ آج صبح اُن کو اپنے ہمراہ رقیہ کے گھر لے آئے۔ انہوں نے گھر والوں کو چند تعویذات دیے اور کچھ دیر گھر میں پڑھائی، پانی چھڑکا دیواروں پر اور دو گھنٹے میں حالات معمول پر آ گئے اور رقیہ کی جان چھوٹ گئی اس آسیب سے۔''

مما نے یوں سانس دل کے کابک سے آزاد کیا جیسے ان کے سینے پر دھرا کوئی بہت بڑا بوجھ اُتر گیا ہو۔ وہ بہت حساس اور ان کو میری طرح دوسروں کا غم بھی اپنا ہی محسوس ہوا کرتا تھا۔ مجھے مما پر بے حد پیار آیا۔ اور رقیہ کا سن کر بہت خوشی ہوئی۔ اگلے دن وہ خوشی دو چند ہو گئی جب رقیہ خود ہمارے گھر ملنے آئی تھی۔

☆......☆......☆

مطلع صبح سے ہی ابر آلود تھا۔ نیلگوں آسماں کی وسعتوں میں بادلوں کے ٹکڑے بہت ہٹ دھرمی سے تیر رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے فضا گل و گلزار تھی۔ آج کے دن کالج سے چھٹی کا تو میں سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ یہ موسم مجھے بہت بھاتا تھا۔ ایسے موسم میں میرا دل چاہتا تھا کہ کاش میرے پَر ہوتے اور میں ہوا کے دوش پر اڑتی رہتی۔

خلاف توقع آج میں بہت بے چینی سے وین والے کا انتظار کر رہی تھی۔ صد شکر اِدھر ہارن بجا اُدھر میں وین میں تھی۔ وین میں ماہم پہلے ہی

سے براجمان تھی۔ پہلے سے کہیں زیادہ فریش، کہیں زیادہ وہ آج خوبصورت لگ رہی تھی چہرہ میک اپ سے بے نیاز تھا۔ مگر اس کا حسن آج عجیب ہی لشکارے مار رہا تھا۔ خوبصورت تو وہ تھی ہی مگر آج بہت چارمنگ لگ رہی تھی۔ اس کو یوں دیکھا تو زبان پھسل گئی۔

اُن کے دیکھے سے خیال آتا ہے
قیامت پانچ فٹ دو انچ ہوگی

ماہم شرما لجا کر رہ گئی تھی۔

سارا رستہ باتوں باتوں میں طے ہو گیا وقت کا چنداں احساس نہ ہوا تھا۔

معمول سے ہٹ کر آج ماہم نے ایک لیکچر بھی مِس نہ کیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو عقل تو آئی تھوڑی سی......

ہلکی ہلکی بوندا باندی نے پکوڑوں، پیزا اور سموسوں کی خواہش کو زیادہ تیز کر دیا تھا۔ میں ماہم کو لیے بنا ہی کیفے ٹیریا آ بیٹھی۔

مجھے بالکل بھی احساس نہ ہوا تھا کہ ساتھ ٹیبل پر فہد پہلے سے موجود تھا۔

نازلی جو ہمارے ہی ڈیپارٹمنٹ کی طالبہ تھی چہرے پہ اڑتی ہوائیاں لیے، حد درجہ پریشان صورت لیے فہد کی طرف بڑھی۔

''فہد لائبریری میں تم اور میں ہی موجود تھے میرے بیگ میں رکھے والٹ کا اور اس والٹ میں کتنے پیسے تھے ان کا صرف اور صرف تمہیں ہی پتہ تھا۔ اس وقت میرے پاس بیگ تو ہے مگر والٹ کے بنا۔''

وہ بہت مشکل سے گویا ہوئی تھی۔ کیفے ٹیریا میں بیٹھے سبھی لوگ ان دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ فہد کے چہرے پہ خفت نمودار ہو گئی۔

''تم کہنا کیا چاہتی ہو نازلی، تمہارا کہیں یہ مطلب تو نہیں کہ میں نے تمہارا والٹ چرایا ہے۔'' خفت آمیز درشت لہجے میں وہ گویا ہوا تھا۔

''فہد پلیز! بات سمجھنے کی کوشش کرو اگر تم نے غلطی سے لے لیا ہے تو پلیز واپس کر دو اس میں میری بہن کے لیے جہیز خریدنے کے لیے پیسے رکھے تھے امی نے۔''

آج ہی ہمارا شاپنگ مال جانے کا پروگرام تھا۔ میری بہن نے ضد کر کے یہ پیسے مجھے پکڑا دیے تھے کہ آج گھر میں مہمان آنے والے تھے کہیں کھو سکتے تھے اس نے واپسی پہ مجھے لینے کالج آنا ہے پلیز مجھے لوٹا دو۔ بہت مشکل سے جمع کیے ہیں یہ پیسے۔''

وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اُس سے اپنی بہن کی خوشیوں کی بھیک مانگ رہی تھی مگر وہ تو ڈھیٹ بنا بیٹھا تھا۔

''لو بتاؤ بھلا میرے پاس کہاں سے آیا تمہارا والٹ؟ شرم آنی چاہیے تمہیں مجھ پر یہ الزام لگاتے۔''

تم نے مجھے چور ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی میں اس انسلٹ کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ تمہیں ناکوں چنے نہ چبوائے تو پھر کہنا۔''

ہاتھ کے اشارے سے اسے وارننگ دیتا وہ وہاں سے تیز تیز قدموں کے ساتھ باہر نکل گیا۔ لیکن نکلنے سے پہلے وہ اپنے لنگوٹیے یار عابد کو آنکھ مارنا نہیں بھولا تھا۔

اچھا تو وہ مجھے شروع سے نہیں لگتا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی خباثت چھائی رہتی تھی۔ اس کا کردار ہمیشہ مجھے مشکوک سا لگتا تھا۔ چہرے کے خدوخال گر بہت خوبصورت اور تیکھے نہ سہی مگر بھلے لگتے تھے۔ اپنی چرب زبانی سے وہ مدمقابل کو

چاروں شانے چت کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ نازلی والے واقعہ اور ریستوران والے واقعہ کے بعد تو وہ مجھے مکروہ لگنے لگا تھا۔ مگر کاش ماہم یہ سب جان پاتی۔ کچھ بھی کھانے کا من نہیں تھا سو نہایت خاموشی سے ٹیبل چھوڑ کر باہر آ گئی۔

کالج واپسی پر میں خاصی بدمزہ تھی اور یہ بدمزگی اور بھی سوا ہو گئی جب ماہم نے یہ اطلاع بہم پہنچائی کہ وہ آج اپنی پھوپو کی طرف جائے گی ڈرائیور اسے لینے آ رہا تھا۔ روداد یہ تھی کہ پھوپو کی اکلوتی بیٹی پلوشہ کی شادی نزدیک تھی۔ اور اس کی کزن نے بطور خاص اُسے چنا تھا شاپنگ کے لیے۔ پھوپو تو بقول اُس کے شاپنگ مال کے چکر لگا لگا کر ادھ موئی ہو گئی تھیں۔ مزید یارا نہ تھا چکر لگانے کا سو یہ ذمہ داری اب ماہم کے ناتواں کندھوں پر آ پڑی تھی۔

وجہ معقول تھی سو میں نے کچھ نہ کہا بس منہ بسور لیا تھا جس پر وہ ہلکے سے مسکرا دی تھی۔

☆......☆......☆

وقت کا کام ہے چلنا اور وہ چلتا رہتا ہے کسی کی پروا کیے بغیر، کس کے حصے میں کیا آیا سود یا زیاں؟ اسے اس بات سے قطعاً سروکار نہیں ہوتا۔ ہمارے سمسٹر ٹیسٹ سر پر آ پہنچے تھے مگر پورے پانچ دنوں سے ماہم کالج نہیں آ رہی تھی۔ پہلے پہل میں سمجھی کہ فیور ہو گا یا پھر پھوپو زاد کی شادی کی تھکاوٹ اُتار رہی ہو گی اس کا سیل فون بھی OFF جا رہا تھا۔ اب مجھ سے صبر نہیں ہو رہا تھا سو کالج واپسی پر مما کو بتا کر میں اس کے ہاں چلی آئی تھی۔

ماہم کی امی بہت تپاک سے ملی تھیں مگر ساتھ ہی انہوں نے یہ خبر بھی سنائی تھی کہ ماہم کی وجہ سے وہ بہت دکھی تھیں۔ جو دروازہ لاک کر کے سارا دن کمرے میں پڑی رہتی تھی۔

''کیا اب بھی ماہم کمرے میں ہے؟'' میں ماہم سے ملنے کے لیے بیتاب تھی۔

''ہاں بیٹا تم بھی اپنی سی کوشش کر دیکھو۔ ہم تو کہہ کہہ کر پوچھ پوچھ کر تھک گئے کہ ہوا کیا ہے مگر کچھ بتاتی ہی نہیں۔ اچھا کیا تم چلی آئیں چلو کچھ امید تو ہوئی کہ شاید اس کا دماغ ٹھیک ہو جائے۔''

ان کے لہجے کا درجہ میں نے واضح طور پر محسوس کیا تھا۔ ماہم کا دروازہ لاکڈ تھا تین چار کی دستک سے میری آواز پر اُس نے دروازہ تو کھول دیا مگر یہ کیا؟ یہ ماہم تو نہیں تھی۔ فقط پانچ دنوں میں ہی اس کا سرخ وسفید رنگ زردی میں ڈھل چکا تھا۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے نمودار ہو گئے تھے۔ آنکھیں سوجی سوجی سی تھیں جیسے کافی دیر روتی رہی ہو۔ چہرے پر بے پناہ پریشانی' شکنوں سے بھرپور لباس اور بکھرے بال لیے وہ میرے سامنے ایستادہ تھی۔

''ماہم یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے؟''

میں نے تقریباً چیختے ہوئے اسے بازوؤں سے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ میرے اس عمل سے وہ میرے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

''اب روتی ہی رہو گی کہ کچھ بتاؤ گی بھی۔'' قدرے سراسیمگی سے میں نے لب کھولے تھے۔ اس کے آنسوؤں میں اور شدت آ گئی تھی۔

میں نے اندر سے کمرے کا دروازہ لاکڈ کر لیا تا کہ کوئی ڈسٹرب نہ کر سکے۔

شائل مجھ سے بھول ہو گئی بہت بڑی بھول...... کتنا سمجھایا کرتی تھی تم مجھے کہ فہد سے دور رہو اپنی اسٹڈی پر توجہ دو۔ وہ اچھا نہیں ہے۔ محبت ایک فضول چیز ہے۔ مگر...... مگر میں نے تمہاری کسی بات پر کان نہ دھرے اور اب......

اب میں خود سے بھی شرمندہ ہوں۔
"کک...... کیا......؟" میں بھونچکا رہ گئی تھی۔
"ہاں شمائل! پھوپو زاد کی شاپنگ کے لیے جس دن میں تمہارے ساتھ وین میں نہ بیٹھی تھی اس دن فہد مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے آیا تھا اور پھر وہ کچھ ہوگیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اور جب پانچ دن پہلے مجھے اس دن کے "ملن" کے اثرات کا علم ہوا تو فہد کی بہت منت سماجت کی کہ مجھ سے شادی کرلو۔ مگر وہ ...... وہ تو بھنورا ہے بھنورا......"
وہ پھر زار و قطار رو دی تھی اور اس سانحے پر میرا دل پھٹا جا رہا تھا۔
کیا عورت اتنی بے مہر ہے کہ جب چاہا کھیل لیا جب چاہا طاق میں رکھ دیا......؟"
"کیا حوا کو ہر دور میں اس کے کیے کی سزا ملتی رہے گی؟ کیا عورت ہمیشہ "محبت" کے نام پر فریب کھاتی رہے گی؟"
کب تک اس کی معصومیت کو چالباز لوگ داغدار کرتے رہیں گے؟ ماہم کو سینے سے لگائے میں کافی دیر تلک اسے حوصلہ اور تھپکیاں دیتی رہی جبکہ میں خود اندر سے بے حوصلہ ہو چکی تھی۔

☆......☆......☆

اس وقت رات کے دو بج رہے ہیں اور نیند میری آنکھوں سے کوسوں دُور ہے میری نظریں کسی غیر مرئی نقطے پر گڑی ہوئی ہیں اور سوچیں صرف ایک مثلث پر آ کر رُک سی گئی ہیں۔
جی ہاں صرف، ایک مثلث پر فہد، ماہم اور رقیہ۔
کتنی مشابہت اور ربط ہے ان دونوں کی کہانی میں......
دونوں ہی اذیت سے دوچار ہوئیں......
دونوں کو ہی جسمانی و روحانی کرب سے گزرنا پڑا۔
دونوں سے ہی غلطی یا کوتاہی ہوئی۔
دونوں کی زندگی ہی داؤ پر لگی۔
دونوں کی زندگی ہی زیرِ آسیب رہی۔
مگر اس کہانی میں اگر کچھ تبدیل تھا تو فقط یہ کہ رقیہ کو چند دن کے بعد رہائی مل گئی تھی۔ مگر ماہم...... کیا اُسے رہائی مل پائے گی؟ کیا وہ جی پائے گی؟"
نقصان ماہم اور رقیہ دونوں کا ہی ہوا تھا مگر کچھ نقصان کبھی تلافی کی حدود میں داخل نہیں ہو پاتے اور ماہم کا نقصان بھی کچھ ایسا ہی نقصان تھا۔
رقیہ کے آسیب نے ایک وقت کے بعد اس کی جسمانی و روحانی تکلیف سے اُسے نجات دے دی تھی مگر فہد نامی "آسیب" کی دی ہوئی تکلیف کیا وہ بھول پائے گی کبھی؟"
کیا اب امی کا، کرچی کرچی اعتبار پھر سے جڑ پائے گا؟ کیا اس کی آنکھوں میں پھر سے امنگیں، آرزوئیں ہوں گی؟
دونوں کی زندگیوں سے اب 'آسیب' غائب ہو چکا تھا اور حدِ نگاہ تک ایک غبار ہی غبار تھا لیکن اب کسی کو چلنا تھا اور کسی کو ڈھول بجنا تھا۔
محبت ایک لافانی جذبہ ہے اور یہ جذبہ تب محترم ہے جب تک اس جذبہ کے حاصل لوگ معتبر ہیں۔ ہمارے اردگرد کروڑوں لوگ بستے ہیں جن میں سے لاکھوں تو کسی نہ کسی ماہم سے محبت جتلاتے ہیں مگر ضرورت تو اُس کی آنکھ کی ہے جو فہد نامی آسیب کو پہچان سکے۔

☆☆......☆☆

پلکوں پر ٹھہرے خواب

خوبصورت جذبوں کی عکاسی کرتی

بے مثال تحریر جو اپنے پڑھنے والوں پر سحر طاری کردے آخری قسط

''وعلیکم السلام بیٹا تم جلدی آ گئے۔'' غیر متوقع طور پر دیکھ کر مسکرائے۔ ''جی ابو مجھے اتنی فکر ہو رہی تھی اس کی کہ مجھے آنا ہی پڑا۔'' وہ ان کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

''آپ گئے تھے ابو وہاں۔'' اس نے پوچھا۔

''نہیں بیٹا میں تو نہیں گیا مگر وکیل صاحب سے ملاقات ہوئی تھی میری انہوں نے مجھ سے یہ ہی کہا ہے کہ زیادہ فکر کی بات نہیں ہے وہ اگر گھر گئی ہے تو ٹھیک ہے بس انہیں فکر اس کے سب سے بڑے تایا کے بیٹے اصغر کی ہی ہے۔ ان کے مطابق وہ کچھ سر پھرا شخص ہے وصیت سے سب سے زیادہ تکلیف اسے ہی ہوئی ہے اور تشویش کی بات یہ ہے کہ اس گھر پر اور گاؤں میں بھی اس کا راج ہے۔

عالی بڑی توجہ سے سن رہا تھا ہوں ابو میں کراتا ہوں اس بندے کی انکوائری۔''

شمائلہ چائے لے آئی تو دونوں غیر محسوس انداز میں خاموش ہو گئے جیسے اس نے بڑی شدت سے محسوس کیا مگر چپ رہی۔

اگلے دن وہ دونوں ودعیہ کے گھر گئے۔ مگر مایوسی ہوئی گھر والوں کے مطابق وہ اپنی پھپھی کے گھر گئی ہوئی تھی۔ وہ کچھ دیر بیٹھ کر لوٹ آئے۔

☆......☆......☆

''ابا میں نے کہہ دیا ناں کہ اس کڑی سے بات کریں تو مطلب کریں میں چاہتا ہوں کہ اس کی اور دیمو کی بھی شادی کرادی جائے گھر کی بات گھر میں ہی رہ جائے گی۔

''مگر پتر تجھے دیمو کا تو پتا ہے ناں کمزور آواز تایا ابو کی آئی۔''

''کچھ نہیں ہوا اسے بس میں چاہتا ہوں کہ ودعیہ اور دیمو کی شادی جلد از جلد ہو جائے اماں توں بات کرلے بلکہ بات کیا کرنی ہے بس تیاری کر تو شادی کی۔'' اصغر کی آواز آئی۔

ودعیہ کو اپنے پاؤں سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی اس نے تمام باتیں سن لیں تھیں وہ پانی لینے جا رہی تھی کہ آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا وہ دروازے کے قریب ہو کر سننے لگی تھی۔

''اُف خدایا یہ ہو کیا رہا ہے؟'' وہ بڑبڑائی اور پھر آہستگی سے وہاں سے ہٹ گئی۔
اسے نیند نہیں آ رہی تھی وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہی تھی الفاظ ترتیب دے رہی تھی کہ سب کو کیسے بتائے کہ اس کا نکاح ہوا ہوا ہے کہ اچانک اسے تائی کے چیخنے کی آواز آئی وہ تیزی سے باہر کی طرف دوڑی۔
دیمو زمین پر گرا بری طرح تڑپ رہا تھا منہ سے جھاگ نکل رہی تھی ہاتھ پاؤں مڑ رہے تھے۔ ودعیہ کی دبی دبی چیخ نکل گئی۔
''دیمو ہوش کر پتر۔'' تائی کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے وہ اسے سنبھالنے میں لگیں تھیں۔ تایا جی بھی آ گئے وہ بھی دیمو کو تھام کر وہیں بیٹھ گئے، مگر بوڑھی ہڈیوں کی نسبت وہ جوان مرد زیادہ طاقت ور تھا ودعیہ دروازے کی اوٹ سے دیکھ رہی تھی اس کا جسم ہولے ہولے لرزنے لگا۔
''کیا مصیبت؟ کیا ہوا ہے؟ اصغر غصے سے داخل ہوا۔ ایک تو گرمی اوپر سے لوڈشیڈنگ نے مصیبت ڈالی ہے۔ اتنی مشکل سے آنکھ لگی تھی پھر یہ مصیبت۔'' وہ دیمو کو زمین پر پڑا دیکھ کر بولا۔
تائی جی اس کے ہاتھ سہلا رہی تھیں اب وہ پہلے سے بہتر تھا۔
انہوں نے دروازے کی اوٹ میں کھڑے ودعیہ کو دیکھا خوف سے وہ کانپ رہی تھی۔
کل رات والے واقعہ سے بہت ڈر گئی تھی وہ صحن میں نکل آئی وہاں چھوٹی تائی کی سب سے چھوٹی بہو بال سکھا رہی تھی۔ وہ چھاؤں میں بچھی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ وہ اپنی سوچوں میں غرق تھی کہ اسے چارپائی پر ایک اور وجود محسوس ہوا اس نے سر اٹھایا تو شہلا بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔
''پریشان ہو؟'' اس نے ودعیہ کے اترے چہرے کو دیکھ کر پوچھا۔
''نہیں تو۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔
'اچھا اس نے اچھا طنز کیا۔'' پھر اداس ہو گئی۔ ہو گی؟ ہفتہ ہو گیا ہو گا تمہیں یہاں آئے ہوئے ہیں ناں۔''
''جی آج ہو گیا ہے شاید۔'' وہ مسکرائی۔
''بھابھی ایک بات پوچھوں؟'' وہ جھکتے ہوئے بولی۔
''ہاں! ہاں کرو۔'' شہلا متجس ہو گئی۔
''دیمو بیمار ہے کیا؟'' اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔
''ہائے دیمو۔'' وہ آہ بھر کر بولی۔
''ایسا گھبرو جوان ہے مگر بچارے کو۔''
''کیا ہوا ہے اسے؟ ودعیہ نے بات کاٹی وہ بھی متجس ہو گئی تھی۔
''اس پر جن ہے کوئی۔'' وہ رازدرانہ لہجے میں اس کے قریب ہو کر بولی۔
''جب اس پر جن آتا ہے ناں تو منہ سے جھاگ نکلنے لگتا ہے۔ ہاتھ پاؤں مڑ جاتے ہیں کبھی کبھی عجیب آوازیں نکالنے لگتا ہے۔''
''تم نے اس رے ایسے دیکھا ہے کیا؟'' وہ اس کے کان میں بولی۔
جواباً اس نے سر اثبات میں ہلایا۔ وہ گھبرا گئی۔
''ویسے بھی وہ تھوڑا سا سائیں ہے۔ مست رہتا ہے اپنے آپ میں۔ نہ منہ سے کچھ بولتا ہے اور نہ کوئی کام دھندا۔ بس ڈیرے پر پڑا رہتا ہے۔ کبھی کبھار ہی گھر آتا ہے وہ۔'' وہ اسے تفصیل بتا کر بولی۔
''اچھا ودعیہ کے منہ سے بس یہ ہی نکلا۔
''چاچی تجھے دادی بلا رہی ہے۔'' بچے نے آ کر کہا۔

"اچھا چل آ رہی ہوں میں۔" وہ بچے کو دوڑا کر بولی۔
"تم دور ہی رہنا اس سے۔" وہ ہدایت دے کر چلی گئی۔ ادھر ودعیہ ایک اور الجھن میں پھنس گئی۔

☆......☆......☆

"ابو آج میں پھر جاؤں گا ادھر اور پھر وہیں سے فیصل آباد نکل جاؤں گا۔" عالی ناشتے کی میز پر بولا۔
"ہوں ٹھیک ہے کوشش کرنا کہ ودعیہ سے لازماً ملاقات ہو جائے اگر ہو سکے تو اسے وہاں سے لیتے ہی آنا۔"
"ہوں کوشش تو میری بھی یہ ہوگی اور ایک دفع وہاں کے پولیس اسٹیشن بھی جاؤں گا۔ اصغر چوہدری ہے ناں اس کا نام۔ وہ کنفرم کرنے کو بولا۔
"ہاں یہ ہی ہے نام۔" وقار صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔
جبکہ رقیہ بیگم ہونق بنی باتیں سن رہی تھیں انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ عالی وہاں کسی اصغر چوہدری کے لیے جا رہا ہے۔
مگر ان کا موڈ ضرور خراب ہو گیا تھا ودعیہ کے ذکر پر۔ مگر مصلحتاً خاموش رہیں تھیں جانتی تھیں کہ شوہر اور بیٹا دونوں ہی ودعیہ کے نام پر کچھ سننے کو تیار نہیں ہیں مگر ایک چیز جو انہیں پریشان کر رہی تھی وہ ان دونوں کی فکر تھی۔ آخر کو وہ اپنے ددھیال ہی تو گئی ہے ناں کون سا محاذ جنگ پر گئی ہے وہ وہ سوچ رہیں تھیں۔
عالی گاؤں پہنچا تو گاڑی گرم ہو گئی وہ گاڑی وہیں چھوڑ کر پیدل ہی حویلی کی طرف بڑھ گیا۔
وہ اپنے عام کپڑوں میں تھا۔ اس نے بیل بجائی۔
"جی کون ہیں آپ اور کس سے ملنا ہے آپ کو۔" بچے نے دروازہ کھولا۔
"مجھے ودعیہ سے ملنا ہے آپ انہیں بلا دو۔" وہ مسکرایا۔
"ودی باجی سے۔" وہ تصدیق کرنے کے لیے بولا۔
"جی ان سے ہی۔" اس نے اس کے بال بکھیر کر کہا۔
"ٹھیک ہے میں جا کر کہتا ہوں اندر۔" وہ اندر کی طرف دوڑ گیا۔ دروازہ کھلا تھا اسی لیے وہ اندر داخل ہو گیا۔
ابھی وہ صحن تک ہی پہنچا تھا راہداری عبور کر کے ایک مرد اسی کی طرف بڑھا۔
"جی کون ہے آپ اور اندر کیوں چلے آئے؟" اکھڑ لہجے میں پوچھا گیا۔
"میں عالی ہوں۔ ودعیہ سے ملنے آیا ہوں اس کا کزن ہوں۔" دانستہ اس نے اپنا اور اس کا حقیقی رشتہ نہیں بتایا۔ نجانے اس نے یہاں بتایا بھی ہوگا کہ نہیں۔
سامنے کھڑے مرد نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا۔
ودعیہ کچن میں کھانا بنا رہی تھی۔ اسے لگا جیسے عالی آیا ہو اس ہفتے جتنا اس نے عالی کے بارے میں سوچا تھا اتنا تو اس نے خود اپنے بارے میں سوچا نہیں تھا۔
محبت تو کبھی بھی ہو سکتی ہے پھر چاہے وہ شخص ہٹلر ہی کیوں نہ ہو وہ مسکرا دی اور چمچ چلانے لگی۔ اس نے اپنے آپ کو کاموں میں مصروف کرنا چاہا مگر چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اس کی سوچوں کا محور اس کے آس پاس ہی ہے۔
"وہ تو گھر پر نہیں ہے۔" صاف جھوٹ بولا گیا۔
"کہاں ہے وہ؟" اب اسے تشویش ہوئی۔

"کہیں گئی ہوئی ہے وہ اماں کے ساتھ۔" لہجے میں بلا کی سفا کی تھی۔ عالی خاموشی سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ نہیں چاہتا کہ عالی اس سے ملے۔ "یہ شخص اتنا سیدھا نہیں ہے جتنا بن رہا ہے۔" عالی نے قیاس آرائی کی۔

"ویسے آپ کون ہیں؟" عالی نے اس کا تعارف چاہا۔

"اصغر چوہدری کہتے ہیں مجھے۔" گردن اکڑا کر کہا گیا۔

"اوہ..... عالی کی بات سمجھ میں آ گئی۔ میں اس کا انتظار کر لیتا ہوں۔

"اس نے بے بڑی صفائی سے پتہ پھینکا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے جانے کب آئے، وہ آئے گی تو بتا دوں گا۔"

صاف انکار تھا۔

آخر یہ مجھے ملنے کیوں نہیں دینا چاہتا۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی۔ یقیناً کچھ گڑبڑ ہے۔

اصغر ہاتھ پیچھے باندھے اس کے جانے کا منتظر تھا۔

با دل نخواستہ عالی پلٹ آیا مگر اب اس کا ارادہ اصغر چوہدری کے متعلق انکوائری کرانے کا تھا۔

"ایک دفعہ دیکھنے میں کیا حرج ہے۔" ودعیہ نے خود سے کہا اور دوڑ کر باہر آئی وہاں اصغر اکیلا کھڑا تھا۔ عالی نے بس دروازہ عبور کیا تھا۔

"کوئی آیا تھا کیا؟" ودعیہ نے پوچھا۔

"نہیں کوئی نہیں آیا تھا اور تم لڑکی درست حلیے میں رہا کرو۔" کاٹ دار نظروں سے کہا گیا۔

ودعیہ نے جلدی سے دوپٹہ درست کیا وہ شرمندہ ہو گئی۔

اسے اصغر سے بہت ڈر لگتا تھا۔

☆......☆......☆

وہاں سے آنے کے بعد وہ کافی پریشان تھا اصغر چوہدری کی شہرت کچھ اچھی نہیں تھی۔ اس کے نام پر کافی مقدمے درج تھے۔ مگر اثر و رسوخ کی وجہ سے اور پیسے والے ہونے کی وجہ سے کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ وہ مسلسل تانے بانے بن رہا تھا۔

"وہ دو دفعہ ودعیہ سے ملنے گیا تھا اور دونوں دفعہ ہی اسے ملنے نہیں دیا گیا تھا۔" نجانے وہ وہاں کیسی ہو گی۔ اوروں کا رویہ اس کے ساتھ ٹھیک ہو گا بھی کہ نہیں۔" وہ مسلسل سوچ رہا تھا اس نے ابو کو فون کر کے صورت حال سے آگاہ کیا اور وکیل صاحب کا نمبر مانگ لیا۔ پھر وکیل صاحب سے تفصیل سے بات کی اور اصغر کے رویے کا بھی ذکر کیا۔

"دیکھو عالی نے میں پہلے ہی آگاہ کیا تھا اصغر ویسے بھی ہٹ دھرم ہے سارے کا سارا ہولڈ بھی اس کا ہی ہے اور اس کی شہرت کا تمہیں پتہ چل گیا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اسے ودعیہ سے بیر ہے کیونکہ جائیداد کا ایک اہم حصہ اس کے نام ہے اور وہ اسے حاصل کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا ہے تم سمجھ رہے ہو کسی بھی حد تک۔" انہوں نے اسے واضح طور پر آگاہ کیا۔

"جی وکیل صاحب آپ کا شکریہ بہت بہت میں کرتا ہوں کچھ۔" عالی نے فون بند کیا اور نئے سرے سے حالات پر غور کرنے لگا۔

"کب تک رکھنا ہے اس میم صاحبہ کو یہاں۔" چھیدو نے روٹی چنگیر پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اب یہ ساری حیاتی یہیں رہے گی۔" وہ بولا۔

"کیا مطلب ہے؟" چھیدو حیران ہوئی۔

"میں اس کی اور دیمے کی شادی کرا رہا ہوں۔ ایک دو دنوں میں۔ وہ روٹی کھاتے ہوئے بولا۔

"مگر پتر وہ مان جائے گی میرا مطلب ہے کہ اسے دیمو کے بارے میں پتا چل گیا ہے۔" تائی جی

نے بے بسی سے کہا۔
"اسے ماننا ہی ہوگا اماں تم کس لیے ہو اسے مناؤ۔" وہ جھاڑ کر بولا۔
ودعیہ دروازے کی اوٹ میں کھڑی تھی۔آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے وہ اپنا نچلا ہونٹ کاٹ رہی تھی اور اب اس میں سے خون بہہ نکلا تھا۔
"پتر میں نے ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا تھا اس سے۔مگر اس نے عجیب ہی بات کی۔" تائی جان اپنی اور اس کی آخری ہونے والی بات بتانے لگیں۔
"کیا کہا ہے اس نے؟" تیکھے ابرو سے پوچھا گیا۔
"او...... او کہندی پئی سی کہ اندا نکاح ہو چکیا اے۔" انہوں نے ایسے بتایا جیسے غلطی ان کی ہی ہو۔
"جھوٹ بول رہی ہوگی وہ چالاک بننے کی کوشش کر رہی ہوگی وہ مگر وہ جانتی نہیں ہے کہ اصغر چوہدری نے بڑے بڑوں کی چالاکی نکالی ہے۔ پھر وہ ہے کیا چڑیا۔" وہ ہنکار بھر کر بولا۔
"اسے مناؤ سارے مل کے۔" وہ پلیٹ کو ٹھوکر مار کر بولا۔
"اگر وہ نا مانی تو کیا کرے گا توں۔" چھیدو نے روٹی واپس رکھتے ہوئے پوچھا۔
"نہیں مانی تو گاؤں میں حادثے بڑے ہوئے ہیں خاص کر جوان جہان لڑکیوں کے ساتھ۔ کبھی کسی پر جن آجاتا ہے اور کبھی کوئی کنویں میں گر کر مر جاتی ہے۔" وہ غصے سے کہہ کر نکل گیا۔
پیچھے چھیدو اور تائی منہ کھولے بیٹھیں تھیں۔ جبکہ سوئے ہوئے بچے شور سن کر اٹھ بیٹھے تھے۔
آخری بات سن کر ودعیہ کا رنگ اڑ گیا۔اسے اس حد تک اصغر کے جانے کی امید نہیں تھی وہ مرے ہوئے قدموں سے واپس پلٹ آئی۔ بستر پر ڈھے کر وہ زور زور سے رونے لگی۔
سب نے مجھے ہی مشق ستم کیوں بنا رکھا ہے جسے دیکھو میری زندگی اپنی مرضی سے چلانے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ پہلے مامی، پھر عالی اور اب یہ اصغر بھائی۔"
"یا اللہ میری آزمائشیں کب ختم ہوں گی۔ میرے مالک مجھے کب نجات ملے گی۔
اور عالی انہوں نے ایک دفعہ مڑ کر بھی میری خبر نہیں لی وہ تو میرے شوہر ہیں ناں مگر نہیں انہوں نے بھی سوچا ہوگا مصیبت خود ٹل گئی۔ مامی، شمائلہ بھابھی، نائلہ اور خالہ بھی پرسکون ہو گئے ہوں گے کہ نحوسیت ختم ہوئی۔
وہ سب کو یاد کر کے رو رہی تھی۔
"یا اللہ میری مدد کر توں میرے مالک مجھ پر رحم کر۔" اس نے صدق دل سے دعا کی۔
"میے توں جاگ دی پئی ایں۔" تائی کی کمزور آواز آئی۔اس نے جلدی سے اپنی آنکھیں رگڑی وہ نہیں چاہتی تھی کہ انہیں کچھ پتہ چلے کہ اس نے سب سن لیا ہے۔
"جی تائی جاگ رہی ہوں۔" وہ اٹھ بیٹھی۔
"میں تیرے نال گل کیتی سی ناں تیری ویہادی انہوں نے پیار سے کہا۔ تو من جا رانی۔ توں نہیں جاندی اس اصغر نوں بڑا ضدی اے او۔" وہ اسے پچکار کر بولی۔
مگر تائی میرا نکاح ہو چکا ہے عالی کے ساتھ میں کس طرح شادی کر سکتی ہوں۔" وہ ان کا ہاتھ تھام کر بولی۔ اسے ان پر ترس آرہا تھا وہ کس قدر بے بس عورت تھیں اپنے بیٹوں کے ہاتھوں۔
"میرا دیمو بڑا چنگا اے۔" بس کدی کدی مرگی کے دورے پیندے نے۔" انہوں نے اس کے انکار

اور جھوٹ کی وجہ سے دیمو کی حالت گردانی۔

''تائی میں جھوٹ نہیں کہہ رہی میرا نکاح ہوئے پانچ مہینے ہونے والے ہیں۔'' وہ اب بھی ثابت قدم بنی تھی۔

وہ خاموشی سے اٹھ گئیں۔ اور وہ انہیں جاتا دیکھتی رہی۔

ودعیہ محسوس کر رہی تھی جیسے اس کی نگرانی کی جا رہی ہو۔

اس پر نظر رکھی جا رہی ہو۔ ہر وقت چھیدو یا پھر کوئی بچہ اس کے آس پاس ہوتا اسے سمجھنے میں زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا۔ کہ یہ سب کس کے کہنے پر ہو رہا ہے۔

دیمو کو اس نے اس کے بعد نہیں دیکھا تھا۔ شاید ڈیرے پہ تھا۔

وہ چارپائی پہ بیٹھی کہ اچانک اصغر آ گیا۔

''چھیدو لسی لے ٹھنڈی سی۔'' اس نے چھیدو کو آواز لگائی ودعیہ اس کو دیکھ کر کچھ اور سمٹ گئی۔

''توں تیاری رکھ تیرا اور دیمو کا کل مغرب کے بعد نکاح ہے اور زیادہ ہوشیاری دکھانے کی کوشش نہ کرنا ورنہ جان سے جائے گی تھی۔'' وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

چھیدو لسی کا جگ لے آئی۔

وہ لسی پی کر بولا۔ ساری حیاتی اس وادے کی خدمتیں ہم نے کی اور جب پھل کھانے کی باری آئی تو سب سے میٹھا پھل وہ تجھے دے گیا۔''

ودعیہ ناسمجھی سے اسے دیکھتی رہی وہ کس پھل کی بات کر رہا ہے۔

''اس بڈھے کو بھی پتہ نہیں توں کہاں سے اتنے سالوں بعد یاد آ گئی۔

سب سے قیمتی زمین وہ تیرے نام کر گیا ہے آج وہ لاکھوں کی ہے کل وہ کروڑوں کی ہو جائے گی۔'' وہ ہنکارا۔

ودعیہ کو ساری بات سمجھ میں آ گئی تو یہ سب اس زمین کے لیے کیا جا رہا ہے۔ جس سے اب تک وہ لاعلم تھی۔''

''یاد رکھیں کل تیرا نکاح ہے تیار رہیں۔'' وہ اسے تنبیہہ کر کے چلا گیا۔

''ہونہہ چھیدو بھی چلی گئی جبکہ وہ وہیں بے بسی سے آنسو بہاتی رہ گئی۔'' اے خدا تو سب جانتا ہے نا میری مدد کر میرے مولا۔'' اس نے ایک بار پھر خدا کو یاد کیا۔

نینداس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی رو رو کر اس کا سر بھاری ہو گیا تھا۔

اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے سے کیا ہوگا ودعیہ۔ اٹھ کوئی حل نکال اس طرح نکاح پر نکاح کیسے ہو سکتا ہے۔ میں یہ گناہ نہیں کر سکتی۔''

وہ اپنے آپ کو ہمت دے رہی تھی پھر ایک عزم کے ساتھ اٹھی رات کا نجانے کون سا پہر تھا فضا میں صرف جھینگوں کی تیز آواز گونج رہی تھی۔ اس نے ساتھ لیٹی تائی کو دیکھا وہ سو رہی تھیں وہ دبے قدموں سے نکلی۔ ایک دل کیا کہ بھاگ لے وہ اسی ارادے سے باہر کی طرف دوڑی۔ گیٹ سے باہر اصغر نے اپنے بندے کھڑے کیے ہوئے تھے۔ اور پالتو کتے اس نے صحن میں چھوڑ رکھے تھے۔ اس نے حالات کا جائزہ لیا۔ ذرا سا سر باہر نکالا اور دیکھا پورے صحن میں صرف ایک بلب روشن تھا جس کی روشنی ناکافی تھی۔ آنسوؤں سے آنکھیں دھندلا گئیں تھیں ٹھوکر سے کوئی برتن گر پڑا ساتھ ہی فضا میں کتوں کی آوازیں گونج گئیں وہ الٹے قدموں اندر بھاگی۔

''کیا ہوا ہے؟'' اصغر نیند میں باہر آیا۔

''ادھر کوئی آیا ہے کیا؟'' باہر سے آواز سن کر

اس کے بندے بھی آ گئے تھے۔اس نے انہوں سے پوچھا۔

''نہیں ادھر تو کوئی نہیں ہے۔'' انہوں نے لا علمی کا اظہار کیا۔

''ہوں ٹھیک ہے۔دھیان رہے کسی پرندے کو بھی میری اجازت کے بغیر نہیں جانے دینا۔'' وہ ہدایت دے کر اندر آ گیا۔

اپنے کمرے کی طرف جاتے اس کے قدم رکے وہ چند لمحے کھڑا جائزہ لیتا رہا پھر وہ اس کمرے کی طرف بڑھا جہاں ودعیہ تھی۔

ودعیہ سانس تھامے لیٹی تھی اصغر نے دروازہ کھولا اور اندر آیا تسلی کر لینے کے بعد وہ اپنی جگہ پر ہے وہ باہر نکل گیا۔ودعیہ نے رکا ہوا سانس لیا۔کچھ دیر تک تو وہ لیٹی رہی پھر اٹھ کر اس کمرے میں گئی جہاں فون ہوتا ہے۔

اطمینان کر لینے کے بعد کہ وہاں کوئی نہیں ہے اس نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔کسے فون کروں میں گھر میں کیا تو سب پریشان ہو جائیں گے پھر اچانک عالی کا خیال آیا۔ہاں عالی کو کرتی ہوں اس نے ریسیور اٹھایا۔ڈر کے مارے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔بار بار اس کی نگاہیں دروازے کی طرف اٹھ رہی تھیں کہ کوئی آ نہ جائے گھبراہٹ کی وجہ سے اسے عالی کا نمبر بھی ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا تھا۔

دو تین دفعہ اس نے نمبر ملایا پھر خود ہی کاٹ دیا۔

''اللہ میں کیا کروں مجھے ٹھیک سے نمبر بھی یاد نہیں آ رہا۔''

اس نے بے بسی سے کہا۔

پھر ریسیور ہاتھ ہاتھ میں ہی پکڑا اس نے خود کو کمپوز کیا لمبی سانس لی پھر اپنی تمام ہمت جمع کر کے اس نے ذہن پر زور ڈالا اور اللہ کا نام لے کر نمبر ملایا۔

موبائل کی مسلسل بیل سے اس کی آنکھ کھل گئی۔

اس نے گھڑی کو دیکھا۔رات کے 2 بج رہے تھے خدا خیر کرے اس وقت کس کا فون ہے۔'' اس نے Yes کا بٹن پش کیا۔

''ہیلو!'' بھاری سی آواز اس کی سماعتوں پر پھوار بن کر گری۔

ہیلو......ہیلو......وہ مسلسل بول رہا تھا۔

عالی اس نے بمشکل تمام ہمت جمع کر کے کہا۔

''ودعیہ تم......تم ہی ہوں ناں۔'' عالی کو عجیب سی خوشی ہوئی وہ نہ جانے کتنے دنوں بعد اس کی آواز سن رہا تھا۔

''تم نے اس وقت فون کیا سب ٹھیک ہے نا۔وہ اس کے بے وقت فون کرنے پر پریشان ہوا۔

''عالی آپ......آپ آ جائیں مجھے لے جائیں یہاں سے پلیز۔'' روتے ہوئے اس نے بات کی۔

''ودعیہ تم ٹھیک ہو نا؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''عالی آپ آ جائیں پلیز اس نے التجا کی۔یہ لوگ......یہ لوگ میرا......میرا۔'' ہچکیوں کی وجہ سے اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

اچانک دروازے کی کنڈی بجی تو ودعیہ کی جان حلق میں آ گئی۔

اس نے کھڑاک سے فون بند کر دیا اور گردن گھما کر دیکھا وہاں تائی کھڑی تھیں۔

''ہیلو......ہیلو ودعیہ۔'' وہ زور سے بولنے لگا مگر دوسری طرف رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔

''اوہ گاڈ وہ یقیناً کسی بڑی مصیبت میں پھنس گئی ہے مجھے وہاں جانا ہو گا۔'' وہ بستر سے اٹھتے ہوئے بولا۔نیند تو اس کی ہوا ہو گئی تھی اوپر سے ودعیہ کی فکر

جواب اس کی دھڑکنوں میں شامل ہو گئی تھی وہ اسے کیسے کسی تکلیف میں برداشت کر سکتا تھا ودعیہ کے وہاں جانے سے اسے احساس ہوا کہ وہ اسے کتنی شدت سے چاہنے لگا ہے پہلے اسے لگا کہ شاید یہ وقتی جذبہ ہو مگر وہ بات نہیں کرتی تھی مگر اسے دکھ کر اطمینان رہتا تھا مگر اب اسے اتنے دنوں سے دیکھا بھی نہیں تھا تو اسے سکون نہیں مل رہا تھا وہ اسے شدت سے یاد آتی تھی اس کی روئی روئی آنکھیں اس کی سادگی اس کا کترانا وہ کتنا مس کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

جب سے وہ اصغر سے مل کر آیا تھا تب سے اس نے کافی معلومات کرائی تھی اس کے پاس کافی ثبوت اکٹھے ہو گئے تھے اس کے خلاف۔ اس نے ودعیہ سے ملنے نہیں دیا تھا اس لیے اس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہاں ودعیہ کے ساتھ حالات ٹھیک نہیں ہیں مگر اصغر کے معاملے کی وجہ سے وہ کافی بزی رہا تھا۔

اس کے کافی کیسز چل رہے تھے۔ مگر وہ ایک شاطر انسان تھا۔

نہ جانے کون سے پہر اس کی آنکھیں سر درد کے باعث کھل گئیں تھیں۔

دروازے کے باہر راہداری میں چھیدو چہک چہک کر اس کے نکاح کے بارے میں نسیمو کو بتا رہی تھی۔

”ہائے اللہ یہ مان گئی اس دیمو سے نکاح پہ......“ نسیمو حیران ہو کر بولی۔

”ہونہہ یہ کیسے نہ مانتی اس کے تو فرشتوں کو بھی ماننا تھا آخر کو اصغر نے فیصلہ کیا تھا اور کس کی مجال جو اس کے سامنے زور سے سانس بھی لے۔“ اس نے اکڑ سے کہا۔ جبکہ نسیمو نے افسوس سے بستر پر پڑی ودعیہ کو دیکھا اور باقیوں کو بتانے چل دی آخر کو اس گھر کے پتر کی شادی تھی۔

ودعیہ کو وقت کا اندازہ نہیں تھا مگر کھڑکی سے اندر آتی سورج کی تیز روشنی اسے بتا رہی تھی کہ دن چڑھے بہت زیادہ دیر ہو گئی ہے۔

”کیا میری زندگی میں بھی بہت دیر ہو گئی ہے؟“ ایک بار پھر وہ بے بسی سے سوچنے لگی۔ مجھے تو لگتا ہے شاید یہ میری زندگی کی یہ آخری صبح ہے دل تو مردہ ہو ہی گیا تھا اس جسم کا کیا روح سے ناتا ہی ٹوٹنے کی دیر ہے یہ بھی مردہ ہو جائے گا ناامیدی اس کے اندر سمانے لگی تھی مگر پاک پروردگار نے اسے آج ایک نئی زندگی دینے کا فیصلہ کیا ہوا تھا وہ انجان تھی وہ شاید بھول رہی تھی کہ خدا کے کام مصلحت کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا اور حالات سے ناامیدی رکھنا کفر ہے۔

”نی چھیدو اصغر کتھے ہے؟“ تائی نے چھیدو کو پکارا جو بڑی محنت سے اپنا کام والا بھاری سوٹ شام کے لیے استری کر رہی تھی۔

”او تے ڈیرے تے گیا اے کہہ رہا تھا کہ کوئی کم ہے دیمو کو بھی او وہاں ہی سے تیار کرا کر لے آئے گا۔“ اس نے تفصیل بتائی۔

”توں ودعیہ دے کپڑے استری کر دتے نے۔“ انہوں نے صندوق سے کچھ نکالتے ہوئے کہا۔

”ہاں کہہ دتا سی رانی نوں میرا لہنگا پہنا دیں گے۔“ وہ دوپٹہ ہینگر میں ڈالتے ہوئے بولی۔

”لے بھلا توں اصغر کوں کہ دیتی کہ بچی کے لیے کم سے کم ایک عیا جوڑا ہی لے آندا۔ اچھا اتنا بڑا دن ہے اس کے لیے۔“ وہ افسوس سے بولیں۔

”کوئی گل نہیں اماں بعد وچوں لے دواں گے۔ وہ اب قمیض پر استری کر رہی تھی۔

”ہاں ٹھیک اے۔“ وہ تھیلی کھول کر بولی۔

ودعیہ کے پورے جسم میں درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں سر درد سے بہت بھاری ہو رہا تھا اس میں اٹھنے

کی ہمت نہیں تھی وہ چپ لیٹی تھی۔
"وڈی باجی اٹھیں۔" چھیدو کا سب سے چھوٹا بیٹا اسے بازو سے پکڑ کر ہلا رہا تھا۔
اس نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔
"اٹھیں آپ سے کوئی ملنے آیا ہے میں نے اسے بڑے کمرے میں بٹھایا ہے جائیں مل لیں۔ وہ کہہ کر نکل گیا۔
وہ بستر سے بڑی مشکلوں سے اٹھی تو سر چکرا گیا بروقت اگر وہ بستر کا سہارا نہ لیتی تو گر جاتی۔
وہ بمشکل دیواروں کا سہارا لے کر بڑھی کمرے میں داخل ہوئی تو پولیس کے یونیفارم میں وہ اس کی طرف پشت کر کے کھڑا تھا۔
ودعیہ کے اندر زندگی کی لہر دوڑ گئی۔
"عالی!" اس کی کمزور مگر خوشی میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ شاید زندگی میں پہلی بار اسے عالی کو دیکھ کر بے انتہا خوشی ہو رہی تھی عالی اس کی طرف مڑا۔ اسے ودعیہ کو دیکھ کر دھچکا لگا۔ وہ پہلے بھی بہت صحت مند نہیں تھی مگر اب وہ تو بہت کمزور لگ رہی تھی چہرہ لال ہو رہا تھا اور بال بکھرے ہوئے تھے۔
"ودعیہ تم ٹھیک ہو وہ فکر مندی سے آگے بڑھا۔
ودعیہ چند قدم آگے بڑھی اور اس کے فراغ سینے میں سما گئی۔
عالی آپ آ گئے وہ آنکھیں بند کیے اس کے مضبوط سینے سے لگی تھی۔
جیسے وہ بہت محفوظ ہاتھوں میں آ گئی ہو۔
عالی کو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس طرح گرم جوشی سے ملے گی وہ اس افتاد پر حیران بھی تھا اور خوش بھی اس نے اسے اپنی مضبوط بانہوں میں بھر لیا۔
ودعیہ کے جسم کی حرارت جب عالی کے جسم سے ٹکرائی تو اسے احساس ہوا کہ وہ دہک رہی ہے۔
اس نے آہستگی سے اسے خود سے جدا کیا اس کے ہاتھ تھامے اسے لگا کہ اس نے جلتے ہوئے کوئلے پکڑ لیے ہوں۔
"ودعیہ تمہیں بہت تیز بخار ہے۔" وہ اسے صوفے پر بٹھاتا ہوا بولا۔
آپ مجھے یہاں سے لے جائیں عالی مجھے یہاں نہیں رہنا۔" آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر نکلے۔
عالی کو اس کے آنسوؤں سے تکلیف محسوس ہوئی تو ہاتھ خود بخود اس کے آنسو پونچھنے لگے۔
"میں تمہیں لینے ہی آیا ہوں۔" وہ مسکرا کر بولا۔
"کون ہو تم؟ چھیدو نے اندر آ کر ان دونوں کو اتنے قریب بیٹھے دیکھا تو اس اجنبی سے بولی جو اس کے آنسو صاف کر رہا تھا۔
"السلام و علیکم......!" عالی آداب نبھاتے ہوئے بولا۔
"وعلیکم السلام......!" آواز کافی تیکھی تھی۔
"کون ہو تم اور ہماری بہو کے ساتھ کیا کر رہے ہو۔"
وہ اس کے یونیفارم سے تھوڑا متاثر ہوئی اسی وجہ سے آواز نارمل ہوئی۔
"بہو......" عالی کو حیرانی ہوئی اس نے ایک نظر ودعیہ پر ڈالی جو دونوں کو ہی دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔
"ہاں بھئی آج اس کا اور میرے دیور کا نکاح ہے۔" وہ بڑے فخر سے بتا کر بولی۔
عالی ابھی اسی بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ خطرناک تیوروں کے ساتھ اصغر داخل ہوا وہ باہر پولیس کی نفری دیکھ چکا تھا آج عالی اپنے پروٹوکول کے ساتھ آیا تھا اسے حالات کی نزاکت کا احساس ودعیہ کے فون سے ہو چکا تھا اسی وجہ سے وہ پوری تیاری کر کے آیا تھا۔

”تم پھر آگئے ہو۔“ عالی کے یونیفارم کا خاطر خواہ اثر ہو رہا تھا۔ تیور تھوڑے دھیمے ہوئے۔
”جی میں پورے حق سے آیا ہوں۔“ عالی تحمل سے بولا۔
”پتر کون آیا ہے؟ رحیم بتا رہا تھا کہ کوئی پولیس والا آیا ہے۔“
تایا جی بھی پولیس والے کا سن کر پریشان ہو گئے۔
”یہ اس کا کزن آیا ہے ابا جی۔“ اصغر ہنکار بھر کر بولا۔
”السلام وعلیکم انکل کیسے مزاج ہیں آپ کے۔“
وہ آگے بڑھ کر ان سے ادب سے ملا۔ اور سر پیار کے لیے جھکا دیا۔
”جیتے رہو پتر تم ودعیہ کے ماموں کے پتر ہو ناں۔“ وہ پیار دیتے ہوئے بولے۔
”جی میں وہی ہوں۔“ وہ مسکرایا۔ ”لگتا ہے ودعیہ نے کسی کو بھی نکاح کے بارے میں نہیں بتایا اس نے سوچا اور ایک ناراض سی نظر ودعیہ پر ڈالی جو بڑی بے چینی سے ہاتھ مروڑ رہی تھی۔ دونوں کی نظریں ملیں تو وہ شرمندہ ہو گئی۔
”انکل آج میں ودعیہ کو لینے آیا ہوں۔“ وہ بڑے مہذب انداز میں بولا۔ اس نے اصغر کو یکسر نظر انداز کر دیا۔
”مگر پتر او.....“ انہوں نے پریشانی سے اصغر کو دیکھا۔“
”یہ کہیں نہیں جائے گی اصغر نے آگے آ کر کہا۔
”کیوں نہیں جائے گی میں تو لے کر جاؤں گا۔“
عالی بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔
”آج اس کا نکاح ہے میرے بھائی کے ساتھ۔“ وہ انگارے برساتی آنکھوں سے بولا۔
”اس کا نکاح نہیں ہو سکتا ہے اور میں اسے پورے حق سے لے کر جاؤں گا وہ بھی اسی انداز میں بولا۔
”چلو اٹھو ودعیہ......“ اس نے مڑ کر ودعیہ سے کہا۔
ودعیہ تو جیسے اسی کا انتظار کر رہی تھی فوراً اٹھ کر عالی کے پیچھے آ گئی۔ اصغر نے ایک گھورتی، غصیلی نگاہ اس پر ڈالی تو اس نے جلدی سے عالی کا بازو تھام لیا۔
”اس کا نکاح کیوں نہیں ہو سکتا اور کون سی حق کی بات کر رہے ہو تم؟“ وہ عالی سے پھر مخاطب ہوا۔
”نکاح اس لیے نہیں ہو سکتا کہ اس کا نکاح ہوا ہوا ہے اور حق میرا یہ ہے کہ بیوی ہے یہ میری۔“ اس نے دھماکا کیا۔“
”اور اسے میرے ساتھ چلنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اس نے سب کو دیکھ کر کہا۔“
وہاں پر سب کو سانپ سونگھ گیا۔
”کیا ثبوت ہے کہ یہ تیری بیوی ہے؟“
”سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نے حق سے میری پناہ لی ہے۔“ اس نے ایک نظر اپنے پیچھے چھپی ودعیہ کو دیکھ کر کہا اور زیادہ ثبوت چاہیے تو میں نکاح نامہ منگوا لیتا ہوں وہ اطمینان سے کھڑا اصغر کی حالت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔
”تم شاید مجھے ٹھیک سے جانتے نہیں ہو تمہیں پتا نہیں ہے کہ تم کس سے پنگا لے رہے ہو۔“ وہ دھمکی دے کر بولا۔
”تمہیں کیا لگتا ہے میں یہاں ایسے ہی آیا ہوں تمہارے بارے میں شاید جتنا میں جان گیا ہوں اتنا تو تمہیں خود بھی علم نہیں ہوگا تمہارے جتنے کیسز بند ہوئے ہیں ناں میں انہیں ری اوپن کروا سکتا ہوں اور اس علاقے کے پولیس اسٹیشن کو جو تم نے اپنا سسرال سمجھ رہے ہو اسی کو تمہارے لیے قبرستان بنانے میں مجھے زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ وہ اسی کی

دھمکی کو واپس کرتے ہوئے بولا۔
اصغر جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔
"اب میں اسے لے کر جا رہا ہوں ہمت ہے تو روک کر دکھاؤ۔ وہ ودعیہ کا ہاتھ تھام کر بولا۔"
اور ہاں اگر میرے جانے کے بعد کچھ کیا تو جتنا بتایا ہے ناں اس سے بھی زیادہ برے وقت کے لیے تیار رہنا ویسے مجھے ایس پی عالی وقار کہتے ہیں وہ اسے تنبیہہ کرتے ہوتے بولا۔
"اچھا انکل چلتے ہیں وہ تایا جی کے سامنے کھڑے ہو کر بولا۔"
وہ ہونق بنے دیکھ رہے تھے۔
ودعیہ سے چلا نہیں جا رہا تھا عالی نے اسے کندھوں سے تھام لیا اور اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔
ودعیہ جھینپ گئی وہ صحن میں آئی تو تائی سے سامنا ہو گیا۔
"جا رہی اے پتر۔" وہ ودعیہ کو دیکھ کر بولیں۔
"جی تائی جی۔" وہ ان کے گلے لگ گئی یہ واحد ہستی تھی جس نے اسے ممتا جیسی محبت دی تھی بے شک وہ اپنی اولاد کے ہاتھوں مجبور ہو گئیں تھیں۔
"جائیے سدا خوش رہو۔" انھوں نے بڑھ کر اس کا ماتھا چوم لیا۔
"تم لوگ جیپ میں آؤ میں گاڑی میں جاؤں گا۔" اس نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا۔
گاڑی وہ خود چلانے والا تھا اس نے ودعیہ کو بٹھایا اور دوسری طرف ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔
ودعیہ نے ایک الوداعی نظر حویلی پر ڈالی اور پھر گاڑی کے شیشے چڑھا دیے اسے یہاں سے بھی زیادہ کچھ خوش گوار یادیں نہیں ملیں تھیں۔
اصغر کا غصے سے برا حال تھا اس نے کرسی کو ٹھوکر ماری اور نکل گیا۔ "اللہ خیر کرے اب چھیدو۔" وہ اس کے تیوروں سے گھبرا کر بولی۔

ودعیہ نے پُرسکون ہو کر آنکھیں بند کر لیں آنکھوں کی جلن تھوڑی کم ہو گئی تھی عالی نے ایک نظر اس پر ڈالی اب وہ پرسکون لگ رہی تھی۔ ودعیہ کو اپنے نزدیک اس طرح پا کر وہ بھی خوش اور مطمئن ہو گیا۔

☆......☆......☆

جب وہ لاہور داخل ہوا تو مغرب ہو گئی تھی۔
آج پھر جلوس نکلے ہوئے تھے مہنگائی کے خلاف لوڈ شیڈنگ کے خلاف لوگ اپنا غم و غصہ ٹائر جلا کر اور چیزیں توڑ پھوڑ کر نکال رہے تھے۔
ہر بڑی شاہراہ کا یہ ہی حال تھا اس نے اپنے ماتحتوں سے کہا کہ وہ ابھی اپنے گھروں کو چلیں جائیں اور دوبارہ گاڑی میں آ گیا۔
وہ جس طرف جا رہا تھا وہاں توڑ پھوڑ اور دھوئیں کے سیاہ بادل تھے جو راستہ ایک گھنٹے کا تھا اس نے وہ پانچ گھنٹوں میں طے کیا۔ مگر ایک بہت طویل پُرسکون راستے سے ہوتا ہوا گھر پہنچا اس نے سہارا دے کر ودعیہ کو باہر نکالا اور اندر لے گیا۔
"ارے ودعیہ اور عالی تم لوگ آ گئے۔" ولی اوپر جاتا ہوا ان دونوں کو دیکھ کر بولا۔
"السلام وعلیکم ولی بھائی۔" ودعیہ نے بمشکل سلام کیا اس کا سر چکرا رہا تھا کمزوری کے باعث اس کا کھڑا ہونا محال لگ رہا تھا ٹانگیں اس کا بوجھ اٹھانے سے انکاری ہو رہی تھیں۔
"وعلیکم السلام۔ Good to see you۔" وہ مسکرا کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔
"بھائی سب کہاں ہیں وہ اسے سہارا دے کر اندر لایا۔ اور خاموشی کا راج دیکھ کر پوچھنے لگا۔
"امی کی طبیعت ناساز ہے وہ جلد سو گئیں اور ابو بھی شاید لیٹ گئے ہیں شائلہ آج اپنی امی کی طرف گئی ہے اس نے تفصیل بتائی۔
"عالی یار تم اسے اوپر لے جاؤ مجھے اس کی

حالت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔'' ولی اس کا سفید پڑتا رنگ دیکھ کر تشویش سے بولا۔
''جی بھائی اسے بہت تیز بخار ہے عالی اسے سہارا دے کر آگے بڑھنے لگا اسی وقت وہ کمزوری کے باعث ڈھے گئی۔
''ودعیہ...... ودعیہ آنکھیں کھولو۔'' دونوں یک دم پریشان ہو گئے۔
''مجھے لگتا ہے کمزوری کے باعث بے ہوش ہو گئی ہے یار تم اسے اوپر لے کر جاؤ جلدی۔'' ولی نے عالی کو اس پر جھکتے ہوئے دیکھا تو بولا۔
''ہاں میں جاتا ہوں۔'' عالی نے اسے اپنی متاع جان کی طرح اپنی بانہوں میں بھر لیا اور لے کر اوپر آ گیا۔
وہ اسے اپنے بیڈ روم میں لے آیا اور بیڈ پر لٹا دیا وہ بے سدھ پڑی تھی رنگت بالکل سفید پڑ رہی تھی۔
عالی اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ ودعیہ ہوش کرو وہ اس کا ہاتھ سہلا کر بولا۔ اس کو ابھی بھی بہت تیز بخار تھا۔ ودعیہ ودعیہ وہ اسے بے قراری سے پکار رہا تھا۔
''عالی۔'' ولی نے پکارا۔
''میں ڈاکٹر لے آیا ہوں۔'' اس نے اپنے ساتھ کھڑے شخص کو دیکھ کر کہا۔
''آئیں پلیز ڈاکٹر انہیں دیکھیں۔'' وہ بیڈ سے اٹھتے ہوئے بولا۔
ڈاکٹر نے ودعیہ کا معائنہ کیا۔
''یہ بہت کمزور ہیں بخار بھی کافی تیز ہے میں انجکشن لگا دیتا ہوں آپ ان کی پٹیاں کریں اور جب انہیں ہوش آ جائے تو یہ دوائیاں دے دیجیے گا۔ وہ پیشہ ورانہ مسکراہٹ سجا کر بولے۔
''انشاء اللہ انہیں جلد ہی ہوش اجائے گا بس انہیں خاص Care کی ضرورت ہے۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔
''Thanks۔'' ڈاکٹر عالی نے ہاتھ ملایا۔
''میں انہیں چھوڑ کر آتا ہوں تم اس کی پٹیاں کرو۔'' ولی ڈاکٹر کو لے کر چلا گیا۔
عالی نے ودعیہ کی پٹیاں کرنا شروع کر دیں ولی بھی آ گیا اور وہیں بیٹھ گیا۔
''ہوا کیا ہے یار اسے یہ اتنی بیمار کیونکر ہو گئی ہے۔'' وہ ودعیہ کی حالت پر افسوس کر کے بولا۔
جواباً وہ مختصر طور پر عالی نے سب کچھ بتا دیا۔
''بچاری نہ جانے کیا قسمت لے کر آئی ہے بچپن سے اب تک اس نے مشکلات کا ہی سامنا کیا ہے اکیلی جان دکھوں، غموں اور مشکلات کا پہاڑ۔'' ولی نے ہمدردی سے کہا۔
''ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ بھائی۔'' عالی نے کہا۔
''پتہ نہیں ابھی اس نے اور کتنی تکلیفیں دیکھنی ہیں۔'' ولی بولا۔
''نہیں بھائی اب اور نہیں اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہونے دوں گا اس کی زندگی کا تاریک باب آج بند ہوا۔ اور میں انشاء اللہ اس کی آنے عالی زندگی کو خوشیوں سے بھر دوں گا یہ میرا اپنے آپ سے وعدہ ہے۔'' عالی نے یقین سے کہا۔
''ٹھیک ہے یار میں چلتا ہوں اگر کوئی مسئلہ ہو تو مجھے بتا دینا مجھے صبح آفس بھی جانا ہے۔'' ولی نے اٹھتے ہوئے کہا۔
''Thanks بھائی۔''
''ہوں وہ اس کا کندھا تھپتھپا کر بولا۔
تقریباً گھنٹے بعد جا کر اس کا بخار اترا۔ عالی نے پٹیاں کرنا بند کیں اس نے گھڑی دیکھی رات کا ایک بج رہا تھا۔
وہ بیڈ کی دوسری طرف آیا اور کراؤن سے ٹیک

لگا کر بیٹھ گیا۔ ٹانگیں بھی سیدھی کر لیں وہ کل سے اب تک اتنا پریشان رہا تھا اور ودعیہ کے فون کے بعد سے وہ چین سے نہیں بیٹھا تھا اب اس کا تھکن کے مارے برا حال ہو گیا تھا۔ تھکن کے باعث اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

ودعیہ نے کسمسا کر آنکھیں کھولنے کی کوشش کی بے دھیانی میں اس کا ہاتھ عالی پر گرا۔ عالی کی آنکھ کھل گئی۔

ودعیہ کو ہوش میں آتا دیکھ کر وہ فوراً اس کی طرف جھکا۔

''ودعیہ'' ''تم ٹھیک ہو اس نے اس کے چہرے کو تھپتھپایا۔

''ہوں......ہوں'' ودعیہ نے مشکل سے آنکھیں پوری وا کیں۔

''پانی'' اس نے دھیمی آواز میں سوکھتے حلق سے کہا۔

''آہاں اٹھو شاباش۔'' اس نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور فوراً دوسری طرف آ کر جگ سے پانی نکالا اور اسے پلایا۔

اس نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا اور دوبارہ گلاس عالی کی طرف بڑھایا۔

''اور چاہیے۔'' اس نے پیار سے پوچھا۔

ودعیہ نے نفی میں سر ہلایا۔ عالی نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ماتھے پر رکھا۔

''بخار تو کم ہو گیا ہے تمہارا تم نے کچھ کھایا ہوا ہے کیا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہوں اس نے ایسے پوچھا جیسے سمجھ میں نہ آیا ہو کیا کہا گیا ہے۔

''میں تمہارے لیے کچھ لاتا ہوں، کھانے کو پھر دوا لینا او کے۔'' وہ چمکارتے ہوئے کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

ودعیہ نے سر کو مسلا اور ارد گرد کا جائزہ لیا وہ اچھل پڑی۔

وہ عالی کے کمرے میں ہے وہ یہ جان کر ہی اچھل کر بیڈ سے اٹھ گئی۔

وہ جانے کو پر تول رہی تھی کہ عالی ٹرے میں دودھ اور سلائس لے کر کمرے میں داخل ہوا۔

''کیا ہوا ہے تمہیں؟'' وہ گھبرا گیا اسے ایسے کھڑا دیکھ کر وہ ابھی ٹھیک نہیں تھی۔

''وہ میں میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔'' وہ سر جھکا کر بولی۔ کون سا کمرہ؟ عالی نے مزے لے کر کہا۔

''اپنے کمرے میں۔'' وہ دھیمے لہجے میں سر جھکا کر شرم سے بولی۔

''اچھا لیکن تم کہیں نہیں جا رہیں کیونکہ اب سے یہ تمہارا بھی کمرہ ہے اور میرا بھی۔'' وہ ٹرے بیڈ پر رکھ کر اس کے مقابل آ گیا اس نے اسے کندھوں سے تھاما اور بیڈ پر بٹھا دیا۔

''یہ کھا لو اور پھر دوائی لے لینا اور چپ کر کے سو جانا......'' وہ اس کو تنبیہہ کر کے بولا۔

''میں کپڑے چینج کر لوں ابھی تک میں نے یونیفارم ہی پہن رکھا ہے۔'' وہ مسکرا کر واش روم میں داخل ہوا۔

ودعیہ کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے وہ ہاتھ گود میں رکھ کر بیٹھی تھی کہ عالی چینج کر کے بھی آ گیا۔

''تم نے اب تک کھایا نہیں۔'' وہ اس کے مقابل بیٹھ کر بولا۔

''جلدی سے کھاؤ پھر دوائی دیتا ہوں تمہیں۔'' وہ دودھ کا گلاس اس کی طرف بڑھا کر بولا۔

ودعیہ نے چپ کر کے گلاس تھام لیا عالی مسکرایا۔

''تم تو اچھی لڑکی بنتی جا رہی ہو ودعیہ۔''

ودعیہ نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا اور زیرِ لب مسکرائی۔

''یہ دوائی لے لو۔'' اس نے ٹیبلیٹ اسے تھمائی۔ ''اب تم سو جاؤ ودعیہ تمہاری طبیعت ابھی پوری طرح سنبھلی نہیں ہے۔'' وہ کہہ کر اٹھ گیا۔

''میں یہاں کیسے سو سکتی ہوں؟'' وہ گھبرا کر اٹھ گئی۔

''کیوں نہیں سو سکتی تم میری منکوحہ ہو اور اپنے شوہر کے کمرے میں سونے کے لیے تمہیں کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ تیور بدل کر بولا۔

''پھر میں یہاں......'' وہ بلش ہو گئی چہرے پر قوس قزح کے رنگ بکھر رہے تھے۔

عالی کو یہ جھلمل سی قوس و قزح پر ٹوٹ کر پیار آیا وہ چند قدموں کا فاصلہ طے کر کے اس کے سامنے آیا۔

''جانتی ہو ودعیہ مجھے تم سے کبھی ہمدردی نہیں رہی تھی بڑی نفرت کرتا تھا میں تم سے۔'' وہ ایک جذب کے عالم میں بول رہا تھا۔

ودعیہ نے نظریں اُٹھا کر بدلے ہوئے عالی کو دیکھا۔

یہ وہ عالی نہیں تھا جس سے وہ ہمیشہ بے زار رہتی تھی یہ تو ایک الگ ایک منفرد عالی تھا جو اس کے دل کے تخت پر چپکے سے براجمان ہو گیا تھا۔

''پھر جب سے تم سے نکاح کا فیصلہ کیا تب شاید تم پر ترس آ گیا تھا مجھے پیار و محبت جیسے جذبات شاید اس وقت بھی میرے دل میں نہیں تھے مگر شاید یہ ہمارے درمیان مقدس رشتہ ہی وجہ بنا میرے دل میں تمہارے لیے پیار کا جذبہ پیدا کرنے کا۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔

ودعیہ کے گال لال ہو رہے تھے آج اس کی آنکھوں میں نفرت یا بیزاری نہیں تھی بلکہ وہی رنگ جھلک رہے تھے جو عالی کی آنکھوں میں تھے زندگی میں پہلی بار عالی کو سننا اسے اچھا لگ رہا تھا۔

''جانتی ہو جب تم مجھ سے فون پر بات نہیں کرتیں تھیں جب میں آتا تو کتراتیں تھیں مجھے عجیب بے چینی ہو جاتی تھی تم پر غصہ بھی بہت آتا تھا اس کے اوپر وہ نائلہ۔'' وہ خفگی سے بولا۔

''آپ پہلے نائلہ کو چاہتے تھے ناں عالی؟'' ودعیہ نے بے ساختگی سے پوچھ لیا۔

''کم آن...... میں بھلا اس میک اپ کٹ کو کیوں چاہنے لگا عجیب بے ہودہ لڑکی ہے وہ''۔

''پتہ ہے جب تم وہاں تھیں حویلی میں تو مجھے تمہاری کتنی فکر ہو گئی تھی سارا غصہ جو تم پر تھا ہوا ہو گیا۔ پھر مجھے شدت سے احساس ہوا کہ تم نے تو میرے دل پر قبضہ جما لیا ہے اور میرا دل اب میرا نہیں رہا۔'' وہ اپنا ہاتھ سینے پر رکھ کر بولا۔

''کل تمہارے فون کے بعد مجھے لگا کہ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو شاید میرا جینا ناممکن سہی لیکن بہت دشوار ہو جائے گا۔''

وہ اس کو شانوں سے پکڑ کر اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

''آج میں تم سے برملا کہہ رہا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے ودعیہ شاید محبت تمہیں بھی ہے ناں مجھ سے کیونکہ تمہاری آنکھوں کی چمک اور چہرے کی حیا یہ بتا رہی ہے کہ جو میں سوچ رہا ہوں وہ صحیح ہے۔

ہے ناں وہ اشتیاق سے بولا۔

ودعیہ نے شرما کر سر جھکا لیا۔

عالی اور اس کے درمیان بہت کم فاصلہ تھا۔

''اب میں جاؤں۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''کہاں جانا ہے؟ آپ کو زوجہ عالی۔''

''اپنے کمرے میں۔''

''یہ بھی تو تمہارا ہی کمرہ ہے اور سامنے کھڑا یہ

نوجوان تو پور پور تمہارا ہے۔'' وہ شوخ ہوا۔
''ودعیہ سائیڈ سے نکل کر بڑھی تو عالی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
پاس ہی مسجد سے فجر کی اذان آنا شروع ہوئی مؤذن خدا کے بندوں سے ملاقات کرنے کے لیے نیند کی وادی سے واپس بلا رہا تھا۔
''ودعیہ جس طرح یہ اذان فجر حق ہے اور سچ ہے ناں۔ یہ اذان کے بول پاکیزہ ہیں اسی طرح ہمارا رشتہ بھی سچ ہے اور میری محبت پاکیزہ ہے تمہیں اس پر اعتبار ہے ناں۔''
ودعیہ نے کھڑکی کی طرف دیکھا جہاں سے اذان کی آواز آ رہی تھی
پھر عالی کو دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔
''مجھے اعتبار ہے......'' وہ کہہ کر نکل گئی۔ آج اسے اذان فجر کے ساتھ سجدہ شکر بھی بجالانا تھا۔
عالی نے ایک لمبا سانس کھینچا اور مسکرا کر آنکھیں بند کر لیں۔

☆......☆......☆

نماز پڑھ کر جو سوئی تو آنکھ 10 بجے کھلی۔ وہ بہت ہشاش بشاش سی اٹھی نہا کر نیچے آئی۔
''السلام وعلیکم ماموں۔'' وہ انہیں دیکھ کر مسکرائی اور ان کی طرف بڑھی۔
وہ ودعیہ کو اچانک دیکھ کر حیران ہوئے اور خوش بھی۔
''وعلیکم السلام بیٹے تم کب آئیں۔'' وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولے۔
رات کو آئی تھی ماموں۔'' وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔
''کس کے ساتھ۔''
''عالی کے ساتھ۔''
''وہ تمہیں لے کر آیا ہے مجھے تو بتایا ہی نہیں کہ تمہیں لینے جا رہا ہے بتا دیتا تو میں بھی آتا۔'' انہیں حیرانی ہوئی۔
''السلام وعلیکم ابو۔'' ولی بھی آ گیا۔
''وعلیکم السلام۔ دونوں نے ہی جواب دیا۔
''تم ٹھیک ہو اب ودعیہ۔'' وہ اخبار لے کر صوفے پر بیٹھا۔
''کیا ہوا ہے تمہیں بیٹا۔'' وقار صاحب فکر سے بولے۔
''ماموں بخار تھا اب میں بالکل ٹھیک ہوں بس تھوڑی کمزوری ہے۔'' وہ مسکرائی۔
''میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔'' وہ اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔
''یہ کب آئے تھے رات کو۔'' وقار صاحب نے ولی سے پوچھا۔
''ابو تقریباً 10، 11 بجے آئے تھے ٹھیک سے وقت مجھے یاد نہیں ہے وہ شہ سرخیاں دیکھتے ہوئے بولا۔
وہ ٹرے لے کر آئی تو مامی بھی آ گئیں۔
''کون تمہیں دوبارہ اٹھا لایا وہاں سے یا پھر وہ خود تمہاری منحوسیت سے تنگ آ کر تمہیں دوبارہ یہاں پھینک گئے ہیں۔'' وہ نفرت سے بولیں۔
''رقیہ خبردار اگر اب تم نے ایسی کوئی بات کی سمجھیں ناں۔''
وقار صاحب ودعیہ کے بولنے سے پہلے ہی بول پڑے۔
''ہونہہ اللہ اللہ کر کے یہ نکلی تھی اب دوبارہ لوٹ آئی ہے۔''
اتنی اہم خبر وہ بھلا کیسے اپنی بہن کے گوش گزار نہ کرتیں لہٰذا الٹے قدموں لوٹ گئیں۔
ان کے فون کا نتیجہ تھا کہ اگلے گھنٹے میں ذکیہ خالہ کے ہمراہ اپنے جگر گوشوں کے موجود تھیں۔

ابھی وہ ناشتے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ وہ لوگ آ گئے۔

وقار صاحب کمرے میں چلے گئے۔

''اے ہے یہ کلموہی ہی دوبارہ کیسے آ گئی۔'' ذکیہ بیگم آنکھیں بچا کر بولیں۔

نائلہ کو تو اس کی واپسی سے پتنگے لگ گئے تھے شمائلہ بھی تفکر سے بیٹھی تھی ہم تو سمجھ رہے تھے کہ بلا ٹلی اب عالی کو کسی نہ کسی طرح منالیں گے کہ اب وہ یہاں تو ہے نہیں وہیں کہیں مر کھپ جاتی تو اچھا ہوتا۔

رقیہ بیگم نفرت سے گویا ہوئیں۔

''اب کیا ہوگا اماں؟'' کیا میری شادی کبھی عالی سے نہیں ہوگی؟'' نائلہ فکرمندی سے بولی۔

''ارے نہیں تو فکر نہ کر۔ مجھے یقین ہے عالی کا اس سے کوئی دل لگاؤ نہیں ہے وہ اسے ضرور چھوڑ دے گا۔ اسے چھوڑنا ہی ہوگا اس بدکردار کو۔'' رقیہ بیگم اسے تسلی دے کر بولیں۔

''بس آپا جو بھی کرنا ہے آج ہی کر لو میں تمہارے لیے اپنی بیٹی کو ساری زندگی نہیں بٹھا سکتی اس کے ایک دو بہت اعلیٰ رشتے ہیں وہ تو بڑا اصرار کر رہے ہیں مگر مجھے تمہاری محبت کا پاس ہے آج کا آج ہی فیصلہ کر لو ہاں۔'' ذکیہ بیگم نے ان پر دباؤ ڈالا اور جھوٹ بولا۔

ہاں خالہ اب بہت ہو گیا آج ہی بات کر لیں آپ عالی سے اور اس ودعیہ کو چلتا کریں۔'' شمائلہ نے بھی وزن ڈالا۔

''Good Morning everyone''۔

عالی بڑے اچھے موڈ میں ہشاش بشاش سا نیچے اُترا۔

واہ جی واہ آج تو بڑے بڑے لوگ آئیں ہیں۔'' وہ خوشگوار موڈ میں بولا۔

گیلے بالوں میں سفید کرتے شلوار میں ریلیکس سا وہ بہت ہینڈسم لگ رہا تھا۔

''آپ کب آئیں۔'' وہ ذکیہ خالہ سے بولا۔

''بس ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی ہے۔'' وہ بجھ جانے والے انداز میں بولیں۔

''تم کب آئے ہو عالی......؟'' نائلہ بڑی ادا سے بولی۔

''رات کو آیا تھا میں اور ودعیہ اکٹھے آئیں ہیں Infact میں ہی اسے لایا ہوں۔'' وہ ذرا تفصیلی جواب دے کر بولا۔

''تم اسے لائے ہو......؟'' رقیہ بیگم حیران ہوئیں۔

''جی۔'' وہ مسکرایا۔

ودعیہ لوازمات لے کر لاؤنج میں آئی۔

ودعیہ کو دیکھ کر چمک عالی کی آنکھوں میں اتر آئی اور لب خود بخود مسکرائے۔

ودعیہ بھی عالی کو دیکھ کر جھینپ کر مسکرا دی۔

نائلہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اسے اپنے سارے کھیل پر پانی پھرتا ہوا محسوس ہوا اس نے شمائلہ کی طرف دیکھا۔ وہاں کا حال بھی مختلف نہ تھا۔

''آپ کے لیے ناشتہ لاؤں؟ ودعیہ نے پوچھا۔

نہیں ناشتہ نہیں بس یار ایک کپ چائے دے دو۔'' وہ پر تکلف سا بولا۔

''رضوان یار تم سناؤ کہ کوئی کام وام شروع کیا کہ آوارہ گردی کے ہی شدائی۔'' ودعیہ کے جانے کے بعد وہ رضوان کی طرف متوجہ ہوا۔

''ہاں کوشش کی تو ہے کوئی کام مجھے اپنے لائق نہیں لگتا۔''

''ہاہاہاہا ہاں ہاں بالکل اپنے لائق کیا کام ہو سکتا ہے بلکہ آپ کے شایان شان کوئی کام ابھی بنا ہی نہیں۔'' وہ تمسخرانہ لہجے میں بولا۔

''آپا ابھی بات کر لو اس کا موڈ اچھا لگ رہا

ہے۔'' ذکیہ بیگم رقیہ بیگم کے کان میں بولیں۔ مگر پس پردہ وہ کھٹک گئیں وہ یہ معاملہ جلد از جلد نمٹا لینا چاہتیں تھیں۔

ودعیہ چائے لے کر آئی اس نے چائے عالی کو تھمائی اور پلٹنے لگی۔

''تم کہاں جا رہی ہو؟'' وہ کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر بولا۔

''کچن میں جا رہی ہوں۔'' وہ دوپٹہ درست کرتے ہوئے بولی۔

''کبھی ہمارے ساتھ بھی بیٹھ جایا کرو تم کیا ہر وقت کچن کی ملکہ بنی رہتی ہو۔'' وہ اسے اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے بولا۔

نائلہ نے پہلو بدلا اس کا انگ انگ ودعیہ اور عالی کی بے تکلفی پر بے چین ہو رہا تھا۔

''عالی تم اسے واپس کیوں لائے ہو؟'' رقیہ بیگم بلاتمہید باندھے کڑے تیوروں سے بولیں۔

''کیا مطلب امی کیوں لایا ہوں اس کا اپنا گھر ہے اور اپنے گھر میں آنے کے لیے وجہ ضروری نہیں عالی حیران ہوا۔

''اتنی مشکلوں سے اس بدکردار لڑکی سے جان چھوٹی تھی اور تم واپس اس مصیبت کی پڑیا کو لائے ہو۔ وہ ناگواری سے بولیں۔

جبکہ عالی نے پہلو بدلا۔ اور ودعیہ اپنے آپ میں شرمندہ ہو گئی۔

''عالی میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا اس قصہ کو ختم کرو اور نائلہ سے شادی کر لو یہ میری خواہش ہے۔'' تحکمانہ انداز میں کہا گیا۔

''اور میں نے بھی کہا تھا امی کہ میں نائلہ سے شادی نہیں کروں گا۔'' وہ ادب کو ملحوظ خاطر رکھ کر بولا۔

''کیوں کیا برائی ہے ہماری نائلہ میں جو تم شادی نہیں کر سکتے۔'' شمائلہ نے بھی انٹری لی۔

''آپ ایک اچھائی بتا دیں عالی نے لحاظ سائیڈ پہ کیا۔

وقار صاحب بھی شور سن کر باہر آئے۔ وہ تمام واقعات سے یکسر انجان تھے۔

انہوں نے عالی کی نگاہوں میں دبا دبا غصہ محسوس کیا ودعیہ چور بنی اس کے پہلو میں بیٹھی تھی جبکہ رقیہ بیگم اشتعال میں لگ رہی تھیں۔

''بس میں کچھ نہیں جانتی تم اس بدکردار، بدچلن اور منحوس کو طلاق دو اور پھر میں تمہاری شادی نائلہ سے کراؤں گی۔''

''بس امی بہت ہو گیا۔'' عالی غصے سے کھڑا ہوا۔

''اب میں اپنی بیوی کے متعلق ایک لفظ نہیں سنوں گا۔'' وہ انگلی کے اشارے سے بولا۔

''تم اس بدکردار لڑکی کی وجہ سے اپنی ماں سے اس طرح بات کر رہے ہو۔ اس لڑکی کے لیے جو نجانے کہاں دو راتیں منہ کالا کر کے آئی ہے۔ ذکیہ بیگم نے اسے غیرت دلائی۔

''بس کریں خالہ میرا منہ نہ کھلوائیں اگر میرا منہ کھل گیا ناں تو آپ سارے کسی سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہیں گے وہ اشتعال میں بولا۔

ودعیہ کی حالت ایسی تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں وقار صاحب بھی منہ کھولے کھڑے تھے۔

رقیہ بیگم کا رنگ اپنے فرمانبردار بیٹے کے رویے پر اڑ رہا تھا کیا ہوا ہے سب ٹھیک ہے ولی بھی آ گیا ایک کشیدگی فضا میں محسوس کر کے وہ بولا۔

''جی بھائی اب سب ٹھیک ہونے والا ہے۔'' عالی اسے دیکھ کر بولا۔

''اور کیا خالہ آپ نے بدکردار کی گردان لگا رکھی ہے ہاں یہ لڑکی جتنی پاک دامن ہے ناں اتنی آپ کی

بیٹیاں بھی نہیں ہیں۔'' وہ ودعیہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے سامنے لا کر بولا۔
''اور اس کی پاک دامنی کی گواہی میں خود دے رہا ہوں۔'' عالی کے ضبط کا پیمانہ اس کے ہاتھ سے چھلک گیا۔
''عالی زبان سنبھال کر بات کرو یہ تم کس طرح بات کر رہے ہو اپنی خالہ سے۔'' رقیہ بیگم اشتعال سے بولیں۔
''بس امی اب میں لحاظ اور مروت سے بات نہیں کر سکتا۔'' وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔
''اور خالہ آپ تو جانتیں ہی ہوں گی کہ ودعیہ وہ دو دن کہاں گزار کر آئی ہے، ہے ناں۔ وہ ذکیہ کی طرف مڑا۔
''آپ لوگوں ہی نے تو اسے اغوا کیا تھا اس نے دھماکا کیا۔
ذکیہ بیگم کا بھی منہ کھل گیا سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔
''عالی......'' وقار صاحب صوفے کا سہارا لے کر بولے۔
''جی ابو میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں ودعیہ اپنی مرضی سے نہیں گئی تھی اسے خالہ لوگوں نے اغوا کیا تھا۔ اس نے انگلی سب کی طرف اٹھائی۔
خالہ تو نظریں ادھر ادھر پھیرنے لگیں نائلہ، شمائلہ اور رضوان کی حالت قابل دید تھی وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔
''یہ...... یہ الزام ہے ہم پر۔'' نائلہ بمشکل تھوک نگل کر بولی۔
''اچھا جی الزام ہے یہ۔'' عالی نے الفاظ پر زور دے کر کہا۔
''فیدا اور شیدا نام تھے ناں رضوان کے دوستوں کے جن کے ساتھ مل کر اسے اٹھایا گیا تھا اور چھوڑ بھی گئے تھے۔ وہ اب رضوان کو دیکھ کر بولا۔
''وہ نام کر اچھل پڑا۔ اس نے عالی کے تیور دیکھ کر تھوک نگلا صحیح معنوں میں ان کے طوطے اڑ گئے تھے۔
مجھے یہ سب بہت پہلے ہی پتہ چل گیا تھا مگر میں صرف اس گھر کی عزت کے لیے خاموش رہا اور ان دونوں کو میں نے پکڑ بھی لیا تھا دو ہاتھ لگائے کہ طوطے کی طرح بولنے لگے۔
وہ انکشافات پر انکشافات کر رہا تھا رقیہ بیگم بھی حیران و پریشان کبھی عالی کو دیکھتیں تو کبھی ذکیہ بیگم کے جھکے سر کو۔ کیونکہ ان کا بھانڈا پھوٹ گیا تھا۔
''مگر یہ سب کریں گے کیوں یار؟'' ولی زچ ہو گیا تھا اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔
''جائیداد کے لیے وہ جائیداد جو ودعیہ کے دادا نے اس کے نام کی تھی پلان تو بہت خوب تھا خالہ پہلے اغوا کرایا پھر اسے بدچلن ثابت کیا پھر اپنے نکھٹو بیٹے کا رشتہ لے آئیں تاکہ دوسری بار انکار کرنے کا کوئی سوچ بھی نہ سکے۔'' وہ طنز کر کے بولا۔
ودعیہ ہکا بکا کھڑی عالی کو تکے جا رہی تھی۔
وقار صاحب اور ولی ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔
شمائلہ کا شرمندگی کے باعث سر جھکا تھا اسے اپنے گھر کی پڑ گئی تھی آخر کو وہ تو اس کھیل کا اہم حصہ رہی تھی اب کیا ہوگا میرے ساتھ۔'' وہ یہ سوچ رہی تھی۔
نائلہ، خالہ اور رضوان شرمندہ لگ رہے تھے۔
جبکہ رقیہ بیگم کی آنکھوں سے اشک رواں تھے۔
''تم چلو میرے ساتھ۔ عالی نے ودعیہ کا ہاتھ تھاما اور لے کر اوپر جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔
وہ ایک ٹرانس کی کیفیت میں اس کے پیچھے چل پڑی۔

"آپا......" ذکیہ بیگم نے رقیہ بیگم کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔
انہوں نے ہاتھ کھینچ لیا اور اٹھ کر اندر چلیں گئیں وقار صاحب اور ولی بھی اٹھ گئے۔
"سارے کیے کرائے پر عین وقت پر پانی پھر گیا۔" نائلہ نخوت سے بولی۔
"اماں میرا کیا ہوگا۔" شمائلہ کی آواز رندھ گئی۔
"اللہ ہی جانے۔" ذکیہ بیگم نے سر پکڑ لیا۔
عالی اسے لے کر کمرے میں آیا اسے بیڈ پر بٹھایا اور خود دوزانوں ہو کر اس کے سامنے زمین پر ٹک گیا۔
ودعیہ کو بہت بری طرح شاک لگا تھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے عالی کو دیکھ رہی تھی۔
عالی نے اس کے ہاتھ تھامے I am sorry ودعیہ مجھے معاف کر دو مجھے تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہیے تھا۔ وہ شرمندگی سے بولا۔
عالی آپ کو سب پتا تھا پھر بھی آپ چپ رہے آپ کو پتہ ہے مجھ پر کتنی بار بدچلنی کا الزام لگایا ہے سب نے میرے کردار میری عزت کے پرخچے اڑائے گئے اور آپ چپ رہے۔
مجھے بات بات پر طعنے تشنے دیے گئے یہاں تک کہ میرے باپ کو بھی نہیں بخشا اور آپ چپ رہے۔" ودعیہ نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔
"میں جانتا ہوں کہ مجھ سے بھول ہوگئی ہے عالی نے جلدی سے اس کے چہرے سے اس کے ہاتھ ہٹائے۔
"پلیز ودعیہ میری غلطی کو معاف کر دو پلیز۔" وہ التجا کر رہی تھا۔
"عالی آپ بتائیں میں کس کس کی غلطی کو معاف کروں آپ جانتے ہیں پچھلے 6 ماہ میں نے کس کرب سے گزارے ہیں۔

جب، جب مجھ پر الزام لگائے گئے ہیں۔" اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔
"پلیز ودعیہ رو نہیں مجھے تمہارے اس طرح رونے سے تکلیف ہو رہی ہے۔
"میں کوشش کروں گا کہ تمہارے ساتھ ہونے عالی ہر زیادتی کا مداوا کر سکوں تمہیں وہ تمام خوشیاں دوں جن پر تمہارا بھی حق ہے جتنا کہ باقی سب کا۔ وہ اسی عزم سے بولا۔
مگر اس کے لیے تمہیں مجھے معاف کرنا پڑے گا۔ سب سے پہلے بتاؤ معاف کیا۔"
ودعیہ نے آنسو صاف کیے۔ "ہوں! اور سر ہلایا۔"
"Thank you so much۔" ودعیہ تم نے میرے دل سے بہت بڑا بوجھ اتار دیا ہے میں تمہارا شکر گزار ہوں اب تمہیں خود سے الگ ہرگز نہیں رکھوں گا۔ تم میرے ساتھ رہو گی جہاں جہاں میں رہوں گا تاکہ ہمارے درمیان کوئی بھی تیسرا غلط فہمیاں پیدا نہ کر سکے۔ جیسا کہ نائلہ نے کرنے کی کوشش کی۔
"مگر آپ اسے چاہتے تھے ناں عالی اس نے مجھے بتایا اور وہاں سے وہ سوٹ بھی آپ اسی کے لیے لائے تھے حالانکہ لانا اصولاً میرے لیے چاہیے تھا۔
وہ ناراض ہو کر بولی۔
عالی نے جلدی سے کانوں کو ہاتھ لگایا تمہیں کس نے کہا کہ میں اس میک اپ کٹ کو چاہتا ہوں میرے اتنے برے دن نہیں آئے اور وہ سوٹ میں خاص کر تمہارے لیے لایا تھا اتنے شوق سے جو اس نے ہتھیا لیا۔
میرے لیے یہ ہی بہت ہے جو میرے سامنے بیٹھی ہے۔

ودعیہ کے چہرے پر حیا کی لالی آ گئی اس نے فوراً سر کو جھکا لیا اور مسکرا دی۔
شمائلہ ابھی تک اپنی جگہ پر گم صم سی بیٹھی ہوئی تھی ولی باہر سے آیا اسے دیکھا اور نظر انداز کر گیا۔
شمائلہ اس کی بے رخی سے دہل گئی۔ جو بھی تھا ولی اس کا شوہر تھا اور اسے بہت عزیز تھا۔
"ولی ......" اس نے سیڑھیاں چڑھتے ولی کو آواز دی۔ ابھی کچھ نہیں شمائلہ ابھی میں کچھ سننے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ وہ کہہ کر اوپر چلا گیا۔ اور شمائلہ کا اٹھایا ہوا ہاتھ گر گیا اور آنکھیں بھر آئیں۔

☆......☆......☆

اگلی صبح واپس جانے کے لیے تیار تھا وہ نیچے اترا تو اس بار وہ اکیلا نہیں تھا اس کے ساتھ ودعیہ بھی ہمراہ سامان کھڑی تھی۔
"ابو۔" اس نے بیگ نیچے رکھا۔
"تم جا رہے ہو۔" وہ مسکرائے۔
"جی ابو ہم جا رہے ہیں اس نے 'ہم' پر زور دیا۔
وقار صاحب نے گردن موڑ کر دیکھا تو ودعیہ بھی کھڑی تھی۔
"ابو میں نہیں چاہتا کہ کوئی اور مسئلہ ہو گھر میں عجیب کھچا کھچا سا ماحول ہے اور میں نہیں چاہتا کہ ماحول خراب ہو۔
مجھے علم ہے کچھ وقت درکار ہوگا سب کو نارمل ہونے میں۔"
مگر وقار صاحب بولنا چاہتے تھے مگر عالی نے روک دیا۔
"ابو ودعیہ میری ذمہ داری ہے جسے میں نے بخوشی قبول کیا ہے اب آپ مجھے وہ ذمہ داری نبھانے دیں۔" وہ مسکرایا۔
رقیہ بیگم اور شمائلہ شرمندہ شرمندہ سی چور بنی بیٹھیں تھیں۔

"ہوں بیٹا تم ٹھیک کہہ رہے ہو وہ بمشکل مسکرائے۔
"آپ اسے ودعیہ کی رخصتی سمجھیں وہ اپنے میکے سے سسرال جا رہی ہے اپنے شوہر کے گھر۔" وہ ودعیہ کو دیکھ کر مسکرا دیا۔
جواباً وہ بھی مسکرا دی اور حیا سے نظریں جھکا لیں۔
"ہاں ہاں بالکل۔" وقار صاحب اگے بڑھے اور ودعیہ کو ساتھ لگا لیا۔
"مجھے معاف کر دینا بیٹا میں شاید ٹھیک طرح سے تمہاری ذمہ داری نہیں اٹھا سکا۔" وہ شرمندگی سے بولے۔
"نہیں ماموں ایسا مت کہیں وہ تڑپ کر الگ ہوئی آپ نے مجھے بہت پیار بہت مان دیا ہے میں آپ کی بے حد مشکور ہوں۔" وہ ان ہاتھ تھام کر بولی۔
"جاؤ بیٹا اپنے گھر جاؤ۔" وہ اس کا ہاتھ چوم کر بولے۔ اور سر پر پیار دیا۔
"اچھا امی ہم چلتے ہیں۔" عالی ان کے سامنے پیار لینے کے لیے جھکا انہوں نے اس کا ماتھا چوما۔ جاؤ بیٹا خدا کے حوالے۔"
"اچھا مامی چلتی ہوں مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو مجھے معاف کر دیجیے گا۔" ودعیہ ان کے سامنے آئی۔
رقیہ بیگم نے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا ان کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی اور پھر شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرا مگر شرمندگی اور اپنے گذشتہ رویوں کی وجہ سے وہ کچھ بول نہ پائیں۔
پھر دونوں نے شمائلہ کو خدا حافظ کہا اور رخت سفر باندھا۔

☆......☆......☆

رات کو بیڈ پر لیٹے ہوئے وہ شرمندگی سے آنسو بہا رہی تھیں انہیں جب سچائی کا علم ہوا تھا وہ بہت بے

چین ہوگئیں تھیں انہوں نے دوسروں کی باتوں مین آکر ایک یتیم بچی کے ساتھ زیادتیوں پر زیادتیاں کیں تھیں مگر اس صابر بچی نے کبھی پلٹ کر جواب نہ دیا تھا۔

اب وہ اپنے کیے پہ نادم تھیں۔

وقار صاحب ان کی ہچکیوں سے ڈسٹرب ہو کر اٹھے اور لائٹ جلا کر کراؤن میں ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

اب کیا فائدہ آنسو بہانے کا۔ وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر بولے۔

رقیہ بھی اٹھ گئیں مجھے کسی پل چین نہیں آرہا یہ سوچ سوچ کر کہ میں نے اس معصوم کے ساتھ کتنا برا کیا ہے۔'' وہ دونوں ہاتھ گود میں رکھے سر جھکا کر بولی۔

''یہ سب تمہارے کچے کانوں اور دوسرا تمہاری منفی سوچ کی وجہ سے رونما ہوا ہے نہ تم دوسروں کی فضول اور بے معنی باتوں میں آتیں اور نہ اس معصوم کے ساتھ برا کرتیں۔

بلکہ تمہیں تو اس سے دل لگانا چاہیے تھا خدا نے تمہیں اس کے روپ میں بیٹی سے نوازا تھا۔ وہ ہمارے گھر میں رحمت بن کر آئی تھی مگر تم نے اس کے ساتھ برا سلوک رکھا۔

'' میں شرمندہ ہوں وقار مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے یقین مانیں یہ احساس مجھے نہ سونے دے رہا ہے اور نہ ہی چین لینے دے رہا ہے۔'' وہ ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولیں۔

وقار صاحب نے ان کا ہاتھ تھپتھپایا اور بولے۔

''خدا کا شکر ادا کرو ابھی دیر نہیں ہوئی ابھی بھی توبہ کے دروازے کھلے ہیں تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا یہ ہی تمہاری اصلاح کی نشانی ہے اس کریم ذات نے تمہیں اور بھٹکنے نہیں دیا بلکہ تمہیں صحیح راہ کی طرف گامزن کر رہا ہے۔''

'' میں ودعیہ سے مل کر اس سے معافی مانگنا چاہتی ہوں وقار اپنے تمام برے رویوں کی۔''

''ہاں ہاں ضرور میں عالی سے کہوں گا کہ وہ جلد چکر لگائے یا پھر دونوں چلیں گے ان سے ملنے اب تم آرام کرو تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔'' وہ انہیں بستر پر لٹاتے ہوئے بولے۔

☆......☆......☆

ودعیہ کو یہاں آنے کے بعد پہلی بار آزادی کا احساس ہوا تھا۔ یہاں آکر وہ اپنے آپ کو آزاد پنچھی محسوس کر رہی تھی جو ایک طویل عرصہ پنجرے میں رہ کر آزاد ہوا ہو۔ جو آزادی کے بعد آسمان کی وسعتوں کو چھونا چاہتا ہے اور ایک لمبی اڑان بھرتا ہے۔

اسے یہ گھر بہت پسند آیا گھر اچھے طریقے سے ڈیکوریٹ تھا یہاں پر آنے کے بعد اسے کوئی کام بھی نہیں کرنا پڑتا تھا عالی نے اسے سختی سے منع کیا تھا کہ وہ گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگائے گی۔

پھر اسے فارغ رہنے کی کہاں عادت تھی سو وہ ہلکے پھلکے کام خود کرتی تھی خاص کر کچن میں وہ ملازم کے ساتھ کھانا وغیرہ مل کر یا پھر خود بناتی تھی۔

یہاں پر حلقہ احباب نہ ہونے کے برابر تھا رشتے دار تو یہاں تھے نہیں اور چونکہ عالی اکیلا ہوتا تھا تو محلے والوں کے ساتھ تعلقات بھی نہ تھے۔

عالی صبح جاتا اور شام تک اس کی واپسی ہوتی اس دوران وہ اپنی نگرانی میں صفائی کراتی پھر کھانا وغیرہ کا انتظام کرتی تھی۔

اور پھر مالی کے ساتھ مل کر لان کی کانٹ چھانٹ اور پانی وغیرہ ڈلواتی تھی نکھرا نکھرا سا گھر اسے بہت پیارا لگتا تھا۔

یہ اس کا کمال تھا کہ اس کے آنے کے بعد گھر 24 گھنٹے صاف ہوتا تھا ہر چیز چمکتی ہوئی ملتی تھی ورنہ

پہلے ملازم بھی اتنی توجہ سے کام نہیں کرتے تھے اور عالی کو تو اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی کہ گھر میں جھاڑو بھی پھرا ہے یا نہیں۔

اسے آج یہاں آئے ہوئے پانچواں دن تھا۔ وہ مالی سے لان میں کام کرا کر اندر آئی تھی۔ اس نے آج موتیے اور رات کی رانی کے گملے منگوا کر اپنے کمرے کی کھڑکی کے سامنے لگوائے تھے تاکہ ان کی خوشبو سے کمرہ معطر رہے اسے ان کی خوشبو بہت پسند تھی اندر آ کر اس نے ہاتھ لیا اور پھر ملازمہ سے چائے کا کہا اور لاؤنج میں آ گئی۔

باہر کالی گھٹائیں چھا رہی تھیں اس نے بڑھ کر کھڑکیاں کھول دیں گھڑی پر نظر دوڑائی اور مسکرا کر زیر لب بولی۔

''وہ آنے والے ہوں گے۔'' پھر اس نے ملازمہ سے اس کے لیے بھی چائے کا کہا اور خود کھڑکی میں سر ٹکا کر باہر کے موسم سے لطف اندوز ہونے لگی۔

شام ڈھل رہی تھی آسمان پر کالی گھٹاؤں کا راج تھا اور ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوائیں درختوں کے پتوں سے اٹکھیلیاں کر رہی تھیں پتوں کی سنسناہٹ فضا میں مدھر موسیقی سنا رہی تھی وہ ماحول میں بری طرح غرق تھی جب عالی نے آ کر اسے پیچھے سے پکڑ لیا۔

اس کی دبی چیخ نکل گئی وہ اس کے سر پر ٹھوڑی جما کر بولا۔

''کیا کر رہی تھیں یہاں زوجہ محترمہ۔'' وہ شوخ ہو کر بولا۔

یہاں آنے کے بعد ودعیہ کو ایک نیا اور بالکل الگ عالی لگا تھا۔

جو اسے ٹوٹ کر چاہتا تھا اسے ہر وقت پلکوں پر بٹھائے رہتا تھا۔

اس کے کہنے سے پہلے اس کی فرمائش پوری کرنے کے لیے بے تاب رہتا تھا۔

''عالی آپ نے مجھے ڈرا دیا۔'' وہ ایک چپت اس کے سر پر مار کو بولی۔

''مجھے یاد کر رہی تھیں تو اس کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ بندہ آپ کے پاس موجود ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''میں آپ کو یاد نہیں کر رہی تھی بلکہ موسم انجوائے کر رہی تھی۔'' وہ اسے چڑانے کے لیے بولی۔

''اچھا جی۔'' وہ بولا۔

''ہاں جی۔'' وہ بھی اسی کے انداز میں بولی۔ اب آپ جلدی سے فریش ہو جائیں میں آپ کا چائے پر انتظار کروں گی۔'' وہ اس کے حصار سے نکل کر بولی۔

''جیسا آپ کہیں زوجہ عالی۔'' وہ تھوڑا جھک کر بولا۔

ودعیہ مسکرا دی۔

☆......☆......☆

رات کو وہ گھر چیک کر کے کمرے میں آئی عالی کھڑکی کے پاس کھڑا تھا وہ اس کو دیکھ کر مسکرایا۔

''ادھر ہی آ جاؤ بہت سہانی ہوا چل رہی ہے۔'' وہ باہر دیکھ کر بولا۔ ودعیہ اس کے ہمراہ جا کھڑی ہوئی اور اس کی بازوؤں میں بازو ڈال کر اس کے کندھے پر سر ٹکا کر ہوا کو محسوس کرنے لگی اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں ہوا سے اس کے بال لہرا کر بار بار اس کے چہرے پر آ رہے تھے۔

عالی نے چہرے پر رقص کرتے اس کے بالوں کو دیکھا تو ایک تبسم اس کے چہرے پر بکھر گیا اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے بال پیچھے کیے۔

''آپ خوش تو ہیں زوجہ عالی۔''

''ہوں بہت۔'' وہ بند آنکھوں سے بولی۔ پھر سر اٹھا کر بولی اور آپ آنکھوں میں خوبصورت مسکراہٹ تھی۔

''ہوں خوش تو ہوں مگر مطمئن نہیں۔'' وہ سنجیدگی

سے بولا۔
"کیوں کیا ہوا ہے عالی وہ پریشان ہوگئی۔
وہ اسے لے کر بیڈ پر آ گیا اسے بٹھا کر بولا۔
"میں مطمئن کیسے ہو سکتا ہوں ودعیہ جب میری ماں بے چین ہو۔
"کیوں کیا ہوا ہے سب خیریت تو ہے ناں......؟" وہ گھبرا گئی۔
"ہوں!" ابو کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ امی تم سے بہت شرمندہ ہیں وہ تم سے معافی مانگنا چاہتیں ہیں اپنے تمام رویوں کی۔"
ودعیہ سر جھکا کر سن رہی تھی عالی نے بے قراری سے اس کا ہاتھ تھاما۔
"پلیز ودعیہ میں جانتا ہوں کہ امی نے تمہارے ساتھ کبھی بھی اچھا سلوک نہیں کیا پھر بھی تم انہیں معاف کر دو تمہارا دل تو بہت وسیع ہے ناں۔" ودعیہ نے سر اٹھایا۔
"عالی مجھے افسوس ہے کہ آپ مجھے اب تک جان نہیں پائے۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔
"اگر جان پاتے تو یہ کبھی نہ کہتے۔ آپ نے سوچا بھی کیسے کہ میں مامی کے لیے دل میں کوئی کدورت رکھوں گی۔ میں نے تو انہیں اسی وقت معاف کر دیا تھا جب انہوں نے مجھے گلے لگایا تھا۔"
عالی نے اس بڑے ظرف کی لڑکی کو غور سے دیکھا۔ جس نے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو بھلانے میں ایک پل بھی نہیں لگایا تھا۔
"مجھے فخر ہے ودعیہ کہ میں تمہارا شوہر ہوں۔ تم جیسی مضبوط اور بلند کردار لڑکی کا۔" وہ اس کے ماتھے پر بوسہ دے کر بولا۔
"رہی بات شائلہ بھابھی کی تو میرا دل نہیں مانتا کہ ان سے نفرت کروں خدا ان پر کتنا مہربان ہے اور اتنی بڑی فضیلت انہیں بخش رہا ہے کہ وہ ایک نئی زندگی کو جنم دینے جا رہی تھی بے شک اپنوں کا پیار ان کا نفع ہر انسان چاہتا ہے انہوں نے بھی چاہا بس راستہ غلط اختیار کیا۔ وہ افسوس سے بولی۔
"پھر بھی میرا دل نہیں مانتا کہ میں اس سے نفرت کروں۔" وہ ایک جذب سے بولی۔
"میں نے سب کو معاف کیا عالی آپ گواہ رہیے گا۔" وہ اس کے فراخ سینے پر سر ٹکا کر بولی۔
"میں گواہ ہوں ودعیہ۔" عالی نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔
"تم واقعی ایک عظیم لڑکی ہو ودعیہ بہت عظیم اور میں تمہیں پا کر دنیا کا امیر ترین شخص بن گیا ہوں۔
"ویسے ایک بات تو بتاؤ۔ شرارت اس کی آنکھوں میں ابھری۔
"ہوں۔" ودعیہ نے کہا۔
"تم یہ فضیلت والا نیک کام کب تک کرنے کا ارادہ رکھتی ہو۔"
"کون سا کام؟" اس نے سر اٹھایا اور حیران ہو کر پوچھا۔
"بھئی یہ ہی والا ایک نئی زندگی کو جنم دینے والا" وہ شوخ ہوا۔
ودعیہ کے چہرے پر حیا کی لالی بکھر گئی۔
"آپ بہت بُرے ہیں عالی۔" وہ کن اکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کے سینے پر مکا مار کر مسکرائی۔
عالی کا جاندار قہقہہ بلند ہوا۔ اس نے دوبارہ اسے خود سے قریب کر لیا۔ ودعیہ نے اس کے سینے پر سر رکھ کر سکون سے آنکھیں موند لیں۔
اس کی زندگی اب مکمل ہونے جا رہی تھی اس کی خواہشات پوری ہو رہی تھیں۔ خوشیوں نے اس کی زندگی میں دائمی ڈیرہ ڈال لیا تھا۔

☆......(ختم شد)......☆

افسانہ

نیرّ شفقت

ادھورے سپنے

ہم سیکنڈ ایئر میں تھے جب سکینہ سے ہماری پہلی دفعہ ملاقات ہوئی تھی۔ وہ چھلیاں بیچنے آتی تھی۔ ہم کبھی کبھار اس سے چھلیاں لے لیا کرتے تھے۔ جو اس کا باپ باہر ریڑھی پر بھونا کرتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بڑی حسرت ہوتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ......

عائشہ کے ایڈمیشن کے لیے میں کالج آئی ہوئی تھی۔ ایڈمیشن فارم جمع کروایا تھا اور اب واپسی کے لیے ہم گیٹ کے پاس کھڑے فاطمہ کا انتظار کررہے تھے جو اپنی فرینڈز کے ساتھ کینٹین تک گئی ہوئی تھی۔ وہ سیکنڈ ایئر میں تھی اور عائشہ نے فرسٹ ایئر میں داخلہ لینا تھا۔

انتظار کرنے کے ساتھ ساتھ میں عائشہ سے اپنے کالج لائف کی باتیں بھی شیئر کررہی تھی۔ میں نے بی اے اسی کالج سے کیا تھا اسی لیے اردگرد کے نظارے مجھے ماضی میں گھسیٹ رہے تھے۔

''وہ فوارہ دیکھ رہی ہونا۔'' میں نے گراؤنڈ میں بنے فوارے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہاں بیٹھ کر میں اپنی فرینڈز کا انتظار کیا کرتی تھی۔ اور وہ اس کے سامنے پھولوں کا کنج ہے نا وہ ہماری پسندیدہ جگہ ہوتی تھی اور ہم فری پیریڈ میں عموماً اِدھر ہی پائے جاتے تھے۔'' میں نے چشم تصور میں ان لمحوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''کتنی جلدی وقت گزر گیا۔''

عائشہ بڑی دلچسپی سے میری باتیں سُن رہی تھی۔

''آپ اپنی فرینڈز کا انتظار کرتی تھیں۔ انہوں نے کبھی آپ کا انتظار نہیں کیا۔'' عائشہ نے پوچھا تو ایک خوب صورت یاد میرے دل میں خوشی بن کر لہرا گئی اور میرے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ہاں......'' میں نے اس لمحے میں جا کر کہا۔

''ایف اے تک تو میں ان کا انتظار کرتی تھی مگر بی اے کے دو سالوں میں، میں نے انہیں انتظار کروایا۔'' ان کا وہ انتظار مجھے آج بھی مزہ دے رہا تھا اور ان کے انتظار کی کیفیت کا سوچ سوچ کر مجھے آج بھی ہنسی آرہی تھی۔

''نیلی تانگے پر آیا کرتی تھی اور مینا وین میں آتی تھی اور چونکہ میرا گھر کالج سے نزدیک ہی تھا اس لیے میں پیریڈ کے حساب سے لیٹ آیا کرتی تھی۔ نیلی اور مینا دونوں مجھے ڈانٹتی تھیں کہ جلدی آیا کرو مگر میں نے بھی طے کیا ہوا تھا کہ آرام سے ہی آؤں گی۔''

اس سے میں مکمل طور پر ان لمحوں میں کھو چکی تھی۔

''وہ دونوں میرے آنے سے پہلے چھپ جاتی تھیں۔ یہ میرے لیے ایک سزا تھی ان کی طرف سے

کہ اتنے بڑے کالج میں ڈھونڈتی رہو ہمیں اور میں...... خراماں خراماں چلتی ہوئی کرش ہال تک پہنچتی۔ وہاں موجود لڑکیوں سے نیلی اور مینا کے بارے میں پوچھتی یہ سوچ کر کہ کسی نے تو ان دونوں کو کہیں دیکھا ہی ہوگا۔

''وہ جو ایک لمبی سی ہے اور ایک گوری سی۔''

کوئی ایک استفسار کرتی تو میں سر ہلا دیتی۔

''ہاں ہاں...... وہی۔ وہ مجھے ان کا پتہ بتائیں اور میں ایک مرتبہ پھر سج سج چلتی ان کے سروں پر جا پہنچتی اور وہ سر پیٹ کر رہ جاتیں۔'' بیس سال پرانے ان لمحوں سے نکلنے کو میرا دل نہیں چاہ رہا تھا مگر......

''باجی بھٹہ لوگی۔'' ایک من کرتی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ایک سات آٹھ سال کی بچی عائشہ کے سامنے پلیٹ میں کچھ بھنے ہوئے بھٹے لیے کھڑی تھی۔

''لے لو باجی...... صرف دس روپے کی ہے۔''

اسی بچی کے نقوش مجھے کچھ جانے پہچانے سے لگے۔

''عائشہ یہ بچی ابھی تک بڑی نہیں ہوئی۔'' میں نے پرسوچ نظروں سے اس بچی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا مما...... کیا کہہ رہے ہو آپ۔'' عائشہ نے حیران نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا تو میں پھر ماضی سے حال میں آ گئی۔

''کچھ نہیں......'' میں نے کہا اور بچی کی طرف متوجہ ہوئی۔

''بیٹا نام کیا ہے تمہارا؟''

''میرا نام زینب ہے باجی...... آپ بھٹہ لے لو۔'' اس نے اپنا نام بتاتے ہوئے پُرامید نظروں سے مجھے دیکھا۔

''ہاں بیٹا لے لیتی ہوں میں...... تمہاری ماں کا کیا نام ہے؟''

''اماں کا نام سکینہ ہے باجی...... آپ بھٹہ لے لو۔''

''سکینہ......'' میرے ذہن کے دریچے پر چھم سے ایک اور یاد آن ٹپکی۔

جس وقت ہم کالج میں پڑھتے تھے تو سکینہ اس وقت سات آٹھ برس کی تھی اور وہ اسی طرح پلیٹ میں چھلیاں رکھ کر اندر کالج میں بیچنے آیا کرتی تھی۔

”وہ تمہاری ماں ہے۔“ میں نے پوچھا۔
”جی باجی..... آپ بھٹے لے لونا۔“
”کہاں ہے سکینہ.....“ میں نے پوچھا تو وہ حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔
”اماں باہر بیٹھی ہوئی ہیں۔ آپ جانتی ہیں اماں کو۔“ وہ تجسس آمیز لہجے میں بولی۔
”ہاں بیٹا میں جانتی ہوں اسے..... جاؤ اسے بلا کر لاؤ۔“
”اچھا باجی..... آپ بھٹے نہیں لوگی۔“
”ہاں یہ تین بھٹے دے دو مجھے۔“ میں نے پرس سے پیسے نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔
”اب جاؤ جا کر سکینہ کو بلا کر لاؤ۔“
پھر کچھ ہی دیر بعد سکینہ میرے سامنے تھی۔
”جی باجی آپ نے مجھے بلایا۔“ میں کتنی ہی دیر اسے دیکھتی رہی۔ سُرخ و سفید رنگت میں غربت کی سیاہی گھل رہی تھی۔ روکھے بالوں میں پتہ نہیں کتنے دنوں سے کنگھی نہیں کی گئی تھی۔ یہی عورت اگر امیر اور پیسے والی ہوتی تو پتہ نہیں کتنے دلوں کو اپنی ٹھوکروں پر رکھتی مگر اب تو لگتا تھا کہ یہ وقت کی ٹھوکروں میں ہے۔
”باجی.....!“ مجھے چپ دیکھ کر اس نے میرا بازو ہلایا۔
”ہوں.....!“ میں چونکی۔
”ہاں..... سکینہ پہچانو تو مجھے میں..... تمہاری پری باجی ہوں۔“
”پری باجی.....“ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک لہرائی۔
”ہوں، شکر ہے تم نے مجھے پہچان لیا۔“
”میں آپ کو کیسے بھول سکتی ہوں پری باجی۔“ اس کے لہجے میں اَن گنت حسرتوں کی ٹوٹی کرچیوں کی آواز تھی۔

میں ایک بار پھر ماضی میں کھوگئی۔
ہم سیکنڈ ایئر میں تھے جب سکینہ سے ہماری پہلی دفعہ ملاقات ہوئی تھی۔ وہ چھلیاں بیچنے آتی تھی۔ ہم کبھی کبھار اس سے چھلیاں لے لیا کرتے تھے۔ جو اس کا باپ باہر ریڑھی پر بھونا کرتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بڑی حسرت ہوتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ ہم نے اس سے بات چیت شروع کردی۔ اس کا نام پوچھ لیا۔ گھر والوں کے بارے میں بات کرلی۔ اس کی پسند ناپسند کا ذکر کرلیا۔ ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتوں میں اس نے بتایا کہ اسے پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ ہمارے آخری دو پیریڈ فری ہوتے تھے۔ نیلی نے اسے پڑھانے کی آفر کردی۔ پہلے تو وہ ہچکچائی۔
”ابا مارے گا مجھے..... پھر چھلیاں کون بیچے گا۔“
”چھلیاں تو تم چھٹی سے کچھ پہلے لے کر آتی ہو۔ اس سے پہلے آکر پڑھ لیا کرو۔“ نیلی نے اس کا حل بھی بتادیا۔ پہلے تو وہ ڈرتی رہی۔ پھر مان گئی۔
اگلے دن نیلی اپنے بھتیجے کے پرانے قاعدے اٹھالائی۔ ہم باتیں بھی کرتے رہتے، اسے پڑھاتے بھی رہتے۔ وہ ذہین بچی تھی۔ تصویروں کی مدد سے بہت جلدی سیکھنے لگی۔ ہم تینوں کے گھر میں جو فالتو چیزیں مثلاً جیولری، ہیئر کلپ، چوڑیاں، پنیں وغیرہ ہوتی تھیں وہ ہم سکینہ کے لیے لے آتے۔
نیلی کبھی کبھار اپنی بھتیجیوں، بھانجیوں کے چھوٹے ہوئے کپڑے بھی سکینہ اور اس کے بہن بھائیوں کے لیے لے آتی۔ ان چیزوں کو پا کر وہ بے انتہا خوش ہوتی۔ اس نے ہم تینوں کا نام پری باجیاں رکھ دیا تھا۔ ایک پری باجی لمبی تھی یعنی کہ نیلی، مینا گوری پری باجی تھی اور میں موٹی پری باجی تھی۔
ہمارے بی اے مکمل ہونے تک اس نے اتنا لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا کہ وہ جوڑ کر جملے پڑھ لیتی تھی۔ اپنا نام اور دوسرے چھوٹے چھوٹے لفظ لکھ لیتی تھی

اور حساب کتاب کر لیتی تھی۔ بی اے کے بعد لامحالہ ہمیں کالج کو خیرآباد کہنا ہی تھا۔

ہمارے کالج کے آخری دن سکینہ بہت روئی۔ وہ ہم سے بہت اٹیچ ہوگئی تھی۔ مگر ہم کر بھی کیا سکتے تھے۔ ہمیں یہ بھی پتہ تھا کہ ہمارے جانے کے بعد سکینہ کو پڑھانے کی اجازت نہ اس کا باپ دے گا اور نہ اس کے حالات، ویسے بھی وہ اب گیارہ برس کی ہوگئی تھی اور دو تین سالوں میں اس کی شادی ہو جانی تھی۔ ایسے بھی اس کے باپ نے اس کی پڑھائی پر پیسہ لگا کر برباد ہی کرنا تھا نا۔

''سکینہ تم خود تو نہیں پڑھ سکی گی مگر اپنے بچوں کو ضرور پڑھانا۔'' نیلی نے سکینہ کو نصیحت کی تو وہ سر ہلانے لگی۔

''اچھا باجی......''

پھر ہم سب اپنی اپنی راہوں پر ہو لیے۔ بی اے کے بعد نیلی ملتان شفٹ ہوگئی شادی کر کے۔ مینا کی شادی یہیں اسی شہر میں ہوگئی اور میں بیاہ کر رحیم یار خان چلی گئی۔ قسمت کے چکر نے مجھے خوب گھمایا۔ رحیم یار خان کے بعد لاہور پھر کراچی اور اب ابو جی کی ڈیتھ کے بعد میں نے مستقل یہیں بسیرا کرنے کا پلان بنالیا۔

فاطمہ نے میٹرک کر لیا تھا۔ سو وہ اسی کالج میں ایڈمٹ ہوگئی جہاں قدم قدم پر میرے قدموں کے نشان ثبت تھے۔ اور اب عائشہ کا داخلہ بھی اسی کالج میں کروانے کے لیے میں اس کے ہمراہ آئی تھی جہاں سکینہ کی صورت میں ایک اور یاد مجھے گھیرے کھڑی تھی۔

''اور سناؤ سکینہ...... کہاں ہوتی ہو آج کل۔'' انیس بیس سالوں کا سفر لمحوں میں طے کر کے آئی تھی میں۔

''ہم نے کہاں جانا ہے بڑی باجی۔ ہماری زندگیوں کا سفر تو یہیں سے شروع ہو کر یہیں ختم ہو جاتا ہے۔'' وہ بڑے یاسیت بھرے لہجے میں بولی۔

میں نے سر جھٹک کر اس لہجے کا تاثر ختم کرنے کی کوشش کی۔

''خیر...... کتنے بچے ہیں تمہارے۔''

''پانچ بچے ہیں جی...... دو لڑکیاں، تین لڑکے۔'' وہ کچھ لمحے رُکی۔ پھر کہانی وہیں سے شروع کی جہاں سے ہم علیحدہ ہوئے تھے۔

''آپ سب کے جانے کے بعد میں بہت اُداس ہوگئی تھی۔ مگر کیا کرتی، جو کام قسمت میں لکھا تھا وہی کرتی رہی۔ سیانی ہوئی تو اماں نے گھر بٹھا دیا۔ زینب کے ابا کا رشتہ آیا تو اماں ابا نے بیاہ دیا۔ اب میرے بچے بھی وہی کام کرتے ہیں جو میں اور میرے بہن بھائی کرتے تھے۔ بس یہ ہے میری چھوٹی سی کہانی۔'' سکینہ بڑی محزون سے مسکرائی۔

''تم نے اپنے بچوں کو بھی اسکول میں نہیں ڈالا۔ گورنمنٹ کی تعلیم تو اب تقریباً مفت ہی ہے۔ تم نے تو کہا تھا کہ اپنے بچوں کو پڑھاؤ گی۔''

''ہمارے بچوں نے پڑھ کر کیا کرنا ہے باجی۔ جو ٹیم وہ پڑھنے پر لگائیں گے وہی ٹیم اگر کمائی کر لیں تو دو وقت کی روٹی تو آسانی سے مل جائے گی۔''

اُس کی اِس بات کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

''میرا گھر یہاں سے قریب ہی ہے۔ مجھ سے پتہ لے لو اور کبھی کبھی آ جایا کرو۔ میرے سے جو بن پڑے گا تمہارے لیے کر دیا کروں گی۔'' میں اس کے سوا کچھ بھی نہ کہہ سکی اور نہ کہنے کے لیے میرے پاس کچھ تھا۔

''میرے دیس کے یہ مزدور بچے جانے کب بڑے ہوں گے۔ یا پھر شاید ان پر بچپن آتا ہی نہیں، اور یہ چھوٹے چھوٹے بچے اپنے گھر کی ذمہ داریاں اٹھانے کے لیے یکدم ہی بڑے ہو جاتے ہیں۔''

دُکھے دل کے ساتھ یہی سب کچھ سوچتی فاطمہ اور عائشہ کے ہمراہ میں گھر کی طرف چل پڑی۔

☆☆......☆☆☆

''دیکھ نوشی یہ ہے لڑکا! سرکاری ملازم ہے، چالیس ہزار مہینہ کماتا ہے۔ دو چھوٹی بہنیں ہیں۔ ماں باپ کا اکلوتا کماؤ پُوت ہے۔ باپ کی بڑی کپڑے کی دکان ہے۔ شہر میں بہت بڑا اور خوبصورت گھر ہے مگر اس کی ماں غریب لڑکی سے رشتہ صرف اس لیے کرنا چاہتی ہے کہ......

ایک ہلکی پھلکی تحریر جو آپ کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دے گی

پہلے مکان کا مالک دلاور اور اس کی بیوی نوشین عرف نوشی تھی۔ دلاور اور نوشی کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ حسب سابق بیٹیاں بڑی اور بیٹا تینوں بہنوں سے چھوٹا تھا۔ خدا کی رحمت غریبوں کے ہاں بیٹیوں کی صورت برستی ہے، غریب بچوں کے معاملے میں خود کفیل ہوتے ہیں۔ چھوٹی چادر دیکھ کر پیر سمیٹتے نہیں بلکہ اور پسار لیتے ہیں۔ خدا کی دی عقل کا استعمال اِس معاملے میں ممنوع ہوتا ہے۔

اِس محلے میں یوں تو اور بھی مکان تھے مگر گہرا پیلا اور دھوپ میں چمچاتا یہ مکان نظر میں جلدی آ جاتا تھا۔ ہاں تو بات ہو رہی تھی دلاور کی۔

نوشی کی بڑی بیٹی جمیلہ مجھلی شکیلہ اور چھوٹی بجیلہ بیٹا عدنان عرف عدو غربت کی وجہ سے یہ لوگ جمیلہ کا ج شکیلہ کا ش اور بجیلہ کا س کھا گئے تھے اب تینوں لڑکیاں بالا ترتیب مختصر ناموں کے ساتھ میلہ' کیلہ اور جیلہ تھیں۔ عدنان تو تھا ہی عدو یہ اور بات ہے کہ محلے کے بچے اس عدو کدو کہہ کر چڑاتے تھے اور وہ چڑتا بھی تھا۔ دلاور رکشہ چلاتا تھا، بس بڑی لڑکی میلہ کو پانچویں پاس کرادی تھی۔ باقی تو الف سے لٹھا بھی نہ جانتے تھے۔ سی این جی رکشے کی کمائی ہی کتنی ہوتی ہے یہ تو آپ کو خوب پتا ہوگا۔ بس کھینچ تان کر گزارہ ہو رہا تھا ہاتھ بٹانے کی غرض سے تینوں لڑکیاں بھی کارچوبی کا کام کرتی تھیں۔ مگر سارا دن آنکھیں پھوڑ کر روز کے سو روپے ہی کما پاتی تھیں۔ تینوں لڑکیوں میں میلہ ہی ذرا خوبصورت تھی باقی دو تو صرف عام سی شکل کی تھیں۔ غریب کی لڑکیاں دو ہی وجوہات کی بنا پر دولت والے بیاہ لے جاتے ہیں یا تو تعلیم یافتہ ہوں یا پھر خدا نے حسن کی دولت سے نوازا ہو میلہ کے پاس بہت زیادہ تو نہیں مگر دونوں بہنوں کی نسبت حسن موجود تھا۔ میلہ کی زبان...... خدا کی پناہ! امیر شہر اپنی زبان دراز چھوکریوں کو ذہین کہتے ہیں جبکہ غریب شہر جن القابات سے نوازتے ہیں وہ یہاں لکھے نہیں جا سکتے۔

نوشی نے پچھلے دنوں ایک جاننے والی عورت

فردوس کو جمیلہ کے رشتے کے سلسلے میں کہا۔ فردوس گھر گھر پھیری لگا کر رشتے پہنچتی تھی۔ مہذب زبان میں یوں کہہ لیجیے میرج بیورو چلاتی تھی۔ ایک دن فردوس کی آمد پہلے مکان میں ہوئی۔ فردوس جھولا ہاتھ میں لیے نوشی کو آواز لگاتی گھر میں گھستی چلی آئی۔

"آجا آپا فردوس! آبیٹھ آج ہمارا خیال آہی گیا۔"

"ارے ہاں بھئی کام سے آئی ہوں۔ تو نے اپنی لڑکی جمیلہ کے رشتے کے لیے کہا تھا اِسی لیے آئی ہوں۔ بہت کم لوگ ہیں جو غریبوں کے گھر رشتہ ڈالنے پر راضی ہوتے ہیں، ورنہ لڑکا پال پوس کر جوان کرنے تک کا معاوضہ لڑکی والوں سے جہیز کی صورت وصول کرتے ہیں۔"

"آپا اپنی تو جیسے تیسے روپیٹ کر گزر گئی مگر خدا ان کے نصیب اچھے کرے بیٹی کا سکھ تو ہر ماں چاہتی ہے لڑکا اتنا کماتا ہو کہ میری بچی فاقوں نہ مرے۔"

"چل نوشی بسمہ اللہ کر لگے ہاتھ لڑکے کی تصویر بھی دیکھ لے۔" یہ کہتے ہوئے فردوس نے اپنے ساتھ لائی عمرو عیار کی زنبیل میں ہاتھ ڈالا۔ جب ہاتھ باہر آیا تو اس میں ایک بڑا فوٹو البم تھا۔ نوشی نے جلدی سے آواز دے کر عدو کو سوڈے کی بوتل لینے دوڑایا۔ البم دیکھ کر تینوں لڑکیاں بھی فردوس کے قریب سرک آئیں، ورنہ اتنی دیر سے یہ تماشا دور سے دیکھ رہی تھیں۔ فردوس نے البم کھول کر ایک تصویر سامنے کر دی۔

"دیکھ نوشی یہ ہے لڑکا! سرکاری ملازم ہے، چالیس ہزار مہینہ کماتا ہے۔ دو چھوٹی بہنیں ہیں۔ ماں باپ کا اکلوتا کماؤ پوت ہے۔ باپ کی بڑی

کپڑے کی دکان ہے۔ شہر میں بہت بڑا اور خوبصورت گھر ہے مگر اس کی ماں غریب لڑکی سے رشتہ صرف اس لیے کرنا چاہتی ہے کہ اس کا بیٹا اِس کی مٹھی میں رہے۔ امیر لڑکی تو لڑکا لے اڑے گی۔ حیدر آبادی لوگ ہیں۔ جمیلہ کو کہو چوڑی دار پاجامہ اور فراک پہن کر سامنے آئے اور ہاتھ ماتھے تک لے جا کر سلام کرے۔ چھوکرے کی ماں خوبصورت اور تمیز دار بہو چاہتی ہے۔ ذرا بدتمیزی نہ ہو۔ بڑے رکھ رکھاؤ والے لوگ ہیں۔ تم سب ان سے تمیز سے پیش آنا۔ نوشی مجھے دن بتادے انہیں کون سے دن لے کر آؤں۔'' نوشی سوچ میں پڑ گئی۔

''آج منگل ہے یوں کر سنیچر کے روز لے آ......کیوں ری لڑکیوں سنیچر ٹھیک ہے ناں۔''

جمیلہ چہکی۔ ''ہاں اماں ٹھیک ہے۔'' فردوس نے جمیلہ کو گھور کر دیکھا۔

''نوشی ان کے سامنے صرف جمیلہ کو بھیجو باقی دو کو اندر ہی رکھیو۔''

''ٹھیک ہے آپا جیسا تم مشورہ دو گی ویسا ہی ہوگا آخر کو تم میری آپا ہو۔ تمہاری اجازت کے بغیر کچھ نہ ہوگا۔'' نوشی نے فردوس کو مسکا لگایا۔

فردوس نے مسکراتے ہوئے فوٹو البم اپنی زنبیل میں واپس ڈالا، چندیا پر برقعہ رکھا اور یہ جا وہ جا۔

☆......☆......☆

نوشی نے دلاور کو رشتے سے مطابق آگاہ کیا۔

'' دلاور حیدر آبادی لوگ ہیں۔ ہمیں ان کے سامنے اُن ہی جیسا بننا ہوگا۔''

''اے حیدر آبادی ہوں تو ہوں اب کیا اُن کی وجہ سے ہم اپنا اصل بھول جائیں۔ دیکھ لے نوشی ایسا نہ ہو کہ کوا چلا ہنس کی چال اور اپنی چال بھی بھول گیا۔'' دلاور نے اپنا فلسفہ پیش کیا۔ نوشی نے بھی اپنی عقلمندی جھاڑی۔

''جیسا دیس ویسا بھیس۔ دلاور کیوں خود کو پرندوں سے ملاتا ہے اور پرندہ بھی کوا۔'' اِس بات پر دلاور کے ماتھے پر بل آ گئے۔

''چپ کر جا نوشی سنیچر کو دیکھی جائے گی۔ ابھی سے رکشے کی طرح پھٹر پھٹر مت کر دلاور کے ماتھے پر بل دیکھ کر نوشی نے بھی خاموش ہونے میں عافیت جانی۔

برابر کے گھر سے سفید چینی کا سیٹ منگوا لیا گیا فراک پاجامہ جمیلہ نے اپنی سہیلی عینی سے لے لیا۔ صوفہ گھر میں موجود تھا البتہ میز اور قالین جمیلہ اپنی سہیلی سے لے آئی۔ یہاں اسی طرح مانگ تانگ چلتی تھی۔ بچیوں کے جب رشتے آتے تھے محلے دار اسی طرح تعاون کرتے تھے کیونکہ بیٹیاں تو سانجھی ہوتی ہیں۔ گھر کی دھلائی صفائی شروع ہوگئی۔ ایک ایک چیز چمکا دی گئی سنیچر کی دوپہر ہی ناشتے کا سامان منگوا لیا گیا۔ بس سموسے رہتے تھے وہ دلاور نے کہا گرما گرم لادوں گا۔ دلاور اور نوشی نہا دھو کر تیار ہو گئے۔ عدو نے جمعہ کے روز مسجد کے باہر سے جو عطر خریدا تھا وہ بھی لگا لیا۔ نوشی کو جو خوشبو آئی تو عدو کا کان پکڑ کر مروڑ دیا۔

''بدبخت تُو نے نئے کپڑوں پر اگربتی رگڑ لی۔'' عدو کان چھڑواتے ہوئے بولا۔

''نہیں اماں یہ عطر ہے۔'' اس طرح غریب کی جان بخشی ہوئی۔ جمیلہ نے گھس گھس کر خوشبو والے صابن سے منہ دھو لیا اور منہ دھوتے ہوئے اشتہار بھی گنگناتی رہی۔

''جی ہاں وہی صابن جس سے فلمسٹار ریما منہ دھوتی ہے۔'' مسئلہ بنا چوڑی دار پاجامہ...... خدا کی پناہ یہ سارنگی کا استر کیسے پہنا جائے گا۔ یہ تو

چڑھائے نہیں چڑھ رہا۔ کافی جدوجہد کے بعد..... بیلہ نے ربیلہ کو آواز لگائی۔
"ربیلہ اِدھر آ مجھے بتا یہ شیطان کی آنت کیسے پہنتے ہیں؟" ربیلہ نے پلاسٹک کی تھیلی دیتے ہوئے کہا۔
"پہلے یہ پہن پھر پاجامہ...... خدا خدا کر کے یہ مرحلہ طے ہوا بیلہ آئینے کے آگے کھڑی ہوئی۔ آنکھوں میں سرمہ ڈالا سامنے کے بال پف کی شکل میں اُٹھا کر باندھے اور پیچھے کے بالوں کی چوٹی گوندھ لی۔ دوپٹہ سر پہ لیا اور باہر آ گئی۔ بیلہ کو دیکھ کر نوشی نے ماشاء اللہ کہا مگر کم بخت عدو کھی کھی کر کے ہنسنے لگا۔ بیلہ نے گھورتے ہوئے پوچھا۔
"کیوں ہنس رہا ہے۔" عدو نے ہنسی روکتے ہوئے کہا۔
"آپا تو پاکستانی فلموں کی ہیروئن لگ رہی ہے۔ جس کا ڈانس ابھی شروع ہونے ہی والا ہے اور یہ ٹرک کی شکل کے بال کیوں باندھ لیے۔" بیلہ نے عدو کی کمر پر ایک دھموکا جڑ دیا ہنسی خود بخود رُک گئی۔
سب کچھ تیار تھا نوشی نے ربیلہ اور جیلہ کو ہدایت دی۔
"تم دونوں اندر ہی رہنا خبردار جو کمرے سے باہر نکلی تو۔ عدو تُو بھی بہنوں کے ساتھ کمرے میں ہی بیٹھا رہیو۔ خاموش رہنا، دھما چوکڑی نہ مچانا۔ بیلہ تُو اندر سے ٹرے میں ناشتا سجا کر ان کے سامنے لانا اور سلیقے سے ہاتھ ماتھے تک لے جا کر سلام کرنا اور ہاں نظر نیچی رکھیو۔" جمیلہ بدک گئی۔
"نہ اماں میں ٹرے ورے لے کر نہیں جاؤں گی ٹرے سجا کر تو کبھی میری کہانی کی رائٹر نہیں لائی تو میں کیوں لاؤں اور اگر میں ٹرے پکڑوں گی تو ماتھے تک ہاتھ لیجا کر سلام کیسے کروں گی۔ ٹرے یہ عدو اٹھائے گا اور میں اس کے ساتھ آؤں گی۔ آخر یہ حرام خور کس دن کام آئے گا۔" نوشی کچھ سوچتے ہوئے راضی ہو گئی۔
ٹھیک پانچ بجے پیلے مکان کے دروازے کے آگے سرمئی کار آ کر رُکی۔ خبری عدو نے خبر دی رشتے والے آ گئے۔ تینوں لڑکیاں اندر کمرے میں بھاگیں دلاور بھی ان کے ساتھ بھاگا نوشی چیخی۔
"ارے عدو کے ابا تم کہاں دوڑے جا رہے ہو۔ جاؤ مہمانوں کو اندر لے کر آؤ۔" دلاور باہر گیا۔ مہمان اندر آ گئے۔ ساڑی باندھے دبلی پتلی نک چڑی سی خاتون ایک فیشن میں ڈوبی چھوکری اور ایک پینٹ شرٹ میں ٹھسا مرد سب صوفے پر بیٹھ گئے۔ دلاور سموسے لے کر آ گیا۔ نوشی نے تعارف کرایا۔
"یہ میرے شوہر دلاور ہیں۔" مرد نے دلاور سے ہاتھ ملایا۔ خاتون گویا ہوئیں۔
"یہ میرا بیٹا ہے۔ اسی کے رشتے کے سلسلے میں آئی ہوں۔" پیچھے ہی فردوس آپا پہنچ گئیں۔
"ارے نوشی جمیلہ کو بلا۔" نوشی نے جمیلہ کو لہجہ نرم بناتے ہوئے آواز دی۔ عدو ٹرے لے کر آگے آگے جمیلہ اس کے پیچھے پیچھے، جمیلہ نے سب کے سامنے آ کر بڑی تمیز سے ماتھے پر ہاتھ لے جا کر سلام کیا۔ ہاتھ ابھی ماتھے سے نیچے بھی نہ آیا تھا کہ یکدم بیلہ نے زور کی چھینک ماری سارا تھوک اُڑ کے خاتون کے منہ پہ، خاتون جلدی سے ٹشو پیپر سے منہ صاف کرنے لگیں۔ فردوس آپا کا ماتھا ٹھنک گیا۔ مہمانوں نے جیسے تیسے چائے زہر مار کی اور کار میں بیٹھ گئے۔
فردوس آپا بھی یہ کہتے ہوئے چلی گئیں بڑی بدتہذیبی ہو گئی۔ نوشی نے بیلہ کو خوب لتاڑا کچھ دیر

کے لیے چھینک پہ قابو نہیں رکھ سکتی تھی۔ کچھ دیر تو ہیلہ نوشی کی ڈانٹ سنتی رہی پھر چیخ پڑی۔

"اِن کو کہنا اپنے چھوکرے کی شادی پتھر کی مورت سے کر دیں۔ زندہ لڑکی تو چھینکے گی بھی اور کھانسے گی بھی۔"

اگلے روز فردوس آپا کی پھر آمد ہوئی۔ اس مرتبہ رشتے والے ایک لکھنؤ کی فیملی سے تھے۔ دن وہی سنیچر کا مگر وقت رات آٹھ بجے کا تھا کیونکہ موصوفہ بکرے کی کڑاہی کھانا چاہتی تھیں۔ وہ بھی لڑکی کے ہاتھ کی۔ اگر کھانا مزیدار ہوا تو رشتہ پکا۔

بکرے کا گوشت دو سیر آیا۔ ہیلہ نے بڑی محنت سے کڑاہی بنائی۔ کڑاہی کی خوشبو پورے محلے میں پھیل گئی عدو تو باقاعدہ بلی کی طرح ٹہلنے لگا کہ کب موقع لگے اور کب وہ دو چار بوٹیاں اڑائے۔ ہیلہ نے عدو کو تسلی دی۔

"مہمان سارا تھوڑی کھا جائیں گے۔ بچے گا تو ہم عیش اڑائیں گے۔"

مہمان ٹھیک آٹھ بجے وارد ہوئے کھانا لگایا گیا۔ کُل دو افراد تھے بڑی بی اور ان کا بیٹا ساتھ میں فردوس آپا...... کھانا شروع ہوا بڑی بی نے نوالہ منہ میں ڈالا چبایا، نگلا......

"واہ بھئی واہ یہ تو بڑا لذیذ کھانا ہے۔" فردوس آپا نے بھی کھانے پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا کچھ دیر میں ہی سالن دوبارہ منگوایا گیا۔ عدو تو تلملا گیا۔

"ہیلہ آپا یہ ندیدے تو ساری کڑاہی چٹ کر جائیں گے۔ میں کچھ کرتا ہوں۔" عدو مہمانوں کے بیچ جا کر بیٹھ گیا اور گویا ہوا۔

"ہمارے پچھلے علاقے میں پرسوں چھاپہ پڑا ہے۔ کمبخت نا جانے کتنے عرصے سے کتوں کی کھال اُتار کر بکرا کہہ کر بیچ رہے تھے اور لوگ دھڑا دھڑ خرید رہے تھے۔ دو سو روپے سیر بکرے کا گوشت کون چھوڑتا ہے۔ میں بھی چار سو روپے کا دو سیر گوشت لایا ہوں۔"

بڑی بی نے ابکائی لی واش روم کا پوچھ کر اندر گھس گئیں۔ حلق میں انگلی ڈال کر کڑاہی باہر نکالی۔ عدو اور ہیلہ من ہی من مسکرانے لگے۔ خاتون نے باہر آ کر معذرت کی۔

"میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ اب اجازت دیجیے۔"

ان کے جاتے ہی نوشی نے عدو کا کان پکڑ لیا۔

"کیوں رے مردود! کیا بکواس کر رہا تھا۔"

"چھوڑو اماں بکواس نہ کرتا تو کڑاہی سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔"

اگلے دن فردوس آپا انکار کے ساتھ ایک دوسرے چھوکرے کی تصویر اٹھا لائیں۔ ہیلہ نوشی سے پہلے بول اٹھی۔

"خالہ فردوس اب کس شہر کے لوگ ہیں اور کیا کھائیں گے؟" "کیوں میرے پیچھے پڑ گئی ہو کسی اور چھوکری کی شادی کرواؤ اگر اب کوئی رشتہ آیا تو جوتے کھلاؤں گی۔"

فردوس کانوں کو ہاتھ لگاتے چلی گئی۔ ہیلہ نے نوشی کو کہا۔

"اماں میری فکر چھوڑو۔ باقی دو کے رشتے ڈھونڈو۔ مجھے بیاہنے والا تو جلد آنے والا ہے۔"

اب ماں کو کیا بتاتی کہ عینی کے بھائی سجاد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ہری لال ریشمی چوڑیاں پہنا دی ہیں اور جمیلہ اس کے ساتھ ریشم کی ڈور میں بندھ گئی۔

سن رہے ہیں آپ لوگ اب پہلے مکان والی جمیلہ کا رشتہ کوئی نہ لائے۔

☆☆......☆☆☆

رحمٰن، رحیم، سدا سائیں

"میں جانتا ہوں آپ بہت ہرٹ ہو..... مگر بیٹے کچھ فیصلے ہمارے لیے کتنے بہتر اور مناسب ہیں۔ اس کا فیصلہ آنے والا وقت کرتا ہے۔ بسا اوقات ہم نعمتوں کو اپنی نیکیوں کا انعام سمجھتے ہیں۔ اور مصیبتوں کو گناہوں کی سزا..... اس دنیا میں جزا بہت کم ملتی ہے۔ اور اس میں بھی امتحان ہوتا ہے۔ نعمت شکر کا امتحان ہوتی ہے۔ مصیبت کا امتحان صبر ہوتا ہے۔ یہ وقت.....

زندگی کے ساتھ سفر کرتے کرداروں کی فسوں گری، ایمان افروز ناول کا چھبیسواں حصہ

اوکھے پینڈے لمبیاں نے راہواں عشق دیاں
درد جگر دے سخت سزواں عشق دیاں
اوکھے پینڈے لمبیاں نے راہواں عشق دیاں

میوزک مدھر سروں میں گونجتا تھا۔ اور پٹھانے خاں کی آواز کا سوز ہر لحہ دل مسلتا درد میں اضافہ کرتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آج نمی نہیں خون اتر رہا تھا۔

دل کا خون
ارمانوں کا
خوابوں کا

وہ چھوٹا بچہ نہیں تھا۔ بھرپور مضبوط جوان مرد تھا۔ مگر آج اس کا دل ویسے ہی رونے کو چاہنے لگا جیسے وہ علاج کے دوران ذرا سا امپرو کرنے کے بعد رو رو کر ہتھیلیاں پٹختا کرتا اور چلایا کرتا تھا۔

"میں ایسا کیوں ہوں؟ میں ہی ایسا صرف کیوں ہوں؟ یہ ساری کمیاں اور خامیاں میرے اندر ہی کیوں ہیں؟" وہ روتا تھا تو سارہ کا دل جیسے کند چھری سے چیرنے لگتا۔ اس کی آواز کی بلک ان کی شہ رگ میں خنجر اتارے جاتی۔ مگر وہ رونے سے چپ نہ ہوتا۔ ان کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر جھنجوڑتا۔

"آپ نماز پڑھتی ہیں، ہر وقت دعائیں مانگتی ہیں۔ کیا ملا آپ کو ممی......؟ ایک مجھے تک تو ٹھیک نہ کرا سکیں آپ...... دیکھیں میری ٹانگیں...... ذرا سا بھی انہیں نہیں ہلا سکتا میں......"

بے بسی سی بے بسی ہوتی تھی تب اس کے چہرے پر، آنکھوں میں کہ جی کٹے چلا جاتا۔ ان دنوں وہ پندرہ سال کا تھا۔ ایک نوخیز لڑکا...... اپنی عمر کے حساب سے اس کا قد ساڑھے پانچ پونے چھ فٹ ہو چکا تھا۔ مگر وہ کھڑا ہونے سے قاصر تھا۔ جب آئینے میں پہلی بار اس نے اپنی صورت دیکھی تھی۔ خود اپنے آپ کو دیکھ کر گنگ سا ہونے لگا۔

مبہوت رہ گیا۔اس نے اپنی زندگی میں بہت سے حسین چہرے دیکھے تھے۔ اپنے باپ کو، ہارون اسرار کو اور پھر عبدالغنی کو بھی ...... لیکن اپنے آپ کو دیکھ کر وہ ان سب کے حسن و جمال کو بھول گیا۔ یہ فخر کا نہیں خوشی کا بھی نہیں اذیت کا ملال کا بے پناہ رنج کا احساس تھا۔اس کے اندر کی دنیا تہہ و بالا ہو کر رہ گئی تھی۔تب پہلی بار اسے شکوہ کرنا آیا تھا۔ تب پہلی بار اپنی محرومی پر وہ ایسے پھوٹ پھوٹ کر رویا تھا ایسے کہ سارہ اور سامہ کے لیے اسے سنبھالنا بھی مشکل ہو گیا۔

"کیوں اللہ نے اتنا حسین چہرہ دیا مجھے......؟ اگر باقی جسم کو ادھورا چھوڑ دینا تھا تو...... آج مجھے پتا چلا ہے۔ لوگوں کی نظریں ترحمانہ کیوں ہوتی ہیں۔"

وحشت زدگی کے عالم میں بالکل پاگلوں کی طرح اپنے بال نوچتا خود اپنے ہی گالوں پر طمانچے مارتا ہوا ارسل احمد سارہ کی ساری ہمتیں ساری توانائیاں سارا صبر نچوڑ کے رکھ گیا۔ وہ خوشی جو اک معجزہ ہونے پر انہیں ملی تھی کہ وہ شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھیں۔ ہر پل عاجز رہتی تھیں۔ بیٹے کی اس ناشکری و گستاخانہ انداز پر خوف و تفکر کے حصار میں گھرتی چلی گئیں۔ انہیں اس بدکلامی پر رب سے خوف آیا تھا۔ جانتی تھیں شکر نعمت کو بڑھاتا ہے تو ناشکری سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ مگر اس جذباتی نادان لڑکے کو کیسے سمجھائیں جو ہر پل ان کے ہاتھوں سے خشک ریت کی مانند پھسلا جاتا تھا۔ اسامہ بھی اسے سنبھالتے بہلاتے ہارنے لگے۔

"ارسل احمد...... میرے بیٹے! میری جان! ایسے نہ سوچو۔ فضل کی جانب نگاہ کرو۔ مقام شکر ہے کہ رب تعالیٰ نے آپ کو اس قدر صحت یابی سے نوازا ہے۔ آپ تو اپنا ہاتھ بھی نہیں ہلا سکتے تھے۔ گردن سیدھی نہیں رکھ سکتے تھے۔ بات نہیں کر سکتے تھے۔ اب دیکھیں، اب تو اللہ نے احسانِ عظیم کیا۔ نوازشیں کر ڈالیں کہ اتنی معذوریاں دور ہو گئیں۔ آپ اب سوچ سکتے ہیں۔ تو اچھا کیوں نہ سوچیں۔ سمجھ سکتے ہیں تو بہتری کو سمجھیں، بات کر سکتے ہیں تو اچھا کلمہ کہیں۔ ہاتھ ہلا سکتے ہیں تو بہتر عمل سرانجام دیں، تاکہ تشکر ادا ہو سکے۔ اگر ٹانگوں کا معاملہ ہے تو مایوسی کی کیا بات...... جہاں اللہ نے اتنا کرم فرمایا اتنا رحم کیا وہاں اس کمی کو پورا کرنے میں بھی اس کے گھر میں کوئی دیر نہیں۔ بس آپ حوصلہ رکھو۔ کبھی ہمت نہ ہارو۔ یہ بات ذہن میں رکھتے ہوئے کہ بیماری جسم کو مارتی ہے مگر انسان نہیں مرتا اور مایوسی روح کو مار دیتی ہے۔ جبھی انسان مردوں سے بدتر زندگی گزارتا ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو؟" اور اسے پتا نہیں کس حد تک سمجھ آئی تھی۔ لیکن وہ خاموش ضرور ہو گیا تھا۔ یہ خاموشی صبر تھی یا رنج و ملال کی انتہا پر جا کے جبر کی ایک کیفیت...... اندر ہی اندر گھٹنا اور کڑھنا...... اس فرق کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ واقعی ہر گزرتا دن اسے مزید امپروو کر جاتا۔ اس کے بازوؤں اور گردن کی کمزوری ختم ہو رہی تھی۔ اور بالآخر اس کا پورا اوپر کا دھڑ گھٹنوں کے اوپر تک پوری طرح توانا اور صحت مند ہو گیا تھا۔ لیکن گھٹنوں سے نیچے ٹانگیں موجود ہونے کے باوجود اپنا الگ سے کوئی احساس نہیں رکھتی تھیں۔ ارسل کو لگتا ان میں جان بھی شاید نہیں ہے۔ جس روز ڈاکٹر نے اس کی ٹانگوں کے اس حصے کی طرف سے مکمل جواب دیا وہ سب سے چھپ کر بہت رویا تھا اتنا کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ اس گریہ وزاری کی رب

کے بعد گواہ بننے والی سارہ تھی۔ اس کی ماں......
اس کی دمساز
اس کی ہمراز...... جس نے ماں کے مرتبے کا صحیح حق ادا کیا تھا۔ انہیں اس کے دل کا حال جیسے الہام ہو جایا کرتا تھا۔ کبھی خود سے دکھ کہنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی تھی ارسل کو......

''دل چھوٹا کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے میرے چاند......! ڈاکٹرز کی باتوں پر کان دھرے ہوتے تو تم آج میرے سامنے ایسے نہ بیٹھے ہوتے۔ ارسل احمد میں بس اتنا جانتی ہوں اللہ سے بڑا کوئی ڈاکٹر ہی نہیں ہے۔ تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارا علاج ان ''ڈاکٹرز نے کیا ہے۔ تم ان کے علاج سے ٹھیک ہوئے ہو...... یہ بات تو میں جانتی ہوں میرے بچے کہ تمہیں کس نے ٹھیک کیا ہے۔ تمہیں میرے رب نے اچھا کیا ہے ارسل! میرا اپنے رب سے تعلق بہت کمزور تھا......! جب تم پیدا ہوئے تو میری روح بیمار ہو گئی۔ اسی بیماری کے علاج کی غرض سے میں رب کے پاس چلی گئی۔ اور آج میں پورے فخر سے سرتان کے سب کے سامنے کھڑی ہوں کہہ سکتی ہوں...... دیکھ لو میرے رب نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ خالی نہیں لوٹایا۔''

ارسل خاموش رہا تھا۔ کچھ نہ بولا۔ نظریں کترائے دوسری جانب دیکھتا رہا۔ جب سارہ نے اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا، مسکرانے لگیں۔

اُدھر نہیں میرے بیٹے اِدھر دیکھو۔ یقین کر لو اپنی ماں کی کہی بات کا...... تم ٹھیک ہو گے۔ بالکل ٹھیک...... میرا وعدہ ہے تم سے......''

انہوں نے ایسی امید تھمائی تھی کہ وہ پُرسکون ہوئے بغیر نہ رہا۔ مگر گزرتے ماہ و سال اس سکون کو پھر افسردگی بے چینی اور مایوسی میں ڈھالتے چلے گئے تھے۔ وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو کر بھی معذوری کا لیبل اپنے اوپر سے اتارنے میں سخت ناکام رہا تھا۔ اس پر اک اور ستم یہ کہ امن کی محبت اس کی چاہت کی خواہش اور پھر احساس زیاں احساسِ شکست......

وہ جب سے لوٹا تھا۔ جیسے لحہ لحہ مر رہا تھا۔ پل پل گھلتا جاتا تھا۔

دروازے میں رکے اسامہ اسے یوں بکھرتے دیکھتے خود کو مضطرب ہوتا پاتے بوجھل قدموں کے ساتھ آگے بڑھ آئے۔ امن پر جو قیامت ٹوٹی تھی وہ اب کسی سے بھی مخفی نہیں تھی۔ مگر اک امن کی اپنی بھی ضد تھی۔ جو اپنی جگہ سے سرکنے کو تیار نہیں تھی۔ سب ہار رہے تھے اس کے سامنے...... حالانکہ خود اسامہ بھی ہارون اور خاندان کے دیگر سربراہوں کی مانند اس بات کے حق میں نہ تھے کہ اسے کسی بھی صورت دائم کے حوالے کیا جائے مگر...... صورت حال ہر لحاظ سے ہی کنٹرول سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔

''ارسل احمد......!'' وہ ان کے پکارنے سے بھی قبل انہیں دیکھ چکا تھا۔ کچھ کہے بغیر گہرا سانس بھرتا سر جھکا گیا۔

''میں جانتا ہوں آپ بہت ہرٹ ہو...... مگر بیٹے کچھ فیصلے ہمارے لیے کتنے بہتر اور مناسب ہیں۔ اس کا فیصلہ آنے والا وقت کرتا ہے۔ بسا اوقات ہم نعمتوں کو اپنی نیکیوں کا انعام سمجھتے ہیں۔ اور مصیبتوں کو گناہوں کی سزا...... اس دنیا میں جزا بہت کم ملتی ہے۔ اور اس میں بھی امتحان ہوتا ہے۔ نعمت شکر کا امتحان ہوتی ہے۔ مصیبت کا امتحان صبر ہوتا ہے۔ یہ وقت جتنا بھی کڑا ہو مگر حوصلہ نہیں ہارنا ہی انسانیت کی اصل معراج ہے۔

ہر قسم کے حالات میں صبر قناعت رب کی رضا کا باعث ٹھہرتا ہے۔ میں چاہتا ہوں میرا بیٹا اسٹرانگ مین ہو۔ اسے اپنی ذات پر بہت ضبط بہت کنٹرول حاصل ہو۔ وہ کبھی ٹوٹ کے نہ بکھرے' اور اسٹرانگ بننا ہرگز بھی کوئی مشکل کام نہیں۔ یہ صلاحیت تو بے جان چیزوں میں بھی قدرت نے رکھی ہے۔ کبھی پانی میں گرے تیل کے قطرے کو دیکھنا آپ وہ پھسلتا ہے تو اپنے رنگ بکھرتا ہے۔ اگر پانی چل پڑے تو وہ بھی ساتھ چلتا ہے۔ لیکن وہ کبھی ٹوٹتا نہیں پانی چاہے گدلا ہو یا صاف...... تیل کا وہ قطرہ کبھی بھی اپنی شناخت نہیں کھوتا۔ ہمیشہ پانی کی سطح پر تیرتا رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ بھی تیل کے ایسے قطرے کی مانند بن جاؤ۔ دنیا لاکھ آپ کو اپنے آپ میں ضم کرنا چاہے۔ مگر آپ اپنی معصومیت سادگی دلکشی اور مضبوطی نہ کھوؤ......''

ارسل احمد نے نگاہ اٹھا کر آنسوؤں سے چھلکتی غضب کی سرخیاں اور دلکشی سمیٹے آنکھیں ان کے چہرے پر جمائیں تو بے ساختہ و بے اختیار سسکنے لگا۔ ایسے گویا صبر تمام ہوا ہو۔ جیسے مزید ضبط کا یارانہ ہو۔

''مگر پاپا......! اس نے مجھے ٹھکرا دیا۔ حالانکہ مجھ سے محبت کی دعوے دار تھی۔ وہ جانتی بھی تھی۔ میں نے کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگا۔ کبھی ہاتھ نہیں پھیلایا۔ وہ جانتی تھی پاپا! ارسل بہت اَنا پرست ہے۔ پھر بھی مانگنے آیا ہے تو کیسا مجبور ہو گیا ہوگا۔ مگر پپا اس نے نہیں سوچا پہلی بار مانگنے پر اَنا کو قربان کرنے کے باوجود دھتکارا گیا ہوں۔ خالی لوٹا ہوں۔ دکھ کیسے کم ہو پپا......!''

چھوٹے بچوں کی طرح ہاتھوں میں چہرہ چھپائے وہ اتنا بڑا نوجوان لمبا تڑنگا تنومند مرد رو رہا تھا۔ اسامہ کو لگا کسی خونی بلا نے اپنا نوکیلا پنجہ مار کر ان کا دل سینے سے نوچ کر جلتے توے پر پھینک دیا ہے۔ ایسی ہی اذیت کا شکار ہوتے تڑپ اٹھے تھے وہ۔

''ایسے مت کرو ارسل بیٹے! اپنے باپ کو اتنا دکھی نہ کرو یوں تڑپ کر...... امن سے بدگمان نہ ہو...... وہ ایسی بچی ہی نہیں کہ محض اَنا کی تسکین کی خاطر آپ کو ہرٹ کرے...... وہ مجبور ہے کسی وجہ سے، کسی بڑی آزمائش سے دوچار، بھلے نہیں بتاتی...... مگر کسی امتحان میں مبتلا ہے جان سکتا ہوں میں...... آپ حوصلہ کرو اللہ کے ہاں ہر کام مقرر ہو چکا۔ سمجھ لیں وہ آپ کے لیے نہیں تھی۔ اللہ آپ کو اس کے بدلے بہتر نہیں بہترین سے نوازے گا۔ اللہ کے فیصلے کا انتظار کرو، اور خود کو تسلی دے لو۔ مقام شکر ہے کہ اَنا مجروح ہوئی۔ عزتِ نفس سلامت ہے۔ عزتِ نفس اور اَنا کے فرق کو سمجھو میرے بیٹے! عزتِ نفس کا تعلق ایمان سے ہے اور اِنا کا تعلق شیطان سے ہے...... اسی فرق کو پہچانو۔''

ان کا لہجہ ناصحانہ تھا۔ مدھم تھا، قائل کرتا ہوا تھا۔ مگر وہ کچھ سنتا تو ہی سمجھتا بھی۔

''مجھے تو یقین نہیں آتا پپا......! وہ میرے ساتھ ایسا بھی کر سکتی ہے۔ وہ بہت سوفٹ تھی۔ بہت کیئرفل ...... بالکل ماما کی طرح حساس اور محبت سے پیش آنے والی...... میں نے ہمیشہ عورت کو نرم ہی سمجھا تھا۔ موم کی طرح...... مگر اب پتا چلا کہ عورت موم ہے یا پتھر اس کا فیصلہ وہ خود کرتی ہے۔ وہ جتلاتی ہے کہ کسی تھرڈ پرسن کو اسے موم یا پتھر سمجھنے کا بھی حق حاصل نہیں۔ وہ اگر چاہے تو محبوب کے اشارے کی سمت مڑتی رہے۔ لیکن اگر پتھر بننے کا فیصلہ کرے تو کوئی شخص

بھکاری بن کر بھی اس کی نگاہِ التفات کو نہیں
پا سکتا۔"
اس کی سرخ ہوتی آنکھوں میں آنسو ہنوز مچل
رہے تھے۔ اسامہ نے ہاتھ بڑھا کر اس کے بال
محبت سے سنوارے۔
"کسی نے بہت خوب کہا ہے بیٹے! اگر اللہ
کے حصے اور حق کی محبت کسی بندے کے حوالے
کریں گے تو اللہ اسی بندے کے ذریعے تمہیں
توڑے گا۔ اپنے آپ کو مضبوط بنالو۔ اس کے سوا
کوئی چارہ کار نہیں۔ اللہ سے آس لگاؤ اُس سے لو
لگالو بیٹے......! سارے غم ڈھل جائیں گے۔ اس
لیے بھی کہ ہمارے عمل کی اوسط عمر ہماری اوسط عمر
سے بھاری ہوتی ہے۔ اللہ بہت مہربان ہے۔
بہت تھوڑے پر راضی ہوجاتا ہے۔ واپسی کے
قدم گن کر بھی اجر نہیں دیتا۔ بس محبت سے پلٹ
آنے والے کا دل دیکھتا ہے۔ اور جھولیاں بھر کے
لوٹایا کرتا ہے۔ آگے بڑھ کر راستہ صاف کرواتا
ہے کہ بھٹکا ہوا لوٹ رہا ہے۔ تو کہیں ٹھوکر نہ
کھالے کہیں کوئی کانٹا نہ لگ جائے۔ وہ اتنا ہی
مہربان ورحیم ہے۔"
وہ اسے دیکھ رہے تھے۔ ان آنکھوں میں
تائید کی خواہش تھی۔ وہ بھی ان نظروں کو سمجھتا تھا۔
ان کی محبت سے آگاہ تھا۔ جبھی دل رکھنے کو
مسکرایا۔ اسامہ بھی قدرے پُرسکون نظر آئے۔

☆......☆......☆

وہ سب ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے۔
کمرے میں بالکل خاموشی...... سناٹا ایسا تھا جو
روح میں اترے۔ وحشت ایسی تھی جو جان لیوا
ثابت ہورہی تھی۔ سب ایک دوسرے سے نظریں
چراتے تھے۔ عبداللہ کے ہونٹ باہم بھینچے ہوئے
اور آنکھیں سرخ تر تھیں۔ وہ باری باری سب
سے لڑ چکا تھا۔
ہرگز ہرگز وہ یہاں امن کی شادی پر راضی
نہیں تھا اور جب سے بریرہ نے استخارہ کیا تھا۔ وہ
بھی مخالف تھیں کہ واضح اشارہ نفی کا ہی تھا۔ ماں
تھیں، ہرگز بھی اپنی بیٹی کی بربادی یا پھر دائمی
آزمائش کی قائل نہیں تھیں۔ وہ خود امن کو قائل
کرتے روہانسی وہلکان ہوتی رہی تھیں۔ جو مان کر
نہیں دیتی تھی۔ اور اول تو کچھ بولتی نہیں تھی۔ ان
کے آنسوؤں سے ہار کر اگر زبان کھولی بھی تو بریرہ
کے دکھ میں اضافہ ہی کیا تھا۔
"بعض دکھ قسمت میں لکھے ہوتے ہیں وہ
ہمیں ملنے ہوتے ہیں۔ آپ یہی سمجھ لیں ماما کہ یہ
دکھ میرے نصیب میں ثبت ہو چکا ہے۔ کچھ
سچائیاں یا حقیقتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ جتنی بھی تلخ
و ناگوار لگیں انہیں قبول کرنا پڑتا ہے۔ انسان ہر
وقت خود پر ترس کھاتا رہے اور اپنی زندگی میں
آنے والے دکھوں کے بارے میں سوچتا رہے۔
تو وہ دکھ اس پر حاوی ہوجاتے ہیں۔ پھر اگر اس
کی زندگی میں خوشیاں آئیں بھی تو وہ انہیں دیکھ
نہیں پاتا۔ مجھے اس دکھ سے سمجھوتہ کر لینے دیں
ممی......! مجھے اس سے باہر آنے کا مشورہ نہ
دیں۔"
وہ بولتی تھی تو آنسو اس کی پلکوں سے ٹوٹ کر
بکھر کر اس کی اذیت اور بے بسی کو آشکار کرتے
گئے تھے۔ بریرہ کا دل کٹ کٹ کر پورے وجود
میں بکھرنے لگا۔ کچھ کہے بغیر نم آنکھوں میں دکھ
سموئے وہ اسے دیکھتی رہی تھیں۔ ماں تھیں،
عورت بھی...... بنا کہے بیٹی کی آنکھوں میں چھپا
بدنامی کا خوف جان گئی تھیں۔ مگر عبداللہ مرد تھا۔
جذباتی بھی...... جبھی نہ ان کی طرح خاموش رہا تھا
نہ سمجھ پارہا تھا نزاکت کو...... جبھی اس کے اصرار کو

اس کی ضد یا پھر اکڑ سے تعبیر کرتا ہوا شاکی ہو گیا تھا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو...... ہمیں کچھ نہیں سمجھانا چاہیے تمہیں...... تم بڑی ہو گئی ہو...... اپنے فیصلے خود کر سکتی ہو...... ویسے بھی تمہارے رویے نے ہی مجھے یہ جتلایا ہے کہ حق ان پر جتایا جاتا ہے جو رشتوں کو اہمیت دینے اور مان سلامت رکھنا جانتے ہوں۔ جو اس احساس سے ہی بے بہرہ ہوں ان پر مان جتانا سوائے حماقت کے کچھ نہیں۔"

کتنا رنج و کرب عبداللہ کی بھاری بھر کم آواز میں اترا ہوا تھا۔ وہ جو شاید ہی کبھی اتنا سنجیدہ و دکھی ہوا تھا۔ زندگی میں جتنا اس مرحلے پر تھا۔ اس کی بدولت گہرے تاسف و ملال میں گھر چکا تھا۔ امن کو عجیب سی افسردگی نے آن لیا۔

"کاش تم سمجھتیں امن...... ! تمہارے لیے ...... لڑکوں کی خاص کر اچھے لڑکوں کی کمی نہیں تھی۔ پھر یہ اتنا سطحی انتخاب کیوں؟"

اس کا دکھ ڈھلتا ہی نہ تھا۔ ختم ہی نہ ہوتا تھا۔ امن نے نگاہ بھر کے اپنے بے حد وجیہہ و خوبرو نوجوان مگر بے بس نظر آتے بھائی کو دیکھا تھا اور متاسفانہ سانس بھرتے سر جھکا لیا۔

"میں صرف ایک بات کہوں گی بھائی...... ! اور وہ یہ کہ...... اچھے اور اعلیٰ ظرف لوگوں کو تلاش کرنے سے بہتر ہے خود اچھے بن جائیں...... شاید کسی کے کام آ جائیں۔ شاید کسی کی بھلائی کا وسیلہ بن جائیں۔ اک مثال آپ کے سامنے ہمارے والدین کی صورت موجود ہے۔ اک عبدالغنی ماموں اور لاریب بو کی صورت بھی موجود ہے۔ اگر ہم ایسے والدین کی اولاد ہیں۔ تو اس سلسلے کو آگے بھی بڑھنا چاہیے۔ اگر ہم خود پر کام نہیں بھی کریں گے تو خدا اس کے خود سے اسباب و انتظام پیدا کر دے گا۔ یہ خدائی فیصلہ ہے۔ آپ یہ سوچ کر ہی صبر کر جائیں۔"

ایسا تدبر...... ایسا تحمل ایسی بے مثل عنایت و صبر اور راتوں رات...... عبداللہ منہ کھولے اسے دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ جو اسی رسانیت سے مزید گویا تھی۔

"میں نے تو اس سارے معاملے سے اک بات سیکھی ہے بھائی کہ ہمیں ہر حال میں اللہ کی رضا میں راضی ہونا سیکھنا ہے۔ بیشک اس صورت میں بھی کہ ہم کچھ اور چاہ رہے ہوں اور ہو کچھ اور رہا ہو۔ یاد رکھا جائے کہ سارا جھگڑا ہی اس ہونے اور چاہت کا ہے۔ جو ہو رہا ہے وہ قدرت کا عمل اور جو چاہت ہے وہ ہم سے منسوب ہے۔ سکون پا گئے جو اپنی چاہت سے دستبردار ہو کر قدرتی عمل پر راضی ہوئے۔ یہ بات یاد رکھی جائے کہ انسان پر کبھی راستہ بند نہیں ہوتا۔ ہر دیوار کے اندر ایک دروازہ ہے۔ جس میں سے مسافر گزرتے رہتے ہیں۔ مایوسی کی دیواروں میں بھی اُس کی رحمت امید کے دروازے کھولتی ہے۔ انتظار ترک نہ کیا جائے یہی بڑی کامیابی ہے۔ بھائی کامیابی کسی نقطے کا نام نہیں...... یہ مزاج کا نام ہے۔ کیفیت کا نام ہے۔ ایک احساس ہے۔ مجھے اس احساس اور کیفیت کی حفاظت کرنی ہے۔ اس مزاج کو اپنانا ہے۔ پلیز آپ سمجھیں یوں خفا نہ ہوں مجھ سے......"

اس کا ضبط چھلکا تھا بالآخر...... وہ گھٹ گھٹ کے رونے پر مجبور ہو گئی۔ عبداللہ جو گم صم سا کن کھڑا تھا۔ کچھ کہے بغیر اسے ساتھ لگا کر تھپکنے لگا۔ انداز واضح طور پر ہارا ہوا تھا۔ شکستہ و دل گرفتہ ...... ماحول میں فضا میں گھمبیر خاموشی اور یاسیت

اترتی چلی جارہی تھی۔

☆......☆......☆

سنو یہ وقتِ رخصت ہے
سکوتِ سفر طاری ہے
ختم عمروں کا زرِ باقی ریزگاری ہے
سنو آنکھیں تو گم صم ہیں
دلوں میں آہ و زاری ہے
سنو یہ ضبط کا موسم نہیں
بے اختیاری ہے
سنو یہ آس کی ڈوری اٹھا لو ہاتھ سے میرے

تمام تر ضبط کے باوجود دل غم سے نڈھال ہوا جاتا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ سوحا اپنے بیٹے دائم کے ہمراہ پورے تفاخر، غرور اور تکبر سے گردن تانے ہارون اسرار کے ہاں آئی تھی۔ اس کی نظریں بہت کچھ جتاتی ہی نہیں طنز کے تیر مارتی تھیں اور ہر لحظہ زخمی کرتی تھیں۔ اتنا کہ امن کو اپنا وجود چھلنی ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ خاموش رہنا پسند نہیں کرتی تھی۔ جبھی بار بار حملہ کرتی تھی۔

"میں تمہیں معاف بھی کر سکتی تھی ہارون اسرار مگر میں نے تمہیں معاف نہیں کیا۔ پتا ہے کیوں......؟ اس لیے کہ تم میری چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو بھی نظر انداز نہیں کر سکے تھے۔ جبھی تم میری بڑی خوبیوں سے بھی فیض یاب نہ ہو سکے۔"

اس کا لہجہ حقارت آمیز تھا۔ ہارون اسرار اس متکبر بے راہ رو عورت کو دیکھتے رہ گئے۔ وہ بدکردار تھی۔ یہ بات واضح تھی۔ ان کے نکاح میں ہوتے اس کے تعلقات بیک وقت کئی مردوں سے تھے۔ یہ اولاد جسے بھی وہ ان کے سر تھوپنے پر تل گئی تھی۔ سچی بات تو یہ تھی کہ وہ خود بھی اس کے حقیقی باپ کا نام بتانے سے قاصر تھی تو یہ بھی ایک واضح سچائی تھی کہ وہ بھی ہارون کی طرح اس حقیقت سے آشنا تھی۔ کوئی بھی سہی مگر دائم کے والدیت ہارون کے کھاتے میں درج نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے باوجود اک ڈھٹائی بھی ہوتی ہے۔ اور بے شرمی و بے غیرتی بھی، جس کا کوئی انت ہوتا ہے نہ شمار یہ لامحدود ہوتی ہے۔ جبھی وہ اس ڈھٹائی کے سہارے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کتنی جرأت سے کہہ رہی تھی۔

"مجھے تو حیرانی ہے ہارون اسرار تم اب تک شرم سے ڈوب کر کیوں نہ مر گئے۔ سگے نہ سہی سوتیلے سہی مگر وہ دونوں بہن بھائی ہیں۔ اور رشتہ ازدواج میں منسلک ہو چکے ہیں۔ صرف یہی نہیں، عنقریب تمہارے یہ بچے ایک بچے کے والدین بھی بن جائیں گے۔ سوچو کیا رشتہ ہوگا تمہارا اس بچے کے ساتھ......" اور جواباً ہارون کی آنکھوں کی سرخی گہری مزید گہری ہونے لگی تھی۔

"سچ پوچھو تو منہ مٹی سے بھر جاتا ہے۔ جب گری ہوئی بات اٹھانا پڑ جاتی ہے۔ اللہ کے قہر کو آوازیں نہ دو تو بہتر ہے۔ خوف تھوڑا سہی مگر غنیمت ہے۔"

اور جواباً سوحا گویا اپنے تئیں ان کی بے بسی محسوس کرتی قہقہہ لگانے لگی تھیں۔

"تمہارے منہ سے نصیحت اس لیے بھی بے اثر ہے ہارون اسرار کہ تم خود بے عمل ہو۔"

خاصی تاخیر سے ہنسی روک کر وہ پھر اسی حقارت سے بولی تھی۔ ہارون کی آنکھوں میں لہو سا اترنے لگا۔ جس پر نگاہ جمائے وہ عجیب سی حسرت سے کچھ دیر انہیں دیکھتی رہی تھی۔ پھر سرد آہ بھر کے سر جھٹکا۔

تمہاری آنکھوں میں لال ڈورے
رات دشمنوں کے پھر نصیب جاگے

ہارون اسرار دوہک کر رہ گئے۔ بے شرمی کا مظاہرہ انہیں خفت سے بھر گیا تھا۔ دائم کی موجودگی میں اتنی فضول بات کا کہاں گمان رکھتے تھے وہ...... اور وہ بھی اس عمر میں، بھینچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ وہاں سے اٹھتے انہیں ایک بار پھر صحیح معنوں میں امن کی فکر لاحق ہوئی تھی۔ انہیں ان دونوں کو تکتے انتہائی تاسف و ملال نے آن لیا تھا۔ قدرت کا شاہکار انسان مادیت کے اس دور میں اپنی اہمیت کھو رہا ہے۔ اسے شعور ہی نہیں رہا۔ قدرت نے اسے کن بے بہا خوبیوں سے نوازا ہے۔

وہ دکھ میں مبتلا سوچتے رہے تھے۔

''سمندر پہاڑ اور ریگستان یہ تینوں اللہ نے اس لیے بنائے ہیں کہ جب انسان اپنی اوقات بھولنے لگے تو انہیں دیکھ کر عبرت پکڑے۔ اپنی اصلیت پہچانے۔''

وہ اتنے بے بس اس درجہ نڈھال اور شل محسوس کر رہے تھے خود کو کہ کچھ بولنے کی ہمت بھی ناپید تھی۔

''تم انکار کی پوزیشن میں نہیں رہے ہو ہارون اسرار!'' وہ جیسے ان کے زخموں پر نمک پاشی کرنے میں مصروف تھی۔ ہارون نے شکستہ نظریں نہیں اٹھائیں۔

''ہم انکار نہیں کر رہے ہیں آپ کو...... عنقریب آپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ بھی کر دیں گے۔'' بریرہ کو خود ہمکلام ہونا پڑا۔ ہارون کی خاموشی تکلیف دہ احساس تھا۔ وہ اس احساس سے نکلنا چاہتی تھیں۔

''آپ سے کس نے کہا ہے خاتون! ہم انتظار کرنے والے ہیں......؟ ہم آپ کی دختر نیک اختر کو رخصت کروانے آئے ہیں۔ ابھی اسی وقت......''

دائم کی خاموشی ٹوٹی تھی۔ اس کا لہجہ بہت تمسخرانہ اور تیکھا تھا۔ ترشی سے لبریز...... لحاظ و مروت سے عاری...... اس کی گستاخ آنکھوں جیسا برفیلا...... اسے تکتے اسے سمجھتے...... بریرہ کے اندر دکھ کی گہری اذیت اترنے لگی۔ امن اکلوتی بیٹی تھی ان کی مگر اس کا نصیب...... ان کا دل ہوک اٹھا تھا گویا۔

''اتنی جلدی...... مگر یہ ممکن نہیں۔ ہمارے سب رشتے تو اس وقت......'' وہ گھبرائی تھیں، بلکہ ہکلائی تھیں۔ کسی حد تک سراسیمہ ہو کر ہارون کو تکنے لگیں۔ جو ان سے بڑھ کر بے بس تھے گویا۔ زندگی نے، امن نے انہیں کیسے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ بے چارگی اور دکھ کا ایسا احساس تو اس سے قبل کبھی ان کے دل میں جگہ نہیں بنا سکا تھا۔ آج انہوں نے جانا تھا۔ انسان اپنا دکھ جتنا بھی بڑا ہو گہرا ہو برداشت کر سکتا ہے۔ اولاد کا دکھ کتنی تیزی سے مسمار کر سکتا ہے۔ یہ ابھی معلوم ہوا تھا۔

''محترمہ! اتنی تاخیر ہمارے نہیں خود آپ کے لیے شرمندگی اور پریشانی کا باعث بن سکتی ہے۔ آپ کی بیٹی اپنی پریگننسی کی خبر سنا کر...... آپ لوگ شاید جانتے نہیں ہیں کہ ان دونوں کا تعلق......'' سوحا باقاعدہ مضحکہ اڑانے والے انداز میں دانت نکوس کر کہہ رہی تھیں۔ ایک بار پھر غضب کی سرخی ہارون اسرار کے چہرے پر اتری اور آنکھوں میں عجیب سی وحشت تیرنے لگی۔

''امن کو لے کر آؤ، تیاری میں بھی ٹائم ویسٹ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

وہ اس وحشت میں گھرے گھرے ضبط کھو کر چلائے تھے کہ بریرہ جو صدمہ سے گنگ بیٹھی تھیں۔

کچھ بوکھلا کر تیزی سے اٹھ گئیں۔ اس پل انہوں نے نہیں دیکھا۔ سوحا کی آنکھوں میں کیسی فتح اتری ہے۔ دائم کے چہرے پر کتنی خباثت ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ پھر دونوں ہی مسکراہٹ دبا گئے تھے۔

☆......☆......☆

ضبط کے ہزار دعوے ناکام برداشت کی ہر کوشش بے کار، اس کی آنکھیں بہہ رہی تھیں۔ وہ چلی گئی تھی۔ اس کی بدنصیبی پر بے مائیگی پر گہری مہر ثبت کرنے کے بعد' کیسا شب خون پڑا تھا دل پر۔ سب کچھ ہی لٹ گیا تھا۔ مایوسی ایسی دلگیری ایسی کہ جذباتیت کی انتہا پر جاکر وہ خودکشی کی کوشش بھی کر چکا تھا۔ اگر سارہ بروقت مداخلت نہ کر جاتیں تو اب تک پتا نہیں کہاں ہوتا وہ، اس کی یہ حالت تبا ہی سارہ کو سراسیمگی کی انتہاؤں پر لے گئی تھی گویا ان کی وحشت تھی کہ ختم نہ ہوتی تھی۔ اس سے لپٹی ایسے آہ فغاں کر رہی تھی ایسے تڑپی تھیں کہ ارسل کو سب کچھ بھلانا پڑ گیا تھا ان کی حالت پر۔

''اگر ایسا ہوا تو میں مر جاؤں گی تم سے پہلے ارسل! تمہیں میرا کیوں خیال نہیں آیا۔''

''مجھے معاف کردیں اماں پلیز!'' وہ گھٹی ہوئی آواز میں یہی کہہ سکا۔

''سچ کہو...... آئندہ تو نہ کرو گے ایسا......؟''

ان کی نظروں میں کتنا خوف تھا۔ اس نے لاچاری کی انتہا پر جاکے سر کو نفی میں جنبش دی تھی۔ مگر سارہ کو پھر بھی یقین نہ آتا تھا۔ جبھی تو وہ پل پل اپنی نگرانی پر مامور پانے لگا تھا انہیں۔ بھلا کیا سمجھاتا انہیں، جو پل پل مرتا ہو...... وہ اس موت کے لیے کیسے نہ تڑپے گا۔

''سب کچھ خواہشات کا پورا ہو جانا ہی نہیں ہوتا ہے یار من! نفس کی مخالفت سب عبادتوں کا اصل اور سب مجاہدوں کا کمال ہے۔''

اسامہ نے اس کی پیشانی چوم کر ایک بار پھر سمجھایا تھا۔ مگر وہ اس دل کا کیا کرتا۔ جو سمجھنے کو ہی تیار نہ تھا۔ اس کی سرخ آنکھوں میں پھر نمی آنچ کا احساس لیے تیرنے لگی۔ کتنی بے اعتنائی تھی تب امن کے الفاظ میں، کتنی تپش......

''یہ نہ سمجھنا کہ میں تم پر احسان کر رہا ہوں امن! پلیز مان جاؤ کردو اِدھر انکار......'' جواب میں وہ اسے کیسے دیکھتی رہی تھی۔ وہ ان نظروں کا مفہوم سمجھ ہی نہ سکتا تھا۔

''سمجھنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی ہے ارسل احمد! سمجھ لیں اب مجھے آپ کے احسان کی بھی ضرورت نہیں۔ ہمدردی و محبت سمیت، احسان کی بھی نہیں۔ اس لیے کہ میں اس کی اہل نہیں، یہ بار نہیں اٹھا سکوں گی۔'' اور ارسل دکھ سے لبریز ہوتا چلا گیا تھا۔

''احسانوں کے بدلے تب چکائے جاتے ہیں امن! جب تعلق جوڑنا ہو...... جہاں محبت کا تعلق ہو وہاں احسان کیا بھی جاتا ہے اور رکھا بھی جاتا ہے۔''

''مگر میں اب ان سب احساسات و نوازشات سے بے نیاز ہوں سمجھ لیں۔ کچھ نہیں چاہیے آپ سے سوائے سب بھول جانے کی گزارش کے......''

وہ کتنی سہولت کتنی آسانی سے کہہ رہی تھی۔ ارسل کو اس پل اس سے بڑھ کر کوئی کٹھور نہیں لگا۔ اس سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں لگا۔ حد تھی بے حسی کی حد تھی سفاکی کی حد تھی حاکیت کی بھی مگر اسے سر جھکانا تھا۔ سو اس نے سر جھکا دیا۔ اسے بھولنے کی خواہش میں شرط تھی خود کو بھولنا خود کو فراموش

کرنا۔ اس نے خود کو فراموش کر دیا تھا۔ اور خود فراموشی کے بہت سے طریقے ہیں۔ وہ بھی ہر طریقہ آزماتا تھا۔ اور ڈاکٹرز کے ساتھ سارہ کی بھی سالوں کی محنت و ریاضت داؤ پر جا لگی۔ وہ پھر سے حواسوں سے باہر ہو رہا تھا۔ وہ پھر سے انبار ملٹی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ غم سے سمجھوتہ کرنا بہت بہادری ہے۔ اسے اعتراف تھا۔ وہ ہرگز بہادر نہیں تھا۔

☆......☆......☆

وہ بھی راکھ ہو جانا چاہتا تھا۔ خاک بنا کر خود کو اڑا دینے کے درپے تھا۔ مگر ماں اور ماں کی دعائیں راستے میں رکاوٹیں بن بن کر کھڑی ہوتی رہیں۔ سارہ کو سب بھول گیا تھا سوائے اس کے...... وہ صرف حواس باختہ نہیں تھیں۔ ہمیشہ کی طرح یہاں بھی رب سے مدد کی درخواست گزار ہو گئی تھیں۔ گریہ وزاری کا عالم بھی انوکھا تھا۔ وہ ہر ہر صورت رب سے بیٹے کی واپسی کی متمنی تھیں۔ ان کی حالت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا اگر حسبِ خواہش نہ ملا تو جان سے ہار جائیں گی۔ وہ بار بار کال کرتی تھیں۔ لاریب کو ایک ہی گزارش......

''رب کو منا لو میرے لیے لاریب! ارسل پھر سے ٹھیک ہو جائے۔'' وہ شدتوں سے روتی جاتی تھیں۔ اور اک ہی بات دہراتی تھیں۔ بار بار ہزار بار، دعائیں تھیں۔ التجائیں تھیں، اضطراب تھا۔ اور یقین بھی، یہی یقین کشتی کو ڈوبنے سے بچاتا ہے۔ یہاں بھی کامیابی نصیب ٹھہرنے لگی۔ ارسل پھر سے امپرو کرنے لگا۔ اور واپس دھیرے دھیرے سہی مگر ایک بار پھر نارمل ہو گیا تھا۔ مگر ایک چپ لگ گئی تھی۔ آنکھوں میں اتنی ویرانیاں تھیں کہ اک نگاہ ڈال کر دوسری کا یارا نہیں رہتا تھا۔ ایسے میں اپنی آزمائش اور اذیت میں مبتلا امن بھی نا چاہتے ہوئے اس سے ملنے آ گئی تو اسے دیکھ کر سناٹوں میں گھرتی چلی گئی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا۔ ارسل کی حالت اس سے کہیں بڑھ کر تباہ کن ہو چکی تھی۔ جتنا اسے بتایا گیا تھا کچھ بولے بنا وہ گنگ اسے دیکھے گئی تھی بس۔

''کیوں سزا دے رہے ہیں خود کو......؟''

اس کا ضبط چھلک گیا۔ سسک پڑی تھی جبھی وہ۔

ارسل نے نگاہ نہیں اٹھائی۔ جیسے سر جھکائے بیٹھا تھا بیٹھا رہا۔ امن کی سسکیاں کراہوں میں تبدیل ہونے لگیں۔

''بے نیازی سے خیال تک کا سفر اور بیگانگی سے محبت کا سفر اسے کن اذیتوں سے دوچار کر گیا تھا۔ یہ کیسے جان سکتا تھا وہ......''

''ایسے کیوں کر رہے ہیں ارسل احمد! مجھے احساس ملامت کی مار تو نہ ماریں۔'' وہ ابھی تک گھٹ گھٹ کر رو رہی تھی۔ ارسل نے محض اک نظر اسے دیکھا پھر وہی غفلت تھی۔ امن جیسے دودھاری تلوار سے کٹنے لگی۔ اس نے ہونٹ اک کرب آمیز کیفیت میں بھینچے تھے۔ کچھ دیر یونہی چپ رہی پھر گہرا مناسفانہ سانس بھرا تھا اور افسردگی سے اسے تکنے لگی۔

''دنیا کی ساری چیزیں ٹھوکر لگنے سے ٹوٹ جاتی ہیں مگر صرف انسان وہ مخلوق ہے کہ جو ٹھوکر لگنے کے بعد بنتا ہے۔'' اس کا انداز ناصحانہ ہوا۔ مگر ارسل کی بے رخی اسے پھر روہانسا کرنے کا باعث تھی۔ صاف لگتا تھا وہ اسے معاف نہیں کر پا رہا۔

''ارسل......!'' وہ پھر سسکی۔

''تم چلی جاؤ۔ اب یہاں نہ آیا کرو۔'' وہ بولا بھی تھا تو کیا...... امن کا کلیجہ جیسے شق ہو کر رہ

گیا۔ وہ کیا جانتا تھا۔ کیسے جرم کے احساس میں مبتلا ہو کر یہاں تک آئی تھی وہ اور کن کانٹوں پر چل کر...... زندگی اب کتنی کٹھن تھی۔ یہ تو ارسل بھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی بریرہ کے سامنے دکھ بولے مگر ماں کی گود کی گرمی میسر آئی تو زبان سے اک اک دکھ از خود جھڑنے لگا تھا۔ بے مائیگی سی بے مائیگی تھی۔ اضطراب سا اضطراب تھا۔ جو آبلے کی صورت خود بخود پھوٹ پڑا تھا۔ اور بریرہ وہ بھی جس کے صبر و برداشت کا برسوں قبل ہر کوئی قائل ہو چکا تھا۔ یہاں بیٹی کو سمیٹنے اور جوڑنے میں بھی یہی برداشت اور ظرف ان کے کام آیا تھا جو اللہ نے وافر مقدار میں عطا فرمایا تھا انہیں۔ ان کا سمجھانے کا بھی بہت مشفق انداز تھا۔

''تمہیں صبر کرنا ہوگا امن بیٹے کہ ہم الحمدللہ مسلمان ہیں۔ قرآنِ حکیم ہمارے پاس ہماری رہنمائی کے لیے موجود ہے۔ اور کتاب اللہ کا منشاء یہ ہے کہ کسی بھی قیمت پر ماحول پر امن رہے۔ فریق گستاخی کرے یا بدتمیزی...... جہالت سے کام لے یا بدتہذیبی سے ردِ عمل میں کامیابی کا وہی فارمولا کام آئے گا۔ جسے ہم صبر کہتے ہیں۔'' امن نمناک نظروں سے انہیں دیکھتی رہی۔ اسے اس پل ان پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ وہ جتلا بھی سکتی تھیں اس اہم مقام پر...... مگر انہوں نے نہیں جتلایا کہ وہ چیزیں جو والدین کو دکھ پہنچا کر حاصل کی جاتی ہے وہ کسی بھی تسکین نہیں بددعا کا باعث ہی بنتی ہیں۔

''مجھے شکوہ نہیں کرنا چاہیے ماما! میں یقیناً بہت بری تھی۔ جبھی یہ مستقل عذاب آ کر پڑا ہے مجھ کو، وہ لوگ ہر ہر لحہ مجھے ذلیل کرتے ہیں۔''

اس کی ہچکیاں بندھنے لگی تھیں۔ وہ اتنے عرصے بعد آئی تھی۔ ہر بوجھ ہلکا کر لینا چاہتی تھی جیسے۔

''کسی کے برا کہہ دینے سے نہ ہم برے ہو جاتے ہیں نہ وہ اچھا...... اپنی زبان سے ہر شخص گویا اپنا ظرف دکھا رہا ہوتا ہے دوسرے کا عکس نہیں۔ سو ایسی باتوں پر دھیان دینا ہی چھوڑ دو۔''

عبداللہ جو اس سے بیشک خفا تھا۔ مگر اس کی حالت دیکھتے دکھ میں مبتلا ہو چکا تھا۔ ہر شکوہ ہر خفگی کہیں پس پشت رہ گئی تھی۔ غم و غصہ افسردگی مل جل کر اسے جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہے تھے۔ بریرہ نے گہرا سانس بھرا۔

''اللہ سے التجا ہے۔ اللہ پاک تمہیں تمہارے نیک مقصد میں کامیاب کرے، آمین۔'' انہوں نے بیٹی کا سر تھپک کر حوصلہ دیا تھا۔ امن نے حوصلہ پکڑا بھی تھا۔ مگر یہاں ارسل کے سامنے آ کر اس کے سارے حوصلے جیسے پھر سے مسمار ہونے لگے تھے۔ کتنی بے بسی اتر آئی تھی اس کے ہر انداز میں، جبکہ ارسل اسے نمناک غم آلود نظروں سے دیکھتا تھا۔ شدتِ جذب کے باوجود اس کے ہونٹ کانپنے لرزنے لگے۔

وہ بھی اسی جنوں کی کیفیت میں تھا۔ جبھی ہاتھ مار کر میز سے چیزیں گرا دیں اور زور سے چلایا۔

''تم چلی جاؤ یہاں سے، تم نے سنا نہیں...... میری تکلیف کو مت بڑھاؤ۔ ورنہ مار ڈالوں گا میں خود کو......'' وہ پھر حواس کھونے لگا۔ امن حواس باختہ سی اٹھی تھی اور تیزی سے باہر بھاگی کہ اندر آتے عبدالغنی سے ٹکرا گئی۔ عبدالغنی نے نرمی بھرے انداز میں اسے شانوں سے تھاما کہ وہ انہیں ہرگز نارمل نہ لگی تھی۔

''ماموں ...... وہ ...... ارسل ......!'' وہ بلک پڑی تھی بات مکمل کیے بنا ہی۔

''آپ جاؤ بیٹے! میں اس کو دیکھنے آیا تھا۔''

انہوں نے اس کا سر تھپکا۔ وہ ہونٹ کچلنے لگی۔ عبدالغنی اندر چلے گئے۔ وہ وہیں کھڑی تھی۔
''وہ کہہ رہے ہیں، میں چلی جاؤں۔'' اس نے اسی پل سارہ کو مخاطب کیا۔ جو ابھی ابھی آئی تھیں۔ سارہ نظریں چرا گئیں۔
''آنٹی...... رشتے واقعی کانچ کے برتن ہوتے ہیں......؟ کہ ٹوٹ گئے تو بس ٹوٹ گئے۔ یہ شاخوں سے ٹوٹے پھولوں کی طرح تو نہیں ہوتے کہ مرجھا کر فنا ہو جائیں۔ یہ تو سانسوں کی آمد و رفت کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں ناں؟'' سارہ نے بے اختیار اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ اس کا کانپتا وجود بازو کے حصار میں لے کر خود سے لگایا اور نرمی سے پیار سے تھپکا۔
''اصل میں بہت ڈسٹرب ہے بیٹا! اس کی باتوں کا برا نہ مانو، پلیز۔'' امن نے سرد آہ بھری تھی۔
''وہ کچھ اتنا بھی غلط نہیں کہتے ہیں آنٹی! میرا سامنا ان کے زخموں کے ٹانکے ادھیڑتا ہوگا۔ میں آئندہ نہیں آؤں گی۔ مگر انہیں سنبھالیے گا۔ انہیں سمجھایئے گا آنٹی کہ...... اگر زندگی میں ایک دروازہ بند ہو جائے تو اللہ خیر کے دوسرے دروازے ہم پر کھول دیتا ہے۔ آج اگر کسی بات سے غم ملا ہے تو اللہ پر یقین رکھیں وہ کل خوشی کا سامان بھی ضرور پیدا کرے گا۔ بات تو ساری یقین کی ہے۔'' سارہ کچھ نہیں بولیں۔ البتہ تائیدی انداز میں مسکرا کر اس کا گال ضرور سہلایا تھا۔

☆......☆......☆

عبدالعلی اندر داخل ہوئے کھنکارا اور دزدیدہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ جس کی نماز طویل تر ہوتی جاتی تھی آج دوپٹہ پیشانی تک منڈھے رو رو کر سرخ ہوتی آنکھوں کے ساتھ وہ اسے قابل رحم بھی لگی اور پیاری بھی۔
''اِدھر آؤ، بات سنو۔'' اس سے قبل کہ وہ پھر نیت باندھتی عبدالعلی نے مخاطب کر لیا تھا۔
''میں نماز پڑھ رہی ہوں۔ دیکھ تو رہے ہوں گے آپ۔'' جواباً وہ روٹھے روٹھے انداز میں چڑ کر بولی تھی۔ عبدالعلی کھنکارا اور گویا باقاعدہ میدان میں اتر آیا۔
''نماز تو تم غالباً پڑھ چکی ہو۔ عشاء ہرگز اتنی طویل نہیں ہوتی۔ دو گھنٹے سے پڑھ رہی ہو غالباً۔'' وہ نگاہ بھر کے وال کلاک کو دیکھ کر جتلانے سے باز نہیں آیا۔ جہاں پونے گیارہ ہو رہے تھے۔ قدر سخت جز بز ہوئی۔
''نفلیں پڑھ رہی ہوں۔'' اس نے منہ پھلایا۔
''منت کے......؟ کہ نہ جاؤں میں......؟'' عبدالعلی نے مسکراہٹ دبائی اور قدر کو آگ لگا دی۔ وہ گھور رہی تھی اب اسے۔
''آ جاؤ، بات سن لو۔ نفل نماز شوہر سے بچنے کو پڑھنا بھی بہر حال جائز نہیں۔'' اب وہ کھل کر مسکرا رہا تھا۔ قدر نے جائے نماز پیروں تلے سے کھینچا۔ تہہ کیے بغیر کرسی پر رکھا اور اسے تپتی نظروں سے دیکھتی مزید فاصلے پر چلی گئی۔
''اپنی مرضی کے متعلق سارے اسلام کے حوالے یاد ہوتے ہیں آپ کو۔ یہ بھی یاد رکھ لینا تھا۔ اگر بیوی اجازت نہ دے تو شوہر اسے چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔'' وہ رونے کو تیار کھڑی تھی جیسے عبدالعلی گہرا سانس بھر کے رہ گیا۔ اٹھا اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے پہلو میں بستر پر لے آیا۔
''کوشش کرو شکوے شکایات کم کرو۔ اللہ کی نعمتوں کے لیے شکریہ ادا کرو۔ اپنے مسائل کے بارے میں نہ سوچو۔ مسائل حل کرنے کے لیے

کوشش کرو۔ نتائج کے بارے میں فکر نہ کرو۔ صرف اپنی ذمہ داریاں قبول کرو۔ جتنی کر سکتی ہو۔ اپنی سکت سے زیادہ کام بیشک نہ کرو۔ اور پھر اللہ سے باتیں کرو۔ اپنے اردگرد کے لوگوں اور اپنے گھر والوں کو خوش رکھنے کی کوشش کرو۔ تمہیں بھی خوشی ملے گی ریئلی۔'' قدر کچھ نہیں بولی۔ بس سسکیاں بھرتی رہی۔ عبدالعلی نے کچھ دیر اسے دیکھا پھر اس کا دھیرے دھیرے لرزتا وجود بازوؤں میں بھرلیا۔

''ایسے پریشان کرو گی مجھے تم قدر!'' وہ مضطرب ہونے لگا۔ قدر بس اپنے رونے کے شغل میں مصروف......

''کچھ بھی تم سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ تم جانتی تھی میرا جنون ہے یہ میرا کام۔'' وہ اب کے نرمی سے جھنجلایا۔

''آپ کا مطلب ہے میں شادی نہ کرتی آپ سے......؟'' وہ قدرے غصے میں آئی اور اسی غصے میں اس کے ہاتھ اپنے وجود سے جھٹکنے لگی۔ عبدالعلی اس کے اس غصے و خفگی کے اظہار پر نا چاہتے ہوئے بھی مسکرانے لگا۔

''نہیں، یہ مطلب نہیں تھا۔ میں جانتا تھا یہ لڑکی میرے بغیر نہیں رہ سکتی۔'' وہ یکدم تھم سی گئی اور شاکی ہو کر اسے دیکھا۔

''تو پھر اب آپ یہ اہم بات کیوں بھول گئے ہیں عبدالعلی کہ میں اب بھی آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی......'' اس کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی تھی۔ عبدالعلی نظریں چرا گیا۔

''تم میری ہو چکی ہو قدر! میں صرف تمہارا ہوں۔ جہاں بھی چلا جاؤں کام تو کرنا ہوتا ہے ناں۔'' اس کا انداز صاف بہلاتا ہوا تھا۔

''تو پھر مجھے ساتھ لے جائیں۔'' وہ مچلی تھی۔ عبدالعلی سر پیٹنے والا ہو گیا۔

''محاذ پر ساتھ لے جاؤں......؟'' وہ سخت چڑا۔

''وہاں بیویاں نہیں جاتیں۔ سیاچن کے پہاڑوں پر تعینات ہوا ہوں۔ وہاں زندگی کتنی مشکل ہے تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔''

''تو آپ بھی نہ جائیں۔ آپ کیسے رہیں گے؟ مجھے آپ کی فکر ہے۔'' اس نے بے طرح عجلت بھرے انداز میں ٹوکا۔ عبدالعلی اسے جھڑکے بغیر نہیں رہ سکا۔

''قدر......!'' وہ غرایا تھا۔ پھر اسے سہمتے اور روہانسی ہوتے پا کر بے اختیار ہونٹ بھینچ ڈالے۔ کچھ دیر خود پر قابو پایا پھر آہستگی سے نرمی سے اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا تھا۔

''میں تمہارے جذبات سمجھ سکتا ہوں۔ جانتا ہوں تم کتنی محبت کرتی ہو مجھ سے۔ مگر قدر سوچو اگر ہر بیوی کے جذبات و احساسات ایسے ہی خود غرضانہ ہو جائیں تو یہ کام کون سنبھالے گا؟ کون آگے آئے گا، کسی کو تو یہ فریضہ انجام دینا ہے ناں......؟''

''وہ کوئی بھی اور ہو سکتا ہے۔ آپ ہی کیوں؟'' اس کے پاس جیسے جواب پہلے سے موجود تھا۔ عبدالعلی لاجواب نہیں ہوا صدمے کی کیفیت میں آ گیا۔ کچھ دیر ساکن نظروں سے اسے تکتا رہا پھر سیدھا ہو کر بیٹھا تو ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہو رہا تھا۔

''کوشش کریں کہ آپ کا اخلاق اتنا بہترین ہو جائے کہ اسے دیکھ کر آپ کے دشمن بھی آپ کے دوست بن جائیں، کوشش کریں آپ مسکراہٹوں کے سبب بنیں۔ آنسوؤں کے نہیں اور قدر...... کسی کے دل میں جگہ پانے کے لیے

محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ قربانی کی ضرورت پڑتی ہے اک بات اور ...... مشکل ترین کام بہترین لوگوں کے حصے میں آتے ہیں۔ کیونکہ وہ اسے حل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔''

وہ خاموش ہوگیا۔ گویا اس کے جواب کا منتظر، مگر وہ اس کی تائید کر کے گویا اسے اپنی رضا مندی نہیں دینا چاہتی تھی۔ جبھی بے اعتنائی سے اٹھ گئی۔ عبدالعلی نے بھی مزید اصرار نہیں کیا۔ یہ بات طے تھی وہ اسے اس معاملے میں ڈھیل دینے کا قائل نہیں تھا۔ مگر اگلی صبح اس وقت وہ اپنی جگہ پر ٹھٹک کر تھم گیا تھا۔ جب اس نے قدر کو لاریب کے روبرو اسی معاملے پر شکوہ کناں پایا تھا۔

''آپ کے بیٹے کو نہ میری پروا ہے نہ ہی مجھ سے محبت۔'' وہ گہرا سانس بھر کے رہ گیا۔ وہ جانتا تھا وہ اسے دیکھ چکی ہے۔ گویا لاریب کو نہیں اسے ہی سنایا تھا۔ اس سے قبل کہ لاریب کچھ کہتیں وہ خود مداخلت کر گیا تھا۔ مگر ان ڈائریکٹ ہی......

''اس بات کو مانیں گی ناں اماں آپ کہ...... سمندر سب کے لیے ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔ مگر کچھ اس سے موتی تلاش کرتے ہیں کچھ مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ اور کچھ کو سمندر سے کھارے پانی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ بادل سے برسنے والا پانی بھی ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔ زرخیز زمین اسی پانی سے سبزہ اُگاتی ہے۔ صحرا کی ریت اس سے اپنی پیاس بجھا لیتی ہے اور چکنے پتھروں کو وہی پانی محض چھو کر گزر جاتا ہے یہی حال انسان کا ہے۔ ذمہ داریاں اور فرائض کے ساتھ کچھ آزمائشیں اور مشقتیں رب نے ہر انسان کے لیے مختص کی ہیں۔ اب یہ انسان کا ظرف ہے کہ وہ کس حد تک سرخرو ہوتا ہے اور کس حد تک ناکام۔''

قدر کو اس کا لہجہ اس کا انداز صاف صاف طنزیہ لگا تھا۔ جبھی آنکھیں جل جل اٹھیں۔ چہرے پر غبار سا پھیل گیا۔

''ہاں ہوں میں کم ظرف، بہت تھوڑے دل کی مالک ہوں۔'' وہ واقعی ہی رو پڑی۔ عبدالعلی کچھ دیر اسے سپاٹ نظروں سے دیکھتا رہا پھر بغیر کسی تاثیر کے پلٹ کے گھر سے چلا گیا تھا۔ قدر کو گہرا شاک لگا۔

''دیکھا آپ نے؟ مل گیا نا ثبوت ان کے کٹھور پن کا۔'' وہ دُکھ سے بولی۔ لاریب نے اٹھ کر اس کے زور زور سے لرزتے وجود کو بازوؤں کے حصار میں بھر کر نرمی سے شفقت سے تھپکا۔ آنسو پونچھتی رہیں۔

''مرد کو گھر میں قید کر کے نہیں رکھا جاسکتا ہے بیٹے! نہ زبردستی اپنی مرضی کے تابع وفرمان ہی بنایا جاسکتا ہے۔ وہ آزاد پنچھی ہے۔ اسے اس کی مرضی کی اڑان دے دو۔ اللہ کی سپرد کر دو۔ اگر ایسا نہیں کرو گی تو بے زار ہوجائے گا۔ رسی تڑوائے گا۔ اور تم اسے باندھ نہیں سکو گی۔'' وہ کچھ نہیں بولی، بس روتی رہی، شکوے مچل رہے تھے دل میں۔

''مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا۔ وہ شادی کے بعد بھی میرے ساتھ ایسا کر سکتے ہیں۔ یہی سچ ہے، انہیں مجھ سے کبھی محبت ہی نہیں تھی۔'' اس کے رونے میں شدت آنے لگی۔ لاریب آہستگی سے مسکرا دیں۔

''بیٹے...... میری جان! مرد عورت سے ہر وقت محبت نہیں کر سکتا۔ وقفے وقفے سے...... اپنی فرصت کے مطابق اپنی مرضی کے تحت...... وہ عورت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ سو اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دو۔ خود کو اس پر مسلط نہ کرو۔'' قدر نے دکھ بھری رنج آلود نظروں سمیت انہیں دیکھا

اور اُٹھ کر بیٹھ گئی۔
"نہیں چھوڑ سکتی، انہیں بھی مجھے سمجھنا چاہیے۔ میں اتنا انہیں چاہتی ہوں کہ ہر پل ان کی توجہ کی طالب ہوں ہر وقت ان کی محبت کی تمنا رکھتی ہوں۔ انہیں بھی سمجھنا چاہیے۔ عورت ایسی بیل ہے۔ جو محبت کی نمو کے بغیر مرجھانے میں دیر نہیں لگاتی۔ میں مرجاؤں گی اس طویل جدائی سے ممانی جان!" وہ سسکے گئی تھی۔ لاریب کیا کہتیں۔ بس نرمی سے اس کا سر تھپکتی رہیں۔

☆......☆......☆

اس نے گہرا سانس بھرا اور بالوں میں انگلیاں اُلجھا دیں۔ کوئی کب تک خود سے فرار حاصل کرلے۔ جبکہ علم و معرفت کے دروازے ذہن و دل پر وا ہو رہے تھے۔ کیا خوب کہا تھا کسی نے کہ...... "دنیا اگر ہاتھ سے نکل جائے تو بندہ غریب ہو جاتا ہے۔ اور اگر یہی دنیا دل سے نکل جائے تو بندہ فقیر ہو جاتا ہے۔" اسے بھی لگ رہا تھا وہ دل کا فقیر ہو گیا ہے۔ عبدالغنی نے کہا تھا۔
"زندگی میں سکون کا راز یہ ہے کہ آپ کے پاس ایسی باتیں اور چیزیں کم سے کم ہوں جن کی حفاظت ضروری ہو جن کے چوری کا خدشہ لاحق ہو۔ یا جنہیں راز رکھنا ضروری ہو۔ اس نے خود کو بے نیاز کرلیا۔ عبدالغنی نے یہ بھی کہا تھا۔
"فکر کے سمندر میں غوطہ کھانے والے گوہر مراد نکالنے والے لوگ محسنین کہلاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی فکر ہی ان کا عمل ہے۔" قرآن بھی تو غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔ اس نے گہرا سانس بھرا اور پھر سے اک جذب کی کیفیت میں پڑھنے لگا۔
جن دنوں وہ اضطراب اور وحشتوں کا شکار تھا۔ عبدالغنی اور عبدالہادی کو جیسے اس کی برین واشنگ کے اور کوئی کام ہی نہیں رہ گیا تھا۔ دونوں میں سے کوئی ایک ہر وقت اس کے ہمراہ ہوا کرتے۔ وہ ان کے لیے قیمتی تھا یا ان کے رب کے لیے......؟ ان دنوں ارسل یہ اہم نقطہ سمجھ نہیں پایا تھا۔ جبکہ وہ دونوں مہربان مشفق اشخاص ضرور اس پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کیا کرتے وہ...... یعنی ارسل احمد ان کے رب کو بہت عزیز ہے۔ ان کا رب کسی بھی گھڑی ارسل احمد سے غافل نہیں۔ اُسے اپنے اس بندے کی بہت پروا ہے۔ مگر اس روز اسے سمجھانے کا عبدالہادی کا انداز تھوڑا مختلف تھا۔
"یہ بات بہت ضروری ہے سمجھنا ارسل بیٹے کہ مقدر سب کو ایک طرز پر نہیں برتا کرتا۔ کسی کو وہ ہتھیلی پر بٹھا کر سفر کی منازل طے کرا دیتا ہے۔ اور کچھ کو اپنے قدموں تلے روندتا ہوا بے دردی سے گھسیٹتا ہے۔ میرے بیٹے...... اگر ہمیں اپنے خالق سے محبت ہے تو حالات جیسے بھی ہیں۔ ہمت حوصلہ صبر استقامت کا ہاتھ سے دامن نہیں چھوٹنے دو گے تو ناکام بھی نہیں ہو گے۔ اللہ کی رضا کو مقدم رکھتے ہوئے راضی بار ضا رہنا ہی کامیابی کی دلیل ہے۔" وہ جیسے ماضی میں کہیں کھو گئے تھے۔ جبھی کچھ توقف سے گویا ہوئے تو ان کا لہجہ ان کی آواز کھوئی کھوئی محسوس ہونے لگی تھی ارسل کو" اس راستے پر آ کر تو دیکھو اک بار، کیسا لطف ہے۔ کیسا سرور ہے۔
ہم جتنے بھی سرکش اور طاقتور ہو جائیں۔ لیکن ہر شام زندگی کا ہماری ایک دم کم ہو جاتا ہے۔ اور ہم اسے روک نہیں سکتے۔ لیکن ہمارا رب ہمیں ہر روز نئی صبح دے کر پھر مہلت دے دیتا ہے کہ ہم توبہ کریں تو وہ ہمیں بخش دے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے۔ جیسے جیسے لوگ تعلیم یافتہ ہوتے جا رہے ہیں۔ تنزلی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس مقام پر

ہمیں بہت ساری اصلاحات کی ضرورت ہے۔ جن میں سرفہرست اخلاق کی درستی ہے۔ گفتگو میں نرمی اختیار کرنے کی اشد ضرورت ہے کہ اس میں شک نہیں لہجے کا اثر الفاظ سے زیادہ ہوتا ہے۔"

"اور یہ بھی کہ..... فکر کے درخت کو صبر کا پانی دیتے رہنا چاہیے۔ تاکہ آنے والی نسلیں خوشحال زندگی بسر کرسکیں۔" وہ اچانک مگر بہت رسان سے گفتگو میں شریک ہوا تھا۔ عبدالہادی جتنا چونکے..... اس سے کہیں زیادہ خوشگواریت میں مبتلا ہوئے تھے۔ ان کے چہرے پر انوکھا جوش و خروش ابھر آیا تھا۔ ان کی خوشی دیکھنے والی تھی گویا۔ شاید جبھی وہ کتنی دیر تلک کچھ کہنے کے قابل نہ ہوسکے۔ اگلے لمحے وہ اٹھے تھے۔ اور قبلہ رخ سجدے میں جا گرے۔ ارسل ساکن ناقابل بیاں قسم کے تاثرات سمیت انہیں سجدہ ریز دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ ان کے طویل تر سجدے نے اسے خائف کرنا شروع کردیا تھا۔ اتنا خائف کہ وہ گھبرا کر بے ساختہ انہیں پکارتا چلا گیا۔ عبدالہادی اس کے اضطراب پر ہی متحیر ہوتے سیدھے ہوئے تھے مگر اس طرح کہ ان کا چہرہ آنسوؤں سے تربتر تھا۔ ارسل احمد کی حیرت و استعجاب پر رعب حسن چھا گیا۔ اس نے اس لمحے جانا تھا۔ اس نے آج سے قبل اتنا حسین چہرہ نہیں دیکھا تھا جتنا اس وقت عبدالہادی کا نظر آرہا تھا۔ وہ عمر کے جس حصے میں تھے۔ وہاں حسین سے حسین انسان کا حسن بھی ڈھل جاتا ہے۔ مگر وہ اس عمر میں مزید باوقار اور پُرکشش محسوس ہوتے تھے۔ ماہتاب کی مانند تابناک چہرہ نگاہوں کو خیرہ کرنے کا باعث بنتا تھا۔ شاید یہ حسن نہیں تھا۔ یہ ان کے دل کا نور تھا۔ جو اللہ نے ان کو عطا فرمایا تھا۔

"کیا ہوا بیٹے.....!" عبدالہادی اس کی کیفیت سے بے خبر ہنوز متحیر سوال کررہے تھے۔ وہ اب بے اختیار نظریں چراتا خفت سے بھرنے لگا۔

"ک..... کچھ نہیں۔ آپ سجدے میں کیوں گرے.....؟ آپ رو رہے تھے۔ میرا پریشان ہونا فطری تھا۔" وہ جھجک کر سہی مگر کہہ گیا تھا۔ عبدالہادی خفیف سا مسکرا دیے۔

"ہر اس مقام پر سجدہ ہم پر لازم ہے بیٹے! جب اللہ اپنی عنایات کا رحمتوں کا ہم پر نزول فرمائے جس میں رب کا شکر ادا کررہا تھا۔"

ان کا اشارہ اس کی نارملٹی کی جانب تھا۔ وہ اُلجھا البتہ سوال نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود عبدالہادی نے اس کی اُلجھن کو پاکر بہت نرمی سے جواب دیا تھا۔

"محض نماز، روزہ، حج، زکوۃ سے کام نہیں بنتا۔ یہ بنیادی فرائض میں شامل ہیں۔ اصل بات آگے ہے۔ وہ ہے خود کو پہچاننا..... پھر اپنے رب کی خوشنودی تک رسائی حاصل کرنا۔ اور اس مقصد تک پہنچنے کے لیے ہمیں حضور اقدس کا راستہ اور قرآن حکیم کی رہنمائی درکار ہوتی ہے۔ میں چاہتا ہوں تم قرآن پاک کو باترجمہ پڑھو۔ احادیث کا مطالعہ کرو۔"

انہوں نے بہت نرمی سے اپنی خواہش اس کے سامنے رکھ دی۔ ارسل خاموش رہا۔ پھر آہستگی سے سر کو اثبات میں جنبش دے دی تھی۔

"آپ مجھے پڑھایئے گا۔ میں ضرور پڑھوں گا۔" عبدالہادی کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ گویا ہفت اقلیم سے نوازے گئے ہوں۔ انہوں نے اس کا شانہ تھپکا اور مسکرانے لگے۔

☆......☆......☆

بے بسی کے شدید احساس نے حلق میں پھندے اور آنکھوں میں نمی کی چادر تان رکھی

تھی۔ وہ دن بھر کتنی بار چھپ کے بھی روئی اور اس کے سامنے بھی۔ خوامخواہ ہی عبدالاحد سے بھی فضول میں جھگڑا کرلیا۔ اسے کتنی سنا بھی دیں۔ اور خود ہی رونے بھی بیٹھ گئی۔ وہ بیچارہ بوکھلاتا وضاحتیں دیتا رہ گیا۔ عبدالعلی کی آواز دور سے ہی کان میں پڑی تو آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ یہ آنسو اس کے سامنے بہانے کے لیے بچائے تھے مگر ابھی نہیں عبیرو لاریب اس کی حالت دیکھتیں تھیں سمجھتی تھیں۔ مگر کچھ کرنے سے قاصر تھیں۔ وہ بھی تو سمجھتی نہیں تھی۔ اتنا سمجھاتے سمجھاتے آخر عبدالعلی کی روانگی کا وقت آن پہنچا تھا۔ کل علی الصبح اس کی روانگی تھی۔ لاریب اس کی کیفیت سمجھتی تھیں جبھی عبدالعلی کو ساتھ کھانے سے منع کر دیا اور قدر کو کھانا کمرے میں لے جانے پر اصرار کرنے لگیں۔ ظاہری بات ہے ان کی خواہش دونوں کو زیادہ سے زیادہ وقت تنہائی میسر کرنے کی تھی۔ اور یہ بھی کہ قدر کا موڈ بحال ہو جائے۔ وہ عبدالعلی سے خفا نہ رہے۔ عبدالعلی اسے منالے۔ وہ کھانے کی ٹرے سمیت اندر آئی تو عبدالعلی سیل فون ہاتھ سے رکھتا پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ گو کہ خفا تھی۔ مگر پھر بھی جیسے اس کے لیے ہی ساری تیاری...... وہ اس کے پسندیدہ گلابی رنگ میں ملبوس تھی۔ اور خود بھی گلابی گلابی لگ رہی تھی۔ شادی سے پہلے کی دی بالوں پر توجہ نے اس کے بالوں کو بہت تیزی سے لمبا کیا تھا۔ جواب کمر تک آتے تھے۔ بے حد گھنے گیلے بال جنہیں کچھ دیر قبل اس نے نہا کر سلجھانے کے بعد ایسے ہی سوکھنے کو چھوڑ دیا تھا۔ اور بہت دلکشی سمیٹے ہوئے تھی۔ اس کے ہونٹوں پر کوئی سنگھار نہیں تھا۔ لباس بھی قدرے سادہ تھا۔ اس کے باوجود اس کا سراپا جگمگاتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

''یہ کھانا تناول فرمالیں۔''

اس نے ٹرے اس کے سامنے بیڈ پر رکھی اور بے رخی سے مخاطب کیا۔ عبدالعلی جو گہرائی سے جائزہ لے رہا تھا۔ مسکراہٹ ضبط کرتا اس سے قبل کہ وہ فاصلے پر ہٹتی اس کا ہاتھ تھام گیا تھا۔

''آجاؤ تم بھی......'' وہ انکار کرتے کرتے بھی ساتھ بیٹھ گئی۔ ٹائم کتنا کم تھا۔ اور تیزی سے بہتا جاتا تھا۔ اس ستم گر کو کہاں پروا تھی بھلا۔ اس کا دل پھر بھرنے لگا۔ مگر ناراضگی کا تاثر دینے کو فاصلہ برقرار رکھا۔ خوشبوؤں میں بسا سراپا شیمپو باتھ سوپ اور پرفیوم کی دلفریب مائل کرتی خوشبو کے علاوہ اس کے وجود کی قدرتی متاثر کن مہک...... عبدالعلی نے ہر چیز کو مسکرا کر محسوس کیا تھا اس کی ناراضگی کو خاص کر۔

''ہم......'' اس نے کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو کو محسوس کرتے گویا چٹخارہ لیا۔ اور کف موڑتا دانستہ پھیل کر بیٹھا۔ اس طرح کہ اس کے کندھے سے کندھا اور گھٹنے سے گھٹنا ٹکرا گیا۔ قدر نے خفگی بھری نظروں سے اس کا چہرہ دیکھا اور دور سرک گئی۔ عبدالعلی کی آنکھوں میں شوخی شرارت اور سب کچھ جان لینے کا دعویٰ صاف صاف نظر آنے لگا۔ اس کی جان جل کر خاک ہوئی۔ دل چاہا سب چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جائے۔ اگر عبدالعلی کو پروا نہیں تو وہ بھی اس کی شکل نہ دیکھے بھی...... مگر اس دشمنِ جاں نے کہیں جوگا چھوڑا ہی کہاں تھا۔ غم اور محبت سے دل لبریز کر رہا تھا اس کا...... اس کا دل چاہا پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ چیخ چیخ کر لڑے یا پھر اس کے پاؤں پڑ جائے کہ ایسا ظلم نہ کرو۔ مگر جانتی بھی تھی۔ اس سب کا فائدہ نہیں۔ وہ اگر کٹھور ہے تو بات کا پکا بھی...... جو طے کرلیا۔ سو کرلیا۔ جبھی ہونٹ کچلتی پلکیں جھپک جھپک کر

انسو ضبط کرتی خدمت میں مصروف رہی۔ اس کے لیے پلیٹ میں چاول نکالے۔ کبابوں کی ڈش سامنے رکھی۔ رائتہ پیش کیا۔ سلاد آگے رکھا۔ پانی کا گلاس بہ صد احترام تھمایا۔ انداز انتہائی فرماں برداری کا تھا۔ مگر نروٹھا پن سب پر حاوی...... اسے سب پیش کر کے بھی وہ خود ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی تھی۔

''تم تو کھاؤ۔'' عبدالعلی نے نرمی سے ٹوکا۔ قدر نے اسے دیکھے بنا پانی کا گلاس چڑھا کر جیسے صبر کا گھونٹ پیا۔ گویا گرم توے پر گلاس انڈیلا...... مگر اس وقت دھک سے رہ گئی۔ جب عبدالعلی نے گلاس لے کر اس کے منہ کی جانب نوالہ بڑھایا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر بڑی غصیلی نظروں سے اسے دیکھنا چاہا مگر دیکھ نہیں سکی۔ عبدالعلی کی نظروں کی والہانہ لپک میں ایسی ہی طاقت تھی کہ اس کی پلکیں بے اختیار لرز کر جھک گئیں۔

ضبط، برداشت حوصلہ سب خاک ہوا تھا۔ وہ ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپے زار و قطار رو رہی تھی۔ عبدالعلی نے گہرا متاسفانہ سانس بھرا اور ٹرے پرے سرکا کر اسے بہت نرمی و حلاوت بھرے انداز میں تھامتے خود سے قریب کر گیا۔

''تمہیں پتا بھی ہے قدر! میں تمہیں روتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔'' کتنی محبت سے وہ آنسو پونچھ رہا تھا۔

''جھوٹ مت بولیں۔'' وہ چیخی۔ پھر بے حد شاکی ہوتے اسے دھکیل کر پرے ہونا چاہا مگر عبدالعلی نے دانستہ گرفت مضبوط کی کہ وہ محض مزاحمت کر سکی آزاد ہونے کو۔

''یہ سچ ہے کہ آپ نے ہمیشہ مجھے رُلایا اور بڑے مطمئن رہے ہیں۔ اب بھی مطمئن ہی ہیں۔'' وہ بے حد غصے میں تھی۔ صدمے میں تھی۔ جبھی بدگمانی کی انتہا کرنے لگی۔ عبدالعلی نے سرد آہ بھری۔

''ایسا نہیں ہے۔ میرا مقصد تمہیں دانستہ رُلانا نہیں ہے۔ تم یقین کرو۔ میں تمہیں نہیں دیکھنا چاہتا روتے ہوئے۔''

''تو مت دیکھیں، جائیں باہر۔'' وہ اتنی ہی بدلحاظ ہو رہی تھی۔ تڑخ گئی۔ عبدالعلی نے مسکراہٹ دبائی۔

''اِدھر دیکھو قدر! میری طرف......!'' اس نے زبردستی اس کا چہرہ اپنی جانب پھیرا۔

''ارے...... چچ...... چچ...... اتنے سارے آنسو۔''

''آپ بے مطلب؟ آپ کے لیے بھلا ان کی کیا اہمیت......'' وہ پھر سسکنے لگی آواز رقت آمیز بھی تھی، بوجھل بھی...... قدر نے اس کی بات مکمل سنے بغیر ہی اس کا ہاتھ اپنے چہرے سے جھٹک دیا۔

''کیوں جھوٹ پہ جھوٹ فرما رہے ہیں...... گناہگار ہو جائیں گے۔ مت کریں میری پرواہ۔'' اس نے تلخی سے کہا تھا۔ اتنی ہی غصیلی ہو رہی تھی وہ، عبدالعلی اسے دیکھتا رہا۔

''میں پاگل ہوں۔ غلط فہمیوں کا شکار...... پتھر سے سر پھوڑ رہی ہوں۔ مشین سے جذبات کا تقاضا کر رہی ہوں۔ بلکہ بے غیرت کہیے...... اپنے منہ سے کہتی ہوں کہ میں...... آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ مجھے ہر پل آپ کے ساتھ آپ کے سامنے رہنا ہے۔'' وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ اسے بھی اپنی نسوانی انا بہت عزیز تھی۔ مگر وقت ہی ایسا آ پڑا تھا وہ کیا کرتی۔ پھر سامنے کوئی غیر نہیں تھا۔ شوہر تھا، محبوب تھا، محرم و ہمراز...... مگر وہ جب

اس کے روم روم سے جھلکتے محبت کے جذبوں کو نظر انداز کر رہا تھا تو پھر بھی اسے تکلیف نہ ہوتی؟ اس کا دل چاہا اپنا سر پھاڑ لے۔

"بلاوجہ کا رونا ہے قدر! تم جانتے بوجھتے مجھے اذیت دیتی ہو اور خود کو......" عبدالعلی جواب عاجز نظر آ رہا تھا کسی حد تک جھنجلانے لگا۔ قدر کو اسی حد تک دھچکا لگا۔

"کون سی اذیت......؟ آپ کو معلوم بھی ہے اذیت کیا ہوتی ہے علی صاحب!" وہ حلق کے بل چیخی اور بھی شدتوں سے رونے لگی۔

"میں جاتے سمے کچھ کری ایٹ نہیں کرنا چاہتا، ورنہ پھر......" عبدالعلی کے جبڑے سختی سے بھینچے ہوئے تھے۔ اس کا موڈ پوری طرح خراب ہو چکا تھا۔

"ایک بات طے شدہ ہے تو پھر......؟" وہ خود بھی چیخا اور اُٹھ کر واش روم میں بند ہو گیا۔ دروازہ اتنی زور سے مارا کہ وہ کتنی دیر تک ہلتا رہ گیا۔ قدر اس کے اس درجے غصیلے انداز پر صرف سہمی نہیں، ساکت سی وہیں بیٹھی رہ گئی۔ عبدالعلی کی ناراضگی کا احساس بہت جان لیوا تھا۔ وہ جیسے ہر لمحہ موم بن کر پگھلنے لگی۔ اسے وہ کیسے بتاتی وہ اسے کتنا چاہتی ہے۔ لمحہ بھر کی جدائی جاں پہ بنا دیتی ہے۔ پھر اب کیسے اتنی دور بھیج دے۔ وہ بھی محاذ پر...... جہاں ہر پل موت سروں پر منڈلاتی ہے۔ اس کا تو ہر لمحہ دل ڈوبتا جاتا تھا یہ سوچ کر ہی

......

کتنا اچھا تھا وہ وقت جب وہ اسے کچھ سمجھتی نہ تھی۔ زندگی کتنی آسان تھی۔ مگر پھر وہ اس کی زندگی میں، دل میں زبردستی گھستا آیا۔ ہر شے پہ مالک و حکمران کی سی حیثیت سے...... اس نے اس بے حد وجیہہ عبدالعلی کو پہلی بار دیکھا تھا جس کے شانے چوڑے انداز بے حد منفرد تھا۔ دراز قد بے حد وجیہہ، سچی بات تو یہ ہے کہ وہ پہلی بار میں ہی اس کے سامنے ہار گئی تھی۔ وہ کتنے فاصلے پر بیٹھا تھا علیزے کے ساتھ اور تھوڑی دیر بعد اجازت طلب کرتا تھا۔ جو علیزے دیتی نہ تھیں۔ قدر نے کن انکھیوں سے کئی بار اسے دیکھا تھا۔ وہ اسے اک بار بھی اپنی جانب متوجہ نہ لگا۔ جبکہ وہ پورے کا پورا اس کا تھا۔ پھر بھی کتنا بیگانہ لگتا تھا۔ اس کا دل دھک دھک کیے جاتا تھا۔ یہ اتنا خوبصورت لمبا شاندار لڑکا جسے دل پر حکومت کرنے کو ذرا سی بھی محنت کی ضرورت نہ تھی۔ بس اک نظر ڈالنا کافی تھی اور سب اس کا ہو جاتا تھا۔ بنا مانگے بنا روئے تڑپے اسے مل گیا تھا۔ تو وہ اس کی حفاظت میں بھی دل و جان لٹا دینا چاہتی تھی۔

مگر وہ اس کی تمام تر کوششوں کے باوجود ہاتھوں سے سرکتا جا رہا تھا اور وہ کچھ بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ یونہی پڑی روتی رہی۔ تڑپتی رہی، یہاں تک کہ عبدالعلی نے پھر آ کر اسے خود سے پکارا۔

"قدر......!" وہ جیسے مقناطیسی کشش کے زیر اثر ہی تھی۔ کچھ کہے بغیر درمیانی فاصلہ گھٹایا اور اس کے سینے پر سر رکھ دیا۔ اب کی بار کوئی شکوہ بھی نہیں تھا۔ مگر آنسو بہہ رہے تھے۔ عبدالعلی بھی جیسے ہار سا گیا۔

"تمہیں خود کو بہادر بنانا ہے قدر! خدا پر بھروسہ قائم رکھو۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے تمہارا ایمان اس بات پر محکم ہونا چاہیے کہ موت کا اک دن متعین ہے۔ ذرا سوچو...... اگر تم مجھے وہاں نہ جانے دو۔ اپنے پاس رکھو...... تو میری آنے والی موت کو روک سکو گی؟"

قدر کو جیسے دھچکا لگا۔ اس نے بے اختیار اپنا نازک موی ہاتھ اس کے منہ پر رکھا تھا۔ عبدالعلی

نے اس کی آنکھوں میں مچلی نمی دیکھی تھی مگر رُکا نہیں۔

''یہ بھی سوچو قدر! اگر ہر محافظ سے وابستہ رشتے اتنے کم حوصلہ اور تھوڑے دل کے مالک ہوجائیں۔ صرف اپنا سوچیں تو سرحدوں کا کیا بنے گا۔ اللہ کے اس حکم کی تعمیل کیسے ہوگی۔ جو جہاد کے متعلق صادر کیا گیا بہت رسان اور نرمی سے وہ اس کے سامنے اک اک سوال جو اپنی جگہ بہت اہمیت رکھتا تھا۔ رکھ رہا تھا۔ قدر کچھ نہیں بولی۔ سوں سوں کرتی آنسو بہاتی رہی۔ عبدالعلی نے پھر اس کے آنسو صاف کیے اور چہرہ ہاتھوں میں تھام لیا۔

''قدر......!'' اس نے جیسے اس کی توجہ چاہی۔ قدر نے بھیگی نمناک پلکیں اٹھائی اور زخمی نظروں سے اسے دیکھا۔

''محبت پر استوار رشتے بہت مضبوط بھی ہوتے ہیں اور بہت نازک بھی...... کبھی کبھی تو یہ بڑے بڑے طوفانوں سے بھی ٹکرا جاتے ہیں اور انہیں خاطر میں نہیں لاتے۔ اور کبھی ذرا سی ٹھیس ان کی شکستگی کا باعث بن جاتی ہے۔ کشادہ دلی اور اعتماد کا متقاضی شاید ہی کوئی اور رشتہ ہوتا ہو...... تمہاری شدید وابستگی اور جنون بالکل اماں جیسا تھا۔ وہ اتنا ہی چاہتی تھیں بابا جان کو...... اس قدر پوزیسو تھیں۔ اور ہرگز برداشت نہ کرسکی تھیں۔ جب بابا جان نے امی جان سے نکاح کیا۔ گو کہ یہ سارا معاملہ نیکی نیک نیتی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کے باوجود میں اماں کی اذیتوں کا اتنی چھوٹی عمر میں گواہ بن گیا تھا۔ پھر جب تم میری زندگی میں آئیں...... اور میں نے تمہاری ویسی ہی شدت کو نوٹس کیا قدر تو اک عہد میں نے خود سے کیا تھا۔ کیسی ہی مجبوری کیوں نہ ہو...... میں تمہیں کبھی ایسے دکھ سے ہمکنار نہیں کروں گا اور......''

''اس دکھ سے نہ سہی، آپ مجھے اس دکھ سے تو ہمکنار کرچکے ہیں عبدالعلی!'' وہ ٹوک گئی۔ اس کی سوئی جیسے وہیں اٹکی تھی۔ وہ اس کے بازو سے سر ٹیکے ذرا سا اوپر ہوئی اور چہرہ اُٹھا کر اسے دیکھا جو یکلخت خاموش سا ہوچکا تھا۔

''اگر میں کسی عالم دین سے فتویٰ لوں کہ میں اپنے شوہر کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں تو......''

عبدالعلی نے اس کے سر کے نیچے سے اپنا بازو کھینچ لیا۔ وہ اس کے سینے سے ٹکرائی تھی۔ عبدالعلی نے اسے بہت جارحانہ انداز میں اپنے بازوؤں میں کس کر اپنے مقابل کرلیا۔ قدر ذرا سا ڈر گئی۔ اس کے اندر شوریدہ سی لہریں اٹھنے لگیں۔ غصے کی بھی خوف کی بھی، وہ اسے بتانا چاہتی تھی۔ اس کے لیے اس کی محبت طوفانی انداز رکھتی ہے۔ مگر وہ کچھ نہیں کہہ سکی۔ وہ بس ان لمحوں کو منجمد کردینا، تھام لینا روک لینا چاہتی تھی۔ اور یہی اس کے بس میں نہیں تھا۔

''میں بھی یہی کہہ رہا ہوں قدر! کہ محبت کے تیور نرالے ہوتے ہیں۔ یہ کبھی صحرا میں گل کھلاتی ہے اور کبھی کسی کا ہرا بھرا دل بھی اجاڑ دیتی ہے۔ تم میرا دل اجاڑنے کا باعث نہ بنو۔ میرا پروفیشن میرا عشق ہے۔ مجھے اس سے الگ کروگی تو......''

وہ یکلخت خاموش ہوا کچھ دیر تک گہرے سانس بھرتا رہا پھر اسے عجیب بے بس نظروں سے دیکھا۔

''قدر......! انسان کی خواہشیں جب تک اس کے وجود اس کے عمر سے لمبی رہتی ہیں یہ اس وقت تک انسان ہی رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں، تم اللہ کے لیے کچھ کرو۔ اپنی خواہشوں کو...... اپنے وجود اور اپنی عمر سے چھوٹا کرو۔ تم خوشی بھی پاؤ گی

اور سکون بھی اور جب انسان خوشی اور سکون کا یہ لطف چکھ لیتا ہے تو وہ انسان سے بندہ بن جاتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں اللہ پاک خواہشات میں لتھڑے لوگوں کو انسان کہتا ہے۔ اور اپنی محبت میں ان کے خواہشوں سے آزاد لوگوں کو بندہ......!'' وہ کچھ دیر کو ایسے خاموش ہوگیا۔ گویا اس پر اپنی بات کا اثر دیکھنے کا خواہش مند ہو۔ پھر قدرے توقف سے گویا ہوا تھا تو انداز ہنوز ناصحانہ تھا۔

'' ہمارے وطن کو ہماری سرحدوں کو ایسے لوگوں کی تلاش ہے قدر! جن کے جذبوں کی سربلندی پر آسماں بھی ناز کرتا ہو اور ایسے لوگ وہی ہو سکتے ہیں۔ جو شام کے بعد بھی سورج بن سکتے ہیں۔ اس کی طرح روشن رہنا جانتے ہوں۔ اور دوسروں کے لیے قربانی کے جذبے سے سرشار ہوں۔ ایسے موقع کے لیے ہی کہا گیا ہے کہ......

بہتر ہے کہ نہ ڈالو ستاروں پر کمندیں

انساں کی خبر لو کہ وہ دم توڑ رہا ہے

قدر اب بھی کچھ نہیں بولی۔ البتہ آنسوؤں میں روانی آ گئی تھی۔ عبدالعلی نے سلسلہ کلام ترک نہیں کیا۔

'' مجھے دق مت کرو، تم مجھے مذہب کا حوالہ دے کر اگر زبردستی روک لو گی قدر! تو میں رُک جاؤں گا۔ میں اللہ کے مخالف نہیں چل سکتا۔ مجھے اللہ نے الحمدللہ اس کی توفیق عطا فرمائی ہے۔ مگر قدر! ایسا کر کے تم مجھے حاصل نہیں کرو گی، کھودو گی۔ میں اندر سے مرجاؤں گا دھیرے دھیرے...... میں نے کہا ناں...... مجھے اپنے پروفیشن سے عشق ہے۔'' قدر کے آنسو بے اختیار رُک گئے۔ اس نے اپنا سر اس کے سینے سے الگ کرلیا تھا۔

'' ٹھیک ہے، آپ چلے جائیں، میں نہیں روکوں گی آپ کو۔'' عبدالعلی نے اس کا ہاتھ پکڑا مگر وہ چھڑا کر بیڈ سے اتر گئی تھی۔ عبدالعلی نے ہونٹ بھینچ لیے۔

☆......☆......☆

ارسل کی آنکھیں بے اختیار بھیگنے لگیں۔ اس نے سرد آہ بھری اور ہونٹ بھینچ لیے۔ اسے اپنا آپ بے حد ہلکا بہت کم ظرف لگا۔ چند دن قبل عبدالہادی نے اس سے رخصت ہوتے ایک بہت خاص نصیحت کی تھی۔

'' زندگی میں انسان کو ایک عادت ضرور سیکھ لینی چاہیے میرے بیٹے! جو چیز ہاتھ سے نکل جائے اسے قبولنے کی عادت...... یہ عادت بہت سی تکلیفوں سے بچالیتی ہے۔''

وہ کیا کہتا محض سر ہلا کر سر جھکا کر رہ گیا تھا۔ انہوں نے اس یاسیت کو محسوس کیا۔ جبھی اس کے پاس بیٹھ گئے تھے۔

'' عشقِ مجاز بذاتِ خود ایک حقیقت ہے۔ اور یہ حقیقت اس وقت تک مجاز کہلاتی ہے جب تک رقیب ناگوار ہو۔ جس محبت میں رقیب قریب اور ہمسفر ہو وہ عشقِ حقیقی ہے۔ اپنا عشق اپنے محبوب تک ہی محدود رکھا جائے تو مجاز اور اگر اپنی محبت میں کائنات کو شریک کرنے کی خواہش ہو تو حقیقت ہے۔ رانجھے کا عشق مجاز ہوسکتا ہے مگر وارث شاہ کا عشق حقیقی ہے۔ عشقِ حقیقی عشق نور حقیقت ہے۔ یہ نور جہاں سے بھی عیاں ہوگا۔ عاشق کے لیے عشق محبوب ہوگا۔ عشق نبی ﷺ حقیقت ہے۔ نفع ہے، افادیت ہے، اس عشق کو اپنانے کی ضرورت ہے۔''

'' میں کیسے کروں یہ عشق......؟'' وہ حیران ہی تو رہ گیا تھا اس تقاضے پر، اور جواباً عبدالہادی

بہت نرمی سے مسکرانے لگے تھے۔
''کیا نہیں جاتا ہے، ہوا کرتا ہے۔ اللہ کی عطا ہے یہ اسے مانگنا پڑتا ہے۔ اگر یہ خود بخود دل کی سطح سے نہ پھوٹے تو...... اللہ سے مانگو۔ فلاح و کامیاب اس میں پوشیدہ ہے۔'' ارسل کی نظریں لاچاری کے احساس سے جھک گئیں۔ ایسے گویا بہت مشکل کام ذمہ آلگا ہو۔ جیسے کچھ نہ آتی ہو۔ کرے تو آخر کیے۔
''گریز کا مطلب وقت کا ضیاع ہے۔ جو ہرگز درست نہیں۔ میں تمہیں حدیث بتاؤں بیٹے! ایک وقت آئے گا۔ جب لوگ دعائیں مانگیں گے۔ اور دعائیں قبول نہ ہوں گی۔ اس کی وجہ...... کہ جب لوگوں کا یہ حال ہوگا کہ وہ برائی دیکھیں گے اور اسے بدلنے کی کوشش نہ کریں گے۔ اور ظالم کو ظلم کرتے پائیں گے اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں گے۔ اور قریب ہے کہ اللہ اپنے عذاب میں سب کو لے لے۔'' پس ایسا وقت آنے سے خوف کھاؤ۔ ہمیں اپنی اصلاح کرنی ہے بروقت۔ اپنا منصب اپنا کام سنبھالنا ہے پوری دیانتداری سے...... یعنی اچھائی کا حکم...... برائی سے منع کرنا ہے کہ حالات رخ بھی بہت نازک اختیار کر گئے ہیں۔ آج یہ صورت حال ہے کہ اسلام کے لیے جھنڈا اٹھانے والے تو بہت ہیں مگر ایسا کوئی نہیں ملے گا شاید کہ جو اسلام کے لیے اپنا جھنڈا نیچا کرلے۔ اسلام کے نام پر دوسروں سے نفرت کرنے والے تو بہت مل جائیں گے۔ مگر اسلام اور اللہ کے لیے خالصتاً اک دوسرے سے محبت کرنے والے شاید ہی مل سکیں۔ ہمیں نہیں بھولنا چاہیے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ...... شیطان کو گمراہ کرنے کے لیے کوئی دوسرا شیطان نہیں آیا تھا۔ بلکہ یہ نفس ہی تھا۔ جس نے اسے ابلیس بنا دیا۔''

ارسل جو پوری طرح ان کے الفاظ کی تاثیر میں کھویا ہوا تھا۔ چونک کر انہیں تکنے لگا۔ یہ اسی کی خواہش تھی کہ وہ عبدالہادی کے ہمراہ یہاں آ گیا تھا۔ گو کہ سارہ راضی نہیں تھیں۔ مگر ارسل نے انہیں قائل کرلیا تھا۔ شاید وہ ماحول بدلنا چاہتا تھا۔ یا پھر یہ سب راستے بھی اللہ ہی اس کے لیے کھول رہا تھا۔

بہرحال اس نے خود کو حالات کے سپرد کر ڈالا تھا۔
''آپ مجھے کوئی نصیحت کریں۔ اچھی سی...... تاکہ میرے اندر دائمی سکون اتر آئے۔'' وہ بے چین نظر آ رہا تھا۔ عبدالہادی نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔
''سکون تو بلاشک وشبہ اللہ کی یاد میں ہی پوشیدہ ہے۔ تم جتنا خود کو اس یاد میں مگن ومحو کرو گے۔ اسی قدر اس سکون کی دولت سے مالا مال ہوگے۔ نصیحت بس اتنی سی کروں گا بیٹے! کہ جب قرآنِ پاک پڑھو تو یوں سمجھو...... جیسے یہ اللہ نے بس تمہارے لیے ہی بھیجا ہے۔ اور اللہ پاک براہِ راست تمہارے ساتھ خطاب کر رہا ہے۔ اور تمہیں اپنی زبان سے احکامات صادر فرما رہا ہے۔ جب اس کیفیت اس یقین کے ساتھ قرآن پاک پڑھو گے کہ قرآن پاک کا مخاطب اللہ پاک ہے۔ تو پھر تمہیں اس کی لذت محسوس ہوگی۔ پھر اس کیفیت کے ساتھ جو لطف ملے گا۔ وہ کسی اور چیز میں نہیں مل سکتا۔''
وہ مسکرائے تھے۔ اور اس کا گال تھپکا تھا۔
ارسل اس دن سے اسی کوشش میں مصروف تھا۔ اور ہر گزرتا دن اسے روحانی لحاظ سے انوکھے کرشمات دکھلا رہا تھا۔ وہ سراپا آنسوؤں میں ڈھل

جاتا ہے جیسے......

"ترقی یا ارتقا ضروری ہے۔ مگر گہوارے سے نکل کر قبر تک...... کتنی ترقی چاہیے؟ اصل ترقی یہ ہے کہ زندگی بھی آسان ہو اور موت بھی مشکل نہ رہے۔"

عبدالغنی واعظ کر رہے تھے۔ یہ جمعۃ المبارک کا دن تھا۔ کچھ دیر میں خطبہ ہونے والا تھا۔ ارسل بھی نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد میں موجود تھا۔ مگر ذہن بار بار حاضر سے بھٹک جاتا تھا۔ اس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا تھا اور مسکرانے لگا۔ اسے پھر عبدالہادی یاد آئے۔ جنہوں نے اسے اک رات اضطراب کی انتہاؤں پر جاگتے پا کر اسے مخاطب کر کے اپنے انداز میں انوکھی تسلی سے نوازا تھا۔

"سمندر کی طرح صاحبان روح بھی نیم شب کو جاگتے ہیں۔ ہر مشکل وقت پر ان لوگوں کو آہ وفغاں نیم شب کا پیغام ملتا ہے۔ ایسے لوگوں کی بیداری ہی سونے والوں کے لیے مرہم کی طالب ہوتی ہے۔ جاگنے والے سونے والوں کے لیے دعا کرتے ہیں۔

"اے اللہ! اے ہمیشہ جاگنے والے اللہ! سونے والوں انسانوں پر رحم فرما! ان غافل انسانوں کو اپنے فضل سے محروم نہ کرنا۔ بیدار روح...... بیدار انساں قوم کی نجات کا ذریعہ ہیں۔" اور جواباً وہ حواس باختہ ہو گیا تھا۔ شرمندگی سے لبریز خفت زدہ......

"مم مگر...... میں اس قابل کہاں۔ میں تو خود غرض مفاد پرست انسان ہوں۔ نفس کا تابع...... میں کسی کے لیے نہیں اپنے دکھ کے لیے جاگ رہا ہوں۔ میں کسی کے لیے نہیں اپنے لیے رو رہا ہوں۔" جواباً عبدالہادی نے اسی محبت اسی رسانیت آمیز انداز میں اس کا کاندھا تھپکا تھا۔

"نم آنکھیں نرم دل کی غماز ہوا کرتی ہیں۔ دل ہمدرد ہے تو دوسروں کے غم پر بھی تڑپے گا اک دن کہ انسان کے جسم کا سب سے خوبصورت حصہ اس کا دل ہے، اگر یہ سیاہ ہو جائے تو پھر چمکتا چہرہ بھی کسی کام کا نہیں ہوتا۔ تم خوش بخت ہو کہ تمہارا دل تمہارے چہرے جیسا روشن ہے۔" ارسل گھبرا کر انہیں تکنے لگا۔ وہ کہاں ایسا تھا۔ عبدالہادی اسے پتا نہیں کیوں ایسا سمجھ رہے تھے۔ اور وہ جیسے اس کی کیفیت سمجھ کر ہی مسکرا کر کاندھا تھپکنے لگے تھے۔

"کوئی بھی کامل نہیں ہوتا۔ ہاں کوشش کرنی پڑتی ہے۔ تصفیہ اور تزکیہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ تم تصفیہ اور تزکیہ کے فرق کو سمجھتے ہو......؟" معاً انہوں نے خیال آنے پر اس سے سوال کر دیا تھا۔ ارسل نے اسی خفت سے سر نفی میں ہلا دیا۔ جو اس وقت وہ محسوس کر رہا تھا۔

"یہ دو الفاظ ہیں۔ دونوں تصوف میں استعمال ہوتے ہیں۔ تصفیہ ہمیشہ قلب کا ہوتا ہے۔ اور تزکیہ نفس کا یعنی تصفیہ دل کی صفائی کا کام نام ہے اور تزکیہ نفس کی صفائی کو کہا جاتا ہے۔ جس طرح کھولتے ہوئے پانی میں اپنا عکس نہیں دیکھا جا سکتا۔ اسی طرح انسان یہ جب تک آزمائش نہیں پڑتی تب تک وہ خود کو نہیں پہچان پاتا۔ آزمائش پرکھ کرتی ہے۔ آپ کی خرابی کی آپ کی اچھائی کی بھی۔ یہ آزمائش تو نبیوں کی بھی ہوئی اور بہت زیادہ بڑے پیمانے پر ہوئی۔ اسے سزا بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ اللہ سے جب زیادہ محبت اس کے بندوں کو دے دی جاتی ہے تو پھر سزا ضروری ہو جاتی ہے۔

(لفظ لفظ مہکتے اِس خوبصورت ناول کی اگلی قسط ماہِ جون میں ملاحظہ فرمایئے)

افسانہ

"میں جب پڑھ کر گاؤں واپس آیا تو آتے ہی چوہدری ملک نظام دین کی بیٹی دلشاد سے ملاقات ہوگئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہی دل ہار بیٹھے۔ دیکھنے والے کہتے تھے کہ میں بہت ہینڈسم تھا اور شہری کپڑوں میں شہزادہ لگتا تھا۔ لیکن تھا تو موچی کا بیٹا، ہماری محبت......

گاؤں شروع ہونے سے چند فرلانگ پہلے ہی 'جمال کرموں والے' کا آستانہ تھا۔ یہ خطاب اُسے گاؤں کے لوگوں نے دے رکھا تھا۔ ورنہ اُس کا نام صرف جمال دین تھا۔ اس وقت وہ بستر مرگ پر تھا۔ گاؤں کے حکیم نے بڑے یقین سے کہہ دیا تھا کہ 'کرموں والا' صرف دو چار دن کا مہمان ہے۔ گاؤں کے لوگ خصوصاً عورتیں روزانہ آستانے پر حاضری دیتیں آنسو بہاتیں۔ دعائیں کرتیں اور پھر واپس گھروں کو چلی جاتیں۔ لیکن 'اچھو' پیر کی پلنگ کی پٹی سے لگا رہتا۔ وہ جمال دین کا خاص ملازم تھا۔ بلکہ راز دار بھی تھا۔ ہر اچھے برے وقت اُس کے ساتھ رہا۔ کبھی کسی مشکل میں ساتھ نہ چھوڑا۔ یہی وجہ تھی کہ پیر کو اُس پر اندھا اعتماد تھا۔ صرف اُسی پر اعتبار تھا۔ اور آخری وقت میں جس طرح دل و جان سے وہ اُس کی خدمت کر رہا تھا اچھو نے اُس کا دل ہی جیت لیا تھا۔ پیر سے اُسے نوازنے کا پکا ارادہ کرلیا تھا۔ اس وقت بھی اچھو پلنگ کے قریب آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔

"سرکار پاؤں دبا دوں۔" اچھو نے اپنے تھکے ہاتھوں کی طرف دیکھا تو پیر ہنس دیا۔

"تُساں نوں کتنی بار آکھیا تھا جی کہ شادی کرلو۔" اگر آج کرماں والے نے شادی کی ہوتی تو کوئی گدی پہ بیٹھنے والا ہوتا...... میرا تو جی دل روندا اے سوچ کے...... میرے منہ میں سوا تے مٹی کہ تُساں دے بعد کون سنبھالے گا سارا کچھ۔"

"تم کیوں فکر کرتے ہو اچھو اللہ نے چاہا تو وہ یہاں گدی کا وارث لے آئے گا۔"

"پر کتھوں جی (کہاں سے جی) تسی ویاہ کردے تے شاید...... اچھو کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ جمال دین نے اُسے تسلی دی۔

"تسی اے راز آج دس ہی دیو کرماں والیو...... تسی ویاہ کیوں نہیں کیتا۔" جمال دین نے ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ اس وقت ساٹھ کے پیٹے

میں تھا۔

''اب تو میں مرنے والا ہوں اچھو...... تمہیں اپنی زندگی کی کہانی سنا ہی دوں۔'' وہ جیسے اپنے آپ سے بول رہا تھا۔ اچھو کے کان کھڑے ہوگئے۔ اُس نے اپنی پوری توجہ جمال دین کی طرف مرکوز کرلی۔ اور جلدی جلدی اُس کے پیر دباتے ہوئے بے صبری سے اُسے دیکھنے لگا۔

''میرا باپ گاؤں کا موچی تھا۔ میں اُس کا ایک ہی بیٹا تھا۔ میرے لیے اُس کے دل میں بڑے ارمان تھے۔ بڑے اونچے خواب تھے۔ اُس کی نظریں تو ہمیشہ بڑے لوگوں کے جوتوں میں اُلجھی رہیں۔ لیکن دماغ آسمانوں تک اڑان بھرنے لگا۔ اُس نے مجھے پڑھانے اور بڑا آدمی بنانے کے خواب دیکھے۔ خوب پڑھایا۔ شہر بھیج کر کالج میں بھی داخل کروایا۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ میں اگر آکسفورڈ سے بھی ڈگری لے آؤں تو گاؤں میں تو موچی کا بیٹا ہی کہلاؤں گا۔'' وہ کمزوری کی وجہ سے تھک کر سانس لینے کو رکا۔

''سرکار نے کتنا پڑھا ہے جی......؟'' اچھو شوق سے بولا۔

''ایم کیا ہے...... لیکن تو نہیں سمجھے گا...... جا پانی کا گلاس لا......'' پانی پی کر وہ دوبارہ شروع ہوگیا۔

''میں جب پڑھ کر گاؤں واپس آیا تو آتے ہی چوہدری ملک نظام دین کی بیٹی دلشاد سے ملاقات ہوگئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہی دل ہار بیٹھے۔ دیکھنے والے کہتے تھے کہ میں بہت ہینڈسم تھا اور شہری کپڑوں میں شہزادہ لگتا تھا۔ لیکن تھا تو موچی کا بیٹا...... ہماری محبت کسی کو ہضم نہیں ہوئی۔ چوہدری بھپر گیا۔ میرا باپ خوفزدہ ہوگیا۔ میرے آگے ہاتھ جوڑے۔ لیکن نہ تو میں باز آیا اور نہ ہی دلشاد مجھے چھوڑنے پر تیار تھی۔ دلشاد کے بارے میں کیا کہوں۔ وہ کلیوں کی طرح نازک اور خوبصورت تھی۔ بہاروں کی مانند

خوشبودار...... نزاکت تو اُس پر ختم تھی۔ جہاں قدم رکھتی پھول کھلتے تھے۔ ہنستی تو منہ سے موتیوں کی بارش ہوتی۔'' جمال دین کسی اور ہی زمانے میں پہنچ گیا۔ یہ سوچے بغیر کہ اچھو کو اُس کی کسی بات کی سمجھ آ رہی ہے یا نہیں......

''فیر کی ہویا جی......؟'' اچھو دم بخود تھا۔

''پھر وہی ہوا جو میرے جیسے خاندانوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ چوہدری نے میری خودسری کا بدلہ میرے پورے خاندان سے لیا۔

میرے باپ کو قتل کروادیا۔ ماں غم میں پاگل ہوگئی۔ اور باپ کا جنازہ اٹھنے سے پہلے ہی خود بھی دنیا چھوڑ گئی۔ چوہدری کے غنڈوں نے مار مار کر مجھے بے ہوش کر دیا پھر گاؤں سے دور کہیں پھینک آئے۔ دلشاد کی فوراً ہی اُس کے چچا زاد سے شادی کردی۔ میں اپنی ناکام تمناؤں کا جنازہ اپنے ہی کاندھوں پر اٹھائے چلتا رہا...... چلتا رہا...... اور عین اس جگہ بے ہوش ہوگیا۔ اُس وقت یہ جگہ کرامت علی شاہ کا آستانہ کہلاتا تھا۔ اُس کے چیلوں نے مجھے پکڑ کر اندر پہنچا دیا۔ کرامت علی شاہ نے مجھے اپنا بیٹا بنالیا۔ مجھے کسی بات کی پرواہ نہ تھی۔ چپ چاپ بیٹھا رہتا۔ خلاؤں میں گھورتا رہتا۔ بس زندہ رہنے کو چند نوالے حلق سے نیچے اُتار لیتا۔ گھٹنوں سر جھکائے خالی ذہن بیٹھا رہتا۔ آہستہ آہستہ لوگ میری طرف متوجہ ہونے لگے۔ پیر کرامت علی شاہ کو بھی میری ایسی حالت کے پیش نظر میرے اندر اپنا جانشین نظر آنے لگا۔ میں لاپرواہ تھا، خاموش تھا لیکن میرے دل میں ہر وقت الاؤ جلتے تھے۔ بدلے کی آگ بھڑکتی تھی۔ جسے میں نے کبھی ٹھنڈا نہ ہونے دیا۔ پیر کرامت علی شاہ جب دنیا سے رخصت ہوگیا تو گاؤں والوں نے خود ہی مجھے اُس کا جانشین مان لیا۔ میں نے بھی چپ رہنے میں ہی عافیت جانی اور خاموشی سے گدی پر بیٹھ گیا۔

جمال دین چپ ہوا تو اچھو حیران پریشان اُسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر چپ رہا۔ پھر بولا۔

''لیکن اب اس گدی پر کون بیٹھے گا...... حکیم جی نے تو کہا ہے کہ آپ بس......''

''تو فکر مت کر اچھو...... یہ گدی خالی نہیں رہے گی۔''

''وہ کیسے جی......؟'' وہ اب بھی حیران تھا۔

''میں نے سب انتظام کر رکھا ہے۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔

''پر کیسے جی......؟''

''تو نہیں جانتا اچھو...... میں نے کتنے اونچے خاندانوں میں اپنے شجرے امانت کے طور پر گروی رکھوائے ہوئے ہیں۔ میرے پاس تو رجسٹر میں ساری تفصیلات درج ہیں۔ دن مہینہ تاریخ اور سب سے بڑھ کر وہ اونچے نام تو نے تو دیکھا ہے وہ رجسٹر......''

''کیا مطلب سرکار جی...... اُس رجسٹر میں کیا ہے جی...... میں تو چٹا اَن پڑھ ہوں جی...... میں کیا سمجھوں گا۔ اچھو نے ہونق بن کر اُسے دیکھا۔ اُس کی پرسوچ نظریں جانے کیا سوچ رہی تھیں اور ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔

''میں نے اپنے لہو کے گراں قدر چراغ...... پاس پڑوس کے اونچے محلوں کی اونچی دیواروں پر جلا رکھے ہیں۔ وہ وہاں روشنی دیتے ہیں لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ......''

''مجھے تو ککھ وی سمجھ نہیں آ رہی کرماں والیو...... میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ دور دور سے لوگ آپ سے اولاد کی خاطر دوائیں لینے آتے

ہیں۔ اور دعا بھی کرواتے ہیں آپ سے۔"
"یہ اَن پڑھ جاہل عورتیں...... بے وقوف اور گنوار ہیں...... اور یہ دولت مند امیر اونچے لوگ...... کم عمری میں آزادی اور عیاشیوں میں پڑ کر خود کو قیمتی چیز سے محروم کر لیتے۔ نامرد بنا لیتے ہیں۔ ایسے میں ان بھولی بھالی بے وقوف ضرورت مند عورتوں کو ہم اولاد مہیا کرتے ہیں۔ مردوں کا بھرم بھی رہ جاتا ہے۔ وہ منہ کھولنے کی جرأت نہیں کرتے...... اور عورتیں...... وہ تو جانتی ہی نہیں کہ اُن کے ساتھ کیا ہو گیا۔
"انہیں تو لٹنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔ احساس ہی نہیں ہوتا۔ انہیں تو بس ایک بچے سے غرض ہوتی ہے۔ تا کہ اُن کا مستقبل محفوظ ہو جائے۔ اور تم کیا جانو کس کس محل میں کون کون سی حویلیوں میں ہمارے بیٹے عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کہنے کو اونچے نام والے ہیں۔ کوئی چوہدری کی اولاد ہے۔ کوئی بڑے زمیندار کی اور کوئی خود کو نمبردار کا بیٹا سمجھتا ہے۔ لیکن ہے تو ایک موچی کی اولادیں سب کے سب...... اُس موچی کے پوتے پوتیاں جس کے بیٹے کو چوہدری کی بیٹی سے محبت کرنے کے جرم میں سخت سزا دی گئی تھی۔ لاوارث بنا دیا تھا۔
بھکاری سمجھ کر گاؤں سے نکال دیا تھا۔ اب کوئی پوچھے اُن سب سے کہ کون بھکاری اور لاوارث ہے...... اور کون بادشاہ...... کون نامراد ہے اور کون مراد والا۔"
"آپ کیا کرنے والے ہیں جی...... کون بیٹھے گا اس گدی پر؟" اچھو ہراساں تھا۔ اس نے عجیب سی نظروں سے کرموں والے کو دیکھو۔ "اس گاؤں سے یا پھر کسی اور جگہ سے آئے گا۔"
"میں نے اس خط میں سب لکھ دیا ہے۔ نام، پتہ، ایڈریس، ماں باپ کا نام اور گدی پر بیٹھنے والے کا نام...... میرا سب سے بڑا بیٹا بیٹھے گا اس گدی پر......"
"ک...... کہاں رہتا ہے وہ سرکار...... کس گاؤں میں......؟"
"جب میں مر جاؤں گا تو یہ خط لیٹر بکس میں ڈال دینا۔ گدی، روپے، پیسے اور زیورات کا مالک خود ہی پہنچ جائے گا۔"
اچھو نے حیرت سے جمال دین کو دیکھا۔ جمال دین نڈھال آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ اچھو کے دماغ میں ہلچل مچ گئی۔
"گدی...... روپے، پیسے، زیورات، رجسٹر اور وہ خط......" اُس کے شاطر دماغ میں ایک منصوبہ پلنے لگا۔

☆......☆......☆

"ہاں اب بتا...... کیوں بلایا ہے مجھے اتنی دور سے اور وہ بھی اتنی جلدی میں......"
اچھو شادو کو آستانے سے تھوڑی دور درختوں کی آڑ میں لے آیا تو وہ کمر پر دونوں ہاتھ ٹکا کر آنکھیں نکال کر بولی۔
"دیکھ تو میری بہن ہے شادو...... میں نے تیرا فائدہ سوچا ہے۔ تیرا اور اپنا فائدہ ساری عمر عیش کرے گی۔ پیسے میں کھیلے گی۔ تجھے اتنی اوکھی جندگی نہیں گزارنی پڑے گی جو تو اُس نشئی اور حرامی فضلو کے ساتھ گزار رہی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر تیرا وہ کام چور پتر ہے نا، وہ تیرا ٹئر جن ٹکا، کام کا نہ کاج کا...... سارا دن ویلا بیٹھا مکھیاں مارتا ہے۔ سارا دن شیدے دی دکان تے بیٹھا گپیں لگاتا ہے یا پنڈ دیاں ٹیاراں تے آوازیں کستا ہے۔ اُس دی تے لاٹری نکل آئے گی۔"
"وے کھل کے گل کر اچھو...... سدھی تے

کھری...... میں پہیلیاں بجھنے نئیں آتی اتنی دور سے......'' شادو بدتمیزی سے بولی۔

''میں تے پنڈ سے بھاگ آیا تھا ابے دی مار کے ڈر سے...... پر تو تو پانچ جماعتیں پڑھی ہے نا......؟'' اچھو نے امید بھری نظروں سے اُسے دیکھا۔

''ہاں تے فیر......؟''

''تو خط پتر لکھ سکدی ہے نا......؟''

''ہاں...... تو کہنا کیا چاہتا ہے اچھو...... منہ سے کچھ پھوٹے گا یا میں جاؤں؟''

''ذرا ہولی بول...... تے قریب آ کے سن کہیں کوئی سن نہ لے......''

''کیوں......'' شادو نے تیوری چڑھائی۔ میں کوئی چوری ڈاکہ تو نہیں ڈالنے لگی۔''

''اچھا سن...... بس چپ کر کے سن۔'' اچھو نے جمال دین کی ساری حقیقت مال و دولت' زیورات اور خط کے بارے میں بتایا۔ اور پھر اُسے اپنا پلان بتایا۔

''تو تو لکھنا جانتی ہے۔ بس ایسا ہی خط لکھ دینا۔ بس نام بدلنا ہے اور خط پہ لکھا پتہ بدلنا ہے۔ اپنا پتہ لکھ دینا اُس پر اور پھر سب عیش ہی عیش ہے۔ یہ سب ہمارا...... گدی پر تیرا پتر بیٹھے گا۔''

''تمہارے تو دن ہی پھر جائیں گے۔'' ساری بات سُن کر شادو نے خون خوار نظروں سے اُسے دیکھا اور ایکدم کھڑی ہو گئی۔

''تو سدا کا آوارہ اور کام چور ہے اچھو...... تجھے شرم نہ آئی ایسا کہتے ہوئے تو میرے لعلوں جیسے پتر کو حرامی ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ تو مجھے، اپنی بہن کو ایسی ویسی زنانی ثابت کرنا چاہتا ہے۔ تجھے میری عزت کی ذرا پرواہ نہیں...... وے کیسا بھائی ہے تو......؟''

''عجت...... اچھو بھی ایکدم کھڑا ہو گیا اور تیزی سے بولا۔

''یہ عجت کیا ہوتی ہے؟''

''اور تیری عجت کہاں ہے...... اپنے شرابی اور نشئی خصم سے دو پیسوں کے لیے ہر روز چار چوٹ کی مار کھاتی ہے۔ وہ حرامی تجھے ذرا سی گل پہ نیلو نیل کر دیتا ہے۔ کیا عجت ہے تیری......؟ عجت کی بات کرتی ہے۔ وہ کھڑا ہو کر اِدھر اُدھر جھولنے لگا۔

''تو کیا ہوا......؟'' شادو مری مری آواز میں بولی۔

''جو بھی ہے، جیسا بھی ہے میرا خاوند ہے کوئی غیر نہیں ہے۔ کسی اور سے نہیں مانگتی جا کر...... میرے سر دا سائیں ہے وہ اور مجید میرا جائز بیٹا ہے۔ حرامی نہیں ہے۔ کسی ایرے غیرے لفنگے پیر کی اولاد نہیں ہے وہ...... اور تو......؟ تو ہماری نہیں اپنی سوچ رہا ہے۔ اپنا فائدہ ہے تیرا اُس میں۔ روپے پیسے اور زیورات دیکھ کر تیری رال ٹپکنے لگی ہے۔ میں نہیں کروں گی یہ سب...... میری عزت ہی سب کچھ ہے میرے لیے۔''

''عجت......'' اچھو پھنکار کر بولا۔ اور ایک تھپڑ کس کے شادو کے منہ پر مارا۔ ''اب عجت کی گل کی تو زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔ پیار نال نہیں سمجھے گی تو مار مار کے ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔ تو مجھے جانتی ہے نا...... میں کتنا بڑا بدمعاش ہوں۔''

اچھو نے اُس کے بال پکڑ لیے اور اس زور سے کھینچا کہ شادو کے آنسو نکل آئے۔

''عجت کی بات کرتی ہے؟ تجھے عجت راس نہیں آتی۔ تو نے میری گل نئیں مانی تو جندہ نہیں رہے گی۔''

''وہ فضلو کو پتا چلے گا...... تو مار ڈالے گا

مجھے...... طلاق دے دے گا۔ اگر اُسے بتایا کہ مجید اُس کا اپنا بیٹا نہیں ہے تو وہ مجھے قتل کر دے گا۔" شادو بچنے کی خاطر ہکلائی۔

"ارے بڑے فضلو دیکھے ہیں میں نے...... طلاق دیتا ہے تو دے دے...... تجھے اب اُس کی جرورت ہی کیا ہے...... مار کھانے کے لیے؟ سارے پنڈے پہ ٹیل ڈالنے کے لیے؟ تینوں تے خوش ہونا چاہیے۔ نشئی تے نکھٹو بے غیرتے خصم توں بچ جائیں گی۔ ہر ویلے مار داڑ رہیں رہے گا۔ آپ چ کمینے تے بے غیرت امیروں کے گھر کم نہیں کرنا پڑے گا۔ دو ٹکرے دے کر دس گالیاں دیتے ہیں خبیث لوگ...... فضلو کسی جگہ کوڑے کے پاس نشہ کر کے لڑھکا ہوگا۔ اُسے کیا پتا توں کہاں ہے...... میں نے مجیدے کو بلا لیا ہے۔ اپنے بندے کو بھیج کر...... تو بس جلدی خط پتر لکھ اور لفافے پر اپنا پتا لکھ دے۔ آتے ہی مجیدے کو پکڑا دوں گا۔ وہ پنڈ والوں کو دکھا دے گا کہ اُس دے باپ دا خط آیا تھا پنڈ میں اس لیے آیا ہے وہ...... تو یہ کالا جوڑا پکڑ اور پہن کر بالوں کو کھول اُس میں مٹی ڈال۔ منہ پر بھی مل لے تھوڑی سی، دو تین دن کا رونا ہے۔ پھر ساری عمر ساری حیاتی اُس کے گزارنا...... اور اگر میری گل نہ مانی تو اِدھر ہی ڈکرے کر کے مٹی میں قبر بنا کر ڈال دوں گا۔

تھوڑی دیر بعد شادو کالا جوڑا پہنے۔ بالوں میں مٹی ڈالے جمال دین کے پلنگ کی پٹی سے لپٹی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ باہر گاؤں اُمڈا ہوا تھا۔

اگلے دن جمال دین وفات پا گیا۔ تو اُس کے بین میں اضافہ ہوگیا۔ اُسی شام مجیدا بھی پہنچ گیا۔ لوگوں کی نظروں سے چھپ کر اچھو نے خط اُس کے ہاتھ میں تھما دیا اور اُسے اندر لے گیا۔

سب کچھ سمجھا دیا تو مجیدے کے منہ پر اک مکروہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ دونوں باہر آئے تو خط اچھو کے ہاتھ میں تھا اور اُس کی حیران پریشان نظریں جمال دین کی لاش پر جمی تھیں۔ اس وقت حقیقی اداکاری ضروری تھی۔ گاؤں والوں کو بتایا گیا تو مجیدے کی خاموشی اور غم زدہ چہرہ کچھ اور غم زدہ ہوگیا۔ وہ بھی ماں کے ساتھ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

"ابا جی...... کیوں چھوڑ دیا ہمیں...... اتنے سال دور رہے ہم سے...... اب مر گئے تو اب کیوں بلایا...... کس بات کی سزا دی ہمیں...... کیوں اتنی کڑی سزا دی ہمیں......" اچھو اطمینان سے اندر آ گیا۔ اور صندوق سے رجسٹر نکال لیا۔

"جمال دین تو کہتا تھا تو نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ بھولی بھالی عورتوں دے نال تو نے جو بھی کیا۔ اُن کے فائدے کے لیے کیا۔ اُن کے گھروں میں خوشی آئی تو اس میں کیا غلط تھا۔ تو میں نے ترے پتر کو چھپا لیا...... وہاں جانے سے روک دیا۔ جہاں وہ جا کر کتنے لوگوں دی حیاتی وچ اگ لگا دیتا۔ اور یہ رجسٹر بھی اسی لیے جلا رہا ہوں کہ آنے والے چنگے ویلے کوئی اسے دیکھ نہ لے...... اور لوگوں کی حیاتی میں دُکھاں دے سائے نہ آئیں...... اوناں دی خوشی قائم رہے۔ تو نے ای چنگا سوچا تھا اور میں بھی چنگا ہی کر رہا ہوں۔ ہاں اگر بدلے وچ مجھے یہ سب مل رہا ہے تو سمجھ لوں گا کہ ساری حیاتی تیری خدمت دا انعام مل گیا۔

بڑے سے ڈرم میں رجسٹر پھینک کر اُس میں اگ لگا کر وہ اُس میں سے نکلنے والے شعلوں کو دیکھ رہا تھا اور سکھ کا سانس لے رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں سارے شجرے جل کر راکھ ہو چکے تھے۔

☆☆......☆☆

افسانہ

تاریکی نصیب میرا

ثمینہ طاہر بٹ

"تم چپ کرو!! آئیں بڑی میری شکائتیں لگانے والی، اونہہ! آ لینے دو ابا کو، پھر مزہ چکھواؤں گا تمہیں!" اماں کے سہارے اٹھتے ہوئے اس نے آپا کو جیسے منہ توڑ جواب دیا تھا۔ آمنہ بھی غصے سے کچھ کہنے کو پر تول رہی تھی، مگر پھر اماں کی ملتجی نگاہیں دیکھ کر......

مجھے ڈر لگتا ہے مالک!!!!! میری گڑیا کے سب رنگ سلامت رکھنا! مجھے ڈر لگتا ہے کچے رنگ تو بارش کی ہلکی پھوار میں بہہ جاتے ہیں اک ذرا سی دھوپ پڑے تو اڑ جاتے ہیں! مالک!!! میری گڑیا کے سب رنگ سلامت رکھنا!! مجھے ڈر لگتا ہے!! وہ کب سے سر جھکائے اس نیم تاریک کوٹھری میں ناہموار ٹھنڈے اور گندے فرش پر بیٹھا تھا، اسکی آنسو بھری آنکھوں کے سامنے سے اسکا ماضی فلم کی صورت گذر رہا تھا۔ ایک کے بعد ایک ایسے دلخراش واقعات اسے یاد آ رہے تھے جو اسکی آجکی حالت اور اسے یہاں تک پہنچانے کے ذمہ دار ٹھہرائے جاسکتے تھے۔

"روز حشر جب زندہ در گور کر دی گئی بیٹیاں تمہارا دامن پکڑ کر سوال کریں گی کہ انہیں کس جرم کی پاداش میں قتل کر دیا گیا، تو تم کیا جواب دو گے" (مفہوم القرآن)۔ اماں اپنے روزمرہ کے کام کاج میں مشغول تھیں کہ اچانک صحن میں گونجنے والی زوردار دھماکے کی آواز سنکر چونک گئیں، اور ابھی وہ معاملے کی نوعیت سمجھ بھی نہیں پائی تھیں کہ ماجد کے زور زور سے رونے کی آواز نے انکے رہے سہے اوسان بھی خطا کر ڈالے۔ وہ ہاتھوں میں لیا پیڑہ وہیں آٹے کی پرات میں پھینکتے ہوئے باہر بھاگیں، مگر باہر کا منظر دیکھ کر وہیں حق دق کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔ کھلے صحن کے عین بیچ انکا لاڈلا (بلکہ ان سے کہیں زیادہ اپنی دادی اور ابا کا لاڈلا) ماجد اپنے قد سے کہیں بڑی اور وزن سے زیادہ بھاری (اپنے ابا کی) سائیکل کے نیچے دبا چلا رہا تھا۔ جیسے ہی اسکی نظر اماں پر پڑی، اسکے رونے اور چلانے میں شدت آ گئی۔ اماں بھی جیسے ہوش میں آئیں اور بھاگ کر درمیانی فاصلہ طے کرتی اسکے قریب آئیں اور اسکے اوپر سے سائیکل اٹھاتے ہوئے پریشانی کے عالم میں روہانسی ہو گئیں۔ "اماں!! میں نے اسے منع بھی کیا تھا، مگر یہ کسی کی سنتا ہی کب ہے؟ جب دیکھو ابا جی کو کاپی کرنے کے چکروں میں رہتا ہے۔ ابا کا چمچہ کہیں کا۔!" ماجد کے کچھ بولنے سے پہلے ہی اسکی بڑی بہن آمنہ نے جیسے اسکی شکایت لگائی تھی، اور یہ سچ بھی تھا، ماجد کو ابا اور دادی کے لاڈ پیار نے اسے بری طرح بگاڑ رکھا تھا وہ کسی کی کم ہی سنتا تھا، کیونکہ اسکی اماں اور آپا کی وقعت تو اسکے ابا کی نظر میں صفر تھی تو پھر ماجد انہیں کیسے سر آنکھوں پر بٹھا لیتا۔ "تم چپ کرو!! آئیں بڑی میری شکائتیں لگانے والی، اونہہ! آ لینے دو ابا کو، پھر مزہ چکھواؤں گا تمہیں!" اماں کے سہارے اٹھتے ہوئے

اس نے آپا کو جیسے منہ توڑ جواب دیا تھا۔ آمنہ بھی غصے سے کچھ کہنے کو پر تول رہی تھی، مگر پھر اماں کی ملتجی نگاہیں دیکھ کر صبر کے گھونٹ پی کر رہ گئی اور خفگی سے پیر پٹختی وہاں سے واک آوٹ کر گئی۔ اماں ماجد کو سہارہ دے کر اندر لائیں، اسکے چھلے گھٹنوں کو صاف کر کے دوا لگائی، پاوں کے ٹوٹے ناخن پر مرہم لگا کر پٹی باندھی پھر اسے ہلدی ملا گرم دودھ پلایا۔ اس ساری کارروائی کے دوران ماجد کی ریں ریں مسلسل جاری رہی تھی، جبکہ آمنہ غصے سے کھولتی اور اماں کے ادھورے چھوڑے کام نپٹانے کی سعی میں مصروف رہی تھی۔

"مرد کی مردانگی طاقت رکھنے کے باوجود اپنی آواز کو مدہم رکھنے میں ہے۔ ایک عورت کے سامنے گلہ پھاڑنے میں نہیں، وہ تو عورت کو بھی آتا ہے۔!!"" بیوقوف، جاہل عورت ہو تم! ایک نمبر کی کام چور اور کاہل، میری تو سمجھ میں آج تک یہ نہیں آیا کہ اماں نے تم میں دیکھا کیا جو میرا نصیب تمہارے ساتھ پھوڑ دیا۔ احمق عورت، سارا دن پتا نہیں کیا کرتی رہتی ہے کہ بچے کا دھیان بھی نہیں رکھا جاتا اس سے؟۔" ابا جس وقت سے گھر آئے تھے، مسلسل اماں کی گوشمالی کیے جا رہے تھے۔ اماں چپ چاپ سر جھکائے ان کی ڈانٹ کھائے

جارہی تھیں۔ "ابا!! میں نے ماجد کو منع بھی کیا تھا کہ آپکی سائیکل نہ چلائے۔ ابھی بہت چھوٹا ہے یہ اور آپکی سائیکل بہت بڑی، بہت بھاری۔ مگر اسے تو شوق ہے ہر وہ کام کرنے کا جو آپ کرتے ہیں تو آئمیں اماں بیچاری کا کیا قصور؟؟ آپ اماں کو کیوں ڈانتے جا رہے ہیں؟؟ اس سے بھی تو پوچھیں ناں، یہ اماں کی اور میری بات کیوں نہیں۔ سُنتا اماں کے بہتے خاموش آنسو، اور ابا کی مسلسل چلتی زبان نے جیسے آمنہ کا دماغ گھما کر رکھ دیا تھا، اور وہ بغیر سوچے سمجھے اماں کی حمایت میں اٹھ کھڑی ہوئی، اور اسکی بات ابھی مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ ابا کی بھاری پشاوری چپل جیسے اڑتی ہوئی آئی اور اسکا اچھا خاصا مزاج پوچھ گئی۔ " بدبخت، بدزبان کہیں کی، میرے منہ کو آتی ہے۔ تیری ہمت کیسے ہوئی مجھ سے سوال جواب کرنے کی؟ اور تو ہے کون؟؟ تو ہے کیا، اوقات کیا ہے تیری جو میرا شیر بیٹا تیری بات مانے؟؟ ارے! تیری ہمت کیسے ہوئی ماجد سے اپنا مقابلہ کرنے کی، تو جانتی نہیں، بیٹا ہے وہ میرا بیٹا اور بیٹے پیدا ہوتے ہی جوان ہو جاتے ہیں، بازو بنتے ہیں باپ کے اور تم...... تم مقابلہ کرو گی میرے بیٹے سے؟؟ تم لڑکی ذات، چھاتی پر رکھا بھاری پتھر اور شانوں پر دہرا بھاری بوجھ...... تم برابری کرو گی میرے شہزادے کی۔ جان سے ماردوں گا تم دونوں ماں بیٹی کو اور یہیں، اسی جگہ زمین میں گاڑ دوں گا۔ کسی کو کانوں خبر بھی نہیں ہو گی کہ تم دونوں گئی کہاں، سمجھیں، حرام خور، بدبخت، منحوس کہیں کی!!" آمنہ کے اعصاب اس مار نے شل نہیں کیے تھے، اسے زندہ درگور تو ابا کی باتیں کر گئیں تھیں، اور وہ وہیں کھڑی زمین میں دفن تو شائید ماجد کی طنزیہ نگاہیں اور استہزائیہ تبسم دیکھ کر ہی ہو گئی تھی، جوان ماں بیٹی کو جانوروں کی طرح پٹتا دیکھ کر اسکے چہرے پر پھیلا تھا۔ !! مجھے یہ لڑکی اب اس گھر میں نہیں چاہیے، یہ میرے بیٹے سے مقابلے بازی پر اتر آئی ہے۔ کوئی بندوبست کرو اسکا، میں جلد سے جلد اس کا بوجھ اتار پھینکنا چاہتا ہوں تاکہ اس کے منحوس سائے سے اپنے بچے کو بچا سکوں۔!!" آمنہ اور اماں کو اچھا خاصا سبق سکھانے کے بعد وہ اب دادی سے گھٹنے سے لگے جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہے تھے۔ ماجد دادی کی گود میں سر رکھے اونگتی جاگتی کیفیت میں ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا اور اسکے ننھے ذہن میں کیسے کیسے خیالات پک رہے تھے، یہ نہ تو دادی کو علم تھا اور نہ ہی ابا کو خبر۔

ماجد جوان ہو رہا تھا، اور جیسے جیسے اس پر جوانی آرہی تھی، اسکے اکھڑپن اور درشت مزاجی میں شدت آتی جا رہی تھی۔ بہت سال پہلے سولہ سالہ آمنہ کو ماں کی ہمدردی کے جرم میں اس سے دگنی تگنی عمر کے مرد کے ساتھ انا "فانا" بیاہ کر گھر سے نکال دیا گیا تھا۔ ابا نے پھر مڑ کر بھی دیکھنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کہ انکی بیٹی کس حال میں ہے، وہ زندہ بھی ہے یا مُردوں سے بھی بدتر زندگی گذار رہی ہے؟؟ کیونکہ وہ مرد تھے، انکا بیٹا مرد تھا تو انکا داماد بھی تو مرد ہی تھا اور مردوں کے اس معاشرے میں زندہ رہنے کا حق تو صرف مردوں کو ہی حاصل ہے، جو عورت اپنے حق کے لیے آواز اٹھائے گی وہ آمنہ کی طرح زندہ دیوار میں چنوا دی جائے گی۔"

"اوے ماجد پتر!! مرد ہو کر رو رہا ہے؟؟ او جھلیا، مرد کو کبھی درد نہیں ہوتا، اس لیے اس کی آنکھوں سے آنسو نہیں، غصہ جھلکنا چاہیے۔ جلال اور رعب ہی مرد کا سب سے بڑا ہتھیار ہیں اور تو ذرا ذرا سی بات پر زنانیوں (عورتوں) کی طرح رونے بیٹھ جاتا ہے۔ کتنی بار سمجھایا ہے تجھے کہ خود میں اکڑ پیدا کر، یہ آنسو اپنے اندر ہی دفن کر لے پتر! انہیں رعب، دبدبے اور جلال میں ڈھال لے، اور پھر اسے اپنی طاقت بنا پھر دیکھ، دنیا تیرے قدموں میں ہو گی۔!!" کئی بار کی دہرائی گئی باتیں ابا آج پھر اسے سمجھا رہے تھے اور وہ جوان ہوتا "مرد" آنکھوں میں درد اور ضبط کے سرخ ڈورے لیے اپنے " آئیڈیل ابا" کو صرف تکے جا رہا تھا۔ ابا کے کہنے پر ہی اس نے اپنے آنسوؤں کو بہت پہلے ہی اپنے اندر کہیں دور، بہت دور دفن کر ڈالا تھا۔ اپنی بائیس سالہ زندگی میں وہ کبھی نہیں رویا تھا۔ بڑے سے بڑے غم کو وہ "مردانہ وار" جھیل گیا تھا حتیٰ کہ آمنہ اور اسکے نومولود بچے کی بے وقت اندوہناک موت بھی اسے نہیں ہلا سکی تھی، اور پھر دادی کے تڑپ تڑپ کر، جگر کے کینسر میں مبتلا ہو کر سسکتے ہوئے مرنے کا دکھ بھی اس

کی آنکھ نم نہیں کر سکا تھا مگر آج آج درد حد سے سوا تھا آج لگتا تھا برداشت کی طاقت جیسے ختم ہو رہی تھی۔ اس کے سامنے اس کی اماں کی لاش پڑی تھی، نحیف و نزار اماں، ایسی صبر کی بندی کہ مرتے مر گئیں مگر ابا کے ڈھائے جانے والے مظالم چپ چاپ سہتی چلی گئیں۔ اس پر ماجد کی لاپرواہی اور لاتعلقی کا زہر بھی قطرہ قطرہ اپنے اندر اتارتی رہی تھیں۔ جوان اکلوتی بیٹی کی جوانمرگی نے انکی رہی سہی ہمت بھی جیسے نچوڑ لی تھی۔ سو وہ بہت چپ چاپ خاموشی سے ہمیشہ کے لیے ان دکھوں سے منہ موڑ گئیں۔ ماجد کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس کی بے ضرر سی اماں اس طرح اس سے جدا ہو گئیں۔ اور پھر اسکے اندر جڑ پکڑتے درد نے بلا آخر اسے پتھر بنا ڈالا۔ ایسا پتھر جس پر کوئی چیز، کوئی احساس، کوئی جذبہ اثر نہیں کرتا تھا اور یہ نفیسہ کی قسمت کہ وہ اسے گھسیٹ کر اس پتھر کے سامنے لے آئی۔ ابا نے اماں کی وفات کے بعد چند ماہ بھی انتظار نہیں کیا اور گھر سنبھالنے کا بہانہ بنا کر اماں جیسی ہی ایک اور بے ضرر اور خاموش، گائے جیسی خاتون سے عقد ثانی کر کے اسے گھر لے آئے۔ ماجد ابھی تک دکھ اور بے یقینی کے زیر اثر تھا۔ اماں جیسی بھی تھیں، خاموش، بیزبان، مگر اسکی ماں تھیں۔ وہ لاکھ ان سے لاتعلق، بے پرواہ رہتا، مگر وہ اسکی ذرا سی تکلیف پر جیسے تڑپ اٹھتی تھیں، اور اُسے انکی وہی تڑپ، وہی شفقت اور محبت اپنے حصار میں جکڑنے کو تھی کہ ابا نے "نئی اماں" لا کر اسکے سامنے کھڑی کر دی۔ ماجد اندر تک پتھرا گیا۔ اب نہ کوئی خوشی نہ کوئی غم اسکے جامد احساسات کو چھوتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ روبوٹ بنتا جا رہا تھا۔ ایسا روبوٹ جسکا فل کنٹرول ابا کے ہاتھ میں تھا۔ ابا ابھی بھی اُسے وہی پٹیاں پڑھاتے تھے، اور انکی باتوں کے زیر اثر ہی وہ ہر لڑکی کو شک کی نگاہ سے دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا۔ عورت ذات اسکے لیے صرف پاؤں کی جوتی کے برابر حیثیت رکھتی تھی۔ وہ ایسے میں نفیسہ جیسی نفیس طبیعت کی مالک لڑکی ماجد کی بیوی بنکر اسکے دائرہ شک میں آ گئی۔ نفیسہ ابا کے دوست کی بیٹی تھی۔ اسکے والدین معاشی طور پر ابا اور ماجد کے ہم پلہ نہیں تھے، کچھ اس لیے اور کچھ ماجد کے باپ دادا کی جائیداد کا اکلوتا وارث ہونے کی وجہ سے اسکا رشتہ فوراً" قبول کر لیا گیا تھا۔ ماجد کی ظاہری پرسنالٹی اور ڈبنگ انداز پھر، اس پر اسکی بیحد اچھی جاب نے نفیسہ کے والدین کو کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیا اور انہوں نے دیکھے بھالے بغیر ہی یہ " گھاٹے کا سودا" کر ڈالا۔ جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت جلد اماں کی جگہ نفیسہ اور آمنہ کی جگہ اسکی بیٹیوں انیسہ اور انیلا نے لے لی۔ شادی کے پچیس (25) سال بعد بھی اسے لگتا تھا کہ وہ جس پتھر کے ساتھ پہلے دن سر پھوڑنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی، وہ آج بھی جوں کا توں اپنی جگہ ایستادہ تھا۔ ہاں، مگر اسکا وجود اور اسکی روح پور پور چھلنی ہو چکی تھی۔ ماجد نے اپنے باپ دادا کی روایت کو پوری شدت کے ساتھ زندہ رکھا ہوا تھا، اور اب تو اسکے لخت جگر، اسکے جانشین، اسکے بیٹے عدیل اور نبیل بھی اس " وراثتی غصے اور دہشت کی علامت "رعب و دبدبے" کو خود پر پوری طرح حاوی کر چکے تھے۔

"انیسہ۔!! یہ تم کھڑکی کے پاس کیوں کھڑی ہو؟؟ کون تھا باہر؟؟ کس کے ساتھ آنکھ مٹکا کر رہی تھی بے غیرت، بول، کون تھا وہاں ؟!!" عدیل کی دھاڑتی، چنگھاڑتی آواز پورے گھر میں گونج رہی تھی۔ اسکی آنکھوں میں جیسے خون اترا ہوا تھا۔ اپنے سے پانچ سال بڑی بہن سے وہ اس طرح باز پرس کر رہا تھا جیسے وہ اُس سے پندرہ برس چھوٹی ہو، اور انیسہ عدیل کے اس انداز پر حق دق اُسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

"بتاتی کیوں نہیں؟؟ بھائی کیا پوچھ رہا ہے، کون تھا باہر؟ انیسہ ابھی عدیل کے تفتیشی حملے سے ہی نہیں سنبھل پائی تھی کہ ماجد نے پیچھے سے آ کر اسکی چٹیا پکڑ، زوردار جھٹکا دیتے ہوئے اسے جیسے جلتے انگاروں پر گھسیٹا تھا۔ "ابو!! کوئی نہیں تھا، آپ خود دیکھ لیں!!" انیسہ نے درد سے بیحال ہوتے ہوئے بمشکل کہا تھا، مگر اس "نقار خانے" میں اسکی سنتا ہی کون تھا۔" کیا دیکھ لیں؟؟ اب کون کھڑا ہو گا وہاں، جسے ہم دیکھ لیں؟؟ اُسے تو تم نے بھگا دیا ہو گا ناں ہمارے آنے سے پہلے، اور اب ہمیں بہلانے کو کہہ رہی ہو کہ دیکھ

لیں خود ہی!!" ماجد نے اسکی چٹیا کو ایک اور زوردار جھٹکا دیتے ہوئے زہریلے انداز میں کہتے ہوئے اسے زمین پر پٹخ دیا۔ جیسے ہی وہ زمین پر گری، غصے سے بھرے عدیل نے اسے بازو سے پکڑ کر اُسے جھٹکا دے کر اٹھایا تھا۔ "آج کے بعد اگر دوبارہ تمہیں یا انیلا کو اس طرح کھڑکیوں، دروازوں کے اردگرد منڈلاتے ہوئے بھی دیکھا تو یاد رکھنا، وہ دن تمہاری زندگی کا آخری دن ہوگا۔!!" عدیل نے انیسہ کو بری طرح سے گھورتے ہوئے اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سفاکی سے کہا۔ "میں نے کچھ نہیں کیا عدیل! میں نے کچھ بھی نہیں کیا، تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، میں سچ کہہ رہی ہوں، میں نے کچھ نہیں......!!" "بس آپی بس!! آپ کس کو رورو کر اپنی بے گناہی کا یقین دلا رہی ہیں؟؟ یہاں کسی کو ہماری ذات پر اعتبار نہیں ہے تو ہماری بات کا کوئی اعتبار کیوں کرے گا۔؟؟ اُٹھو آپی، چلو یہاں سے، یہاں ہماری کوئی نہیں سنے گا۔!!" وہ اُوندھے منہ صوفے پر گری بری طرح سے روتے ہوئے بولے جا رہی تھی کہ انیلا نے اسے شانوں سے تھام کر اٹھاتے ہوئے کہا تو بے بسی کے گہرے احساس میں گھری وہ اسی سے لپٹ کر بری طرح رونے لگی۔ انیلا کے آنسو بھی خاموشی سے اسکے دکھ کا ساتھ دینے لگے، جبکہ نفیسہ بیٹیوں کی دگرگوں حالت سے زیادہ شوہر اور بیٹے کی شقی القلبی سے نڈھال ہو گئیں تھیں۔

"ابو، امی۔!! آپ لوگوں نے مجھے کس جرم کی سزا میں اُس جہنم میں جھونک ڈالا تھا۔ کیا قصور تھا ابو؟؟ کیا آپکو ماجد کی ذہنی حالت، اسکے سرد رویے؟ کا احساس نہیں تھا؟؟ کیا آپ میری سوچ، میرے خیالات سے واقف نہیں تھے، جو آپ نے ایسے جابر اور ظالم شخص کو میرے لیے چن لیا۔ کیا میں آپ پر اتنا ہی بوجھ بن گئی تھی یا پھر آپکی دوسری بیٹیوں کے رشتے کی راہ میں رکاوٹ بن گئی تھی جو آپ نے آناً "فاناً" مجھے اپنے گھر اور زندگیوں سے نکال باہر کیا؟؟؟" نفیسہ حسب معمول پھر ماجد کے ہاتھوں پٹ پٹا کر اور بیٹوں کے ہاتھوں ذلیل ہو کر میکے آ گئی تھی، اور اب رورو کر اپنے والدین کے سامنے سوالی بنی کھڑی تھی جنہیں واقعی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس گھمبیر ہوتے مسئلے کا حل نکالیں کیسے۔؟؟

"نفیسہ پتر!! یہ سب نصیب کے فیصلے ہیں۔ تمہارا نصیب ماجد کے ساتھ ہی جڑا تھا، ہم چاہ کر کچھ بھی کر لیتے، تمہیں اسکی بیوی ہی بننا تھا۔ یہ ذلت تمہارے مقدر میں لکھی تھی پتر، اس لیے بہتر یہی ہے کہ صبر کرو۔ صبر کا پھل بڑا میٹھا ہوتا ہے!!" اسکی ماں تو حسب معمول نگاہیں چراتی اپنے کام میں مشغول تھیں، جبکہ ابو نے پہلے تو مدد طلب نگاہوں سے بیگم کو دیکھا پھر انہیں متوجہ نہ دیکھ کر خود ہی بیٹی کو تسلی دینے کی کوشش کی اور اپنے ابو کے "نادر خیالات" سن کر وہ ششدر ہی رہ گئی۔ "کیا مطلب ہے ابو آپکا؟؟ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں کہ میرا نصیب اتنا بُرا ہے کہ میں ساری زندگی اپنے بچوں کے سامنے ذلیل ہوتی رہوں، اپنی بیٹیوں کو انکے باپ بھائیوں کے ظلم اور شک کی بھٹی میں جلتا دیکھتی رہوں اور آواز بھی نہ اٹھاؤں، میں صبر کرتی رہوں اور آپکے داماد کے جبر سہتی رہوں اور پھر ایک دن انکے ہاتھوں ذلت سہتے سہتے ذلت کی موت ہی مر جاؤں نہیں ابو نہیں یہ میرا نصیب نہیں ہے، یہ آپکے داماد کا قصور ہے۔ یہ اس مردوں کے معاشرے میں بسنے والے ایک نفسیاتی جنونی مرد کا قصور ہے جو شک اور وحشت کی اس حد کو پہنچ چکا ہے اسے بھلے برے کی بھی تمیز نہیں رہی۔ اسکے اس شک اور جنون نے مجھ سمیت میری بیٹیوں کو بھی جلا کر راکھ کر ڈالا ہے!!" وہ جیسے ایک دم پھٹ پڑی تھیں۔ جن حالات سے وہ دن رات گذرتی تھیں انہوں نے اب جیسے انکا حوصلہ ہی چھین لیا تھا۔ وہ بُری طرح بکھر رہی تھیں اور انہیں اس طرح بکھرتے دیکھ کر وہ سب بھی پریشان ہو رہے تھے۔ "نفیسہ پتر!! تم تو ہماری بہت حوصلے والی بیٹی ہو۔ تم اگر اس طرح ہمت ہار جاؤ گی تو کیسے چلے گا؟؟ اب تم اکیلی نہیں ہو بیٹا۔ تمہارے چار بچے ہیں، تمہیں انکے بارے میں بھی سوچنا......!" "انکے بارے میں ہی تو سوچ کر کہہ رہی ہوں ابو آپ کیا سمجھتے ہیں، مجھے اپنے بچوں کی کوئی فکر نہیں ساری زندگی میں نے آپکی عزت، آپکے وقار کے لیے رورو کر ماریں کھا کھا کر ماجد

جیسے پاگل کے ساتھ گذارا اور آپ اب بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ صبر کرو، برداشت کرو میں آپکو بتا رہی ہوں ابو، اب وہ اکیلا نہیں ہے اسکے بیٹے بھی اب اسکے ساتھ برابر کے شامل ہو چکے ہیں جیسا وہ خود نفسیاتی مریض ہے ویسے ہی اس نے بیٹے بھی بنا دیئے ہیں اور اب مجھے ان تینوں سے اپنی اور اپنی بیٹیوں کی جان کا خطرہ ہمہ وقت رہنے لگا ہے۔ اس لیے آپ سے کہہ رہی ہوں کہ کچھ کریں، پلیز ابو! آپکو اللہ کا واسطہ میری اور میری بچیوں کی جان بچالیں ان ظالموں سے، پلیز ابو!"

"بریکنگ نیوز" "ناظرین! ہم آپکو تازہ خبر سے آگاہ کررہے ہیں۔ سب سے پہلے سب سے تیز۔ شمالی لاہور کے پر رونق علاقے میں کھانا اچھا اور وقت پر نہ بنانے کے جرم میں سنگدل باپ اور بھائی نے بُری مار مار سولہ سالہ بچی کو جان سے مار ڈالا۔ باپ کا کہنا تھا کہ روٹی ٹھیک کیوں نہیں بنائی اور بھائی کا تقاضا کہ سالن اچھی طرح گرم کیوں نہیں کیا؟؟ اس جرم کی پاداش میں کمسن انیلا بُری طرح تشدد کا نشانہ بننے کے بعد جان سے گذر گئی۔" دوپہر کا وقت تھا۔ سارے چینلز ریپیٹ ٹرانسمیشن ٹیلی کاسٹ کررہے تھے۔ سب نیوز چینلز پر بھی پرائم ٹائم کے ٹاک شوز ریپیٹ ہو رہے تھے کہ ایک دم ڈھم ڈھم کی آوازوں اور تیزی سے بدلتی سلائیڈز کے ساتھ یہ بریکنگ نیوز چلنے لگی۔ جس نے سب دیکھنے سننے والوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ "نفیسہ نفیسہ! تم نے ٹی وی پر چلنے والی خبر دیکھی؟؟" اسکی بھابھی اپنے پورشن سے بھاگی چلی آئی تھیں۔ وہ بے دلی سے لاونج کے صوفے پر نیم دراز گہری سوچوں میں گم تھی کہ بھابھی کی آواز سن کر گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ بھابھی نے آتے کے ساتھ ہی بغیر اسکا جواب سنے جھٹ سے ٹی وی آن کیا تھا اور سامنے ہی وہ منحوس خبر بار بار چلائی جا رہی تھی۔ معصوم انیلا کی ہنستی مسکراتی تصویر بار بار اسکرین پر دکھائی جا رہی تھی اور پھر خبر کی تفصیل سنے بغیر ہی وہ بے ہوش ہو چکی تھیں۔ ان کے بدترین خدشات خوفناک صورت سے درست ہو چکے تھے۔ ماجد کا گھر چھوڑنے کے بعد سے ہی اسکا دل انیسہ اور انیلا کے لیے ہولتا رہتا تھا۔ اس نے بہت کوشش کی تھی وہ انہیں بھی اپنے ساتھ لے آتی، مگر نہ تو ماجد اور اسکے بیٹوں نے اسکی اجازت دی اور نہ ہی اس کے باپ اور بھائی ان بچیوں کی ذمہ داری اٹھانے کو آمادہ ہوئے تھے۔ "نفیسہ! تم اگر ہمارے گھر رہنا چاہتی ہو تو سو بار رہو، مگر ایک بات یاد رکھنا تم میرا خون ہو، میری بیٹی، اور میں اگر یہاں سے لے کر جاؤں گا تو صرف اپنا گوشت، اپنا خون، ان چھچھڑوں کی میرے گھر میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ ماجد کی بیٹیاں ہیں اس کی ذمہ داریاں اور انہیں وہ خود اٹھائے گا میں نہیں!" اپنے باپ کے سفاک الفاظ سن کر وہ اندر ڈھے گئی تھی۔ ایکبار تو اس کا دل چاہا کہ ان کے ساتھ جانے سے انکار ہی کردے مگر پھر ماجد کی طنزیہ نگاہیں اور نبیل، عدیل کی آگ لگاتی مسکراہٹ نے اسے سر سے پاؤں تک سلگا ڈالا تھا، اس لیے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ابو اور بھائی کے ساتھ اس گھر کی دہلیز پار کر گئی۔ مگر یہاں آ کر بھی اسے ایک پل کا چین نصیب نہیں تھا۔ اپنی بیٹیوں کی مسلسل فکر اسے نڈھال کیے رکھتی تھی اور وہ اسی کوشش میں لگی تھی کہ کسی طرح ابو اور بھائی کو منا لے اور پھر اپنی بچیوں کو اس قید سے رہائی دلوا سکے۔ "نفیسہ! ابو ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ بیٹیوں کی ذمہ داری بڑی بھاری ہوتی ہے۔ یہ بڑا نازک معاملہ ہے۔ م اتنی بڑی ذمہ داری نہیں اٹھا سکتے، اور پھر ماجد ان کا باپ ہے، اگر کچھ کہے گا بھی تو انکے بھلے کے لیے ہی کہے گا۔ دشمن تو نہیں ہے ناں انکا تم فکر مت کرو، دیکھنا جب اسے گھر، بچے، کاروبار سب سنبھالنا پڑے گا تو خود ہی عقل ٹھکانے آجائے گی۔ بس تھوڑا حوصلہ کرو!" اسکے بھائی نے بھی باپ کی حمایت کرتے ہوئے اسے یہی قائل کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ کوشش اب تک قائم تھی مگر نتیجہ صفر کا صفر ہی تھا۔

"انیلا! میری بہن میں نے ہانڈی تو بنا دی ہے، مگر اب میری طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔ تم ایسا کرو کہ آج روٹیاں تم بنا لو۔ انیسہ کو دو روز سے بخار تھا، مگر ماں کے بعد اب اسکا خیال رکھنے والا کوئی بھی نہیں تھا، بلکہ الٹا اسے ہی سب گھر والوں کی خدمتیں کرنی پڑ رہی تھیں۔ گھر کا سارا کام، سب انتظام جیسے ایک دم اسکے سر پر ہی آن پڑا تھا۔ پہلے پہل تو وہ ایک دم بوکھلا ہی گئی

تھی مگر پھر باپ، بھائیوں کی ڈانٹ سے بچنے کے لیے خود بخود ٹھیک ہوتی چلی گئیلیکن آج واقعی اسکی طبیعت بہت خراب ہو رہی تھی۔ اسکی ہمت جیسے جواب دے گئی تھی گو کہ انیلا بھی اسکا ساتھ دینے کی اسکی مدد کروانے کی بھرپور کوشش کرتی رہتی تھی، مگر انیسہ خود ہی اسے گھریلو مسائل سے دور رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ اسکے میٹرک کے بورڈ کے پیپرز ہونے والے تھے اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ انیلا کا رزلٹ خراب آئے اور پھر اسکی وجہ سے امی سمیت وہ تینوں پھر زیرِ عتاب آجائیں۔ "ٹھیک ہے آپی! آپ اب ریسٹ کریں باقی کا کام میں خود ہی دیکھ لوں گی۔!" انیلا نے مسکراتے ہوئے بہن کو بستر پر لٹایا اسے چادر اوڑھائی اور خود کچن کی سمت چل دی۔ "یا اللہ!! یہ روٹیاں ٹھیک بنا لے اب۔ اگر ذرا سی بھی کسر رہ گئی تو سمجھو اسکے ساتھ ساتھ میری بھی شامت پکی ہی ہے!" بھیجنے کو تو اُس نے انیلا کو کچن میں بھیج دیا تھا مگر اب خود بستر پر پڑی ہول رہی تھی کیونکہ انیلا کو واقعی ابھی کچھ بھی بنانا نہیں آتا تھا خاص طور پر روٹی تو بلکل بھی نہیں۔ اور پھر اسکا خدشہ درست ثابت ہوا۔ انیلا کی بنائی گئی روٹی نہ تو گول تھی، نہ چوکور۔ کچھ لمبوتری، کچھ بیضوی۔ کہیں سے کچی، کہیں سے پکی، ادھ جلی، قدرے سخت (بلکل ایسی جیسی عموماً" بچیاں شروع شروع میں بناتی ہیں) ماجد نے جیسے ہی ہاٹ پاٹ کا ڈھکن اٹھایا اسکے ماتھے کی رگ پھڑکنے لگی جو اسکے شدید اشتعال کی علامت تھی۔ عدیل اور نبیل کا موڈ بھی بری طرح آف ہو چکا تھا۔ " انیسہ انیسہ !! کہاں مر گئی ہو؟؟" ماجد کی حلق کے بل چنگھاڑتی پکار نے انیسہ کو بستر سے اچھل کر اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ جیسے تیسے گرتی پڑتی حواس باختہ سی باہر بھاگی تھی، مگر اسکے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی انیلا پانی سے بھرا جگ اٹھائے میز تک آ گئی تھی۔ " کیا ہوا ہے ابو؟؟ آپی کو اس طرح کیوں پکار رہے ہیں آپ؟؟ آپکو کوئی کام ہے تو مجھے بتا دیں میں کر دیتی ہوں۔ آپی کو سونے دیں انہیں بخار......!" " سونے دوں؟؟ اچھا بڑی ہمدردی ہو رہی ہے آپی کے ساتھ؟؟ آرام کرنے دوں اسے بھی اور تمہیں بھی اور ایک وہ تمہاری حرامخور ماں بھاگ گئی جان چھڑوا کر اپنی ذمہ داریوں سے تم تینوں کو ہمیشہ کی نیند ہی سلا دوں تو ہی اچھا رہے گا ہے ناں!" انیلا کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی ماجد نے گھما کر ہاٹ پاٹ کا ڈھکن اسکے منہ پر دے مارا تھا اور پھر غصے کی شدت سے چلاتے ہوئے خود بھی اسے مارنے کو لپکے تھے۔ انیلا اس اچانک حملے کے لیے بلکل بھی تیار نہیں تھی، لہذا جگ اسکے ہاتھوں سے چھوٹ کر زمین پر آ رہا اور وہ خود بھی ماتھے پر ہاتھ رکھتی جھکتی چلی گئی۔ " انیلا، انیلا!! تمہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟؟ دکھاؤ مجھے چہرہ اپنا!!" انیسہ تیزی سے اسکی طرف لپکی اور پریشانی سے اس پر جھکتے ہوئے بولی تھی۔ "بہت چوٹ آئی ہے آپی بہت زیادہ چوٹ آئی ہے اور سیدھی دل پر آئی ہے۔ آپی کوئی ہمیں بتائے گا کہ ہمارا قصور کیا ہے؟ کس گناہ کی سزا میں ہمیں ایسا باپ اور بھائی ملے ہیں؟ جو ہمیں اپنا خون سمجھنا تو دور کی بات، انسان بھی نہیں سمجھتے ارے کوئی تو بتا دو کہ ہم نے کیا کیا ہے؟" انیسہ کے ہاتھ بیدردی سے جھٹک کر وہ بری طرح روتے ہوئے ہذیانی انداز میں چیخنے لگی تھی۔ اسکی کڑوی مگر سچی باتوں نے جہاں انیسہ کو اور زیادہ رلا دیا تھا وہیں ماجد کے تن بدن میں انگارے بھر دیئے تھے۔ انیسہ غریب خوف سے زرد پڑتی، انیلا کے منہ پر ہاتھ ہی رکھتی رہ گئی مگر وہ بغیر سوچے سمجھے بولتی چلی گئی۔ "ابو!! اب پانی سر سے اونچا ہوتا جا رہا ہے۔ اس لڑکی کی بدزبانیاں اور بدکلامیاں اب برداشت سے باہر ہیں۔ آج تو اسکو سبق سکھانا ہی پڑے گا۔ اور آج میں اسے سبق سکھا کے ہی رہوں گا۔ آپ مجھے بلکل بھی روکنے کی کوشش نہ کیجیے گا آج یہ نہیں یا پھر میں نہیں!!" عدیل غصے سے چلاتا ہوا آگے بڑھا اور انیسہ کے روکنے کے باوجود انیلا پر پل پڑا تھا۔ "ابو!! روکیں اسے پلیز ابو بس کر دیں مر جائے گی یہ چھوڑ دیں اسے خدا کے لیے چھوڑ دیں، ابو عدیل پلیز "باپ اور بھائی کی "مردانگی" کو انیلا چیلنج تو کر بیٹھی تھی، مگر اب انکے ہاتھوں بری طرح پٹتی، فٹبال کی طرح ادھر سے اُدھر لڑھکتی نیم بیہوش ہو چکی تھی۔ اُن وحشت کے مارے انا پرست مردوں کی مردانگی اُس معصوم کو تیزی سے خون میں لت پت ہوتا

دیکھ کر جیسے ہوش میں آئی تھی۔ پھر انیسہ کی چیخ و پکار اور نبیل کی بیچ بچاؤ کی ناکام کوششیں بھی انہیں حواسوں میں لے آئی تھیں، مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ ملک الموت اپنا کام دکھا چکے تھے۔ اس "مردوں کے معاشرے" میں ایک اور بیگناہ اور معصوم عورت اپنے باپ بھائی کی "غیرت اور مردانگی" کی بھینٹ چڑھ چکی تھی۔

اور اب ماجد جیل کی کال کوٹھری میں بیٹھا اپنے گذرے ماہ و سال یاد کر کر کے پچھتاؤں کے اندھے کنوئیں میں گرتا جاتا ہے۔ "ابو!! آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ آپ نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا ابو۔ آپ نے ہمیں کس راہ پر ڈال دیا تھا۔ آپکو نہیں پتا تھا کیا اس شک کا اس جنون کا انجام کیا ہوگا؟؟ آپکو نہیں علم تھا کہ ظلم کا بدلہ مل کر ہی رہتا ہے۔ آپ نے ہمارے ساتھ بلکل اچھا نہیں کیا ابو؟؟؟" عدیل کو کم عمری کی وجہ سے بچوں کی جیل بھیج دیا گیا تھا۔ عمر قید کی سزا سن کر جس طرح اُس نے روتے ہوئے، بین ڈالتے ہوئے۔ عدیل کی باتیں وہاں موجود سب لوگوں کو خون رلا رہی تھیں۔ عدالت سے باہر کھڑی نفیسہ اور زارو زار روتی انیسہ کو دیکھ کر عدیل کے کلیجے پر گھونسہ پڑا تھا۔ خود پر اس قدر جبر اور تشدد سہنے کے باوجود ان دونوں کو اپنے لیے روتے بلکتے دیکھنا اسکے لیئے کسی عذاب سے کم نہ تھا۔ وہ تھوڑی دیر انکے پاس رکا اور ان سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی۔ نفیسہ اس سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی تھی۔ عدیل نے نبیل کو اپنے انجام سے ڈرا کر سیدھے راستے پر چلنے اور ایک سچا مرد بننے کا وعدہ بھی لیا تھا، اور پھر ماجد کی طرف گہرے دکھ اور شکائیت بھری نگاہوں سے دیکھا اور نفرت سے سر جھٹک کر سپاہیوں کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ "تم نے ٹھیک کہا عدیل! تم نے بلکل ٹھیک کہا تھا بیٹا مگر میں بھی کیا کرتا، مجھے بھی تو شروع سے یہی سبق پڑھایا گیا تھا ناں جو میں نے تم دونوں کو سکھایا۔ ابا! آپ نے مجھے ہمیشہ یہی سکھایا یہی بتایا کہ "مرد کو کبھی درد نہیں ہوتا۔ مرد کبھی نہیں روتا۔" آپ غلط تھے ابا آپ سراسر غلط تھے۔ مرد کو درد بھی ہوتا ہے اور اسکے آنسو بھی آتے ہیں، وہ روتا بھی ہے۔ آپ غلط تھے ابا اپنی ساری زندگی آپکے دکھائے راستے پر چل کر برباد کر دی میں نے۔ نہ صرف اپنی زندگی، بلکہ اپنے بچوں کی زندگی بھی مگر آج میں اچھی طرح جان چکا ہوں کہ اصل مرد وہ ہوتا ہے جو عورت کی حفاظت کرتا ہے۔ بیٹی کو مان دیتا ہے، بیوی کو عزت، اسکی ڈھال بنتا ہے اور بہن کو مان، حفاظت، دیتا ہے انکو اپنی غیرت سمجھتا ہے اور ماں، ماں کے قدموں میں اپنی جنت تلاش کرتا ہے۔ ابا! مردکی اصل "مردانگی" گلا پھاڑ پھاڑ کر دھاڑنے اور آنکھیں نکال نکال کر عورت کو ڈرانے دھمکانے میں نہیں، بلکہ عورت کی حفاظت کرنے، اسکی ڈھال بننے اور اسکے آنسو پونچھنے میں ہے۔ ابا! آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ آپ نے مجھے "مرد" بناتے بناتے کیا بنا ڈالا ابا؟؟ اپنے خون اپنی بیٹی کا قاتل زمانہ جاہلیت کے دور میں لا پٹخا آپکے فرمودات نے مجھے ابا روز حشر میری بیٹی، میری بہن، میری ماں میرا گریبان پکڑ کر مجھ سے سوال کریں گی تو کیا جواب دوں گا میں ابا وہ آپ سے بھی سوال کریں گی تو آپ کیا کہیں گے؟؟ کیا جواز گھڑیں گے، اپنی مردانگی کا کون سا روپ دکھائیں گے ہم انہیں؟؟ آئیں! دیکھیں آ کر آج آپکا "مرد بیٹا" اپنی مردانگی کی گٹھڑی اٹھائے جیل کی سلاخوں کی پیچھے بیٹھا اپنی موت کی راہ تک رہا ہے۔ آئیں دیکھیں ابا۔!" ماجد کے پچھتاؤں کا کوئی انت نہیں تھا۔ اسکی اب باقی کی زندگی بھی انہیں پچھتاؤں اور اسی دکھ کے ساتھ گذرنے والی تھی، کیونکہ جیل کی کال کوٹھری میں اسے پچھتانے کے سوا اور کوئی کام بھی تو نہیں تھا۔

میل شوونزم کے مارے اس معاشرے میں ہر چوتھے مرد پر اپنی "مردانگی" سب کو دکھانے اور پھر اسے ثابت کرنے کا بھوت سوار رہتا ہے۔ اور اس میں صرف مرد اکیلے ذمہ دار نہیں، یہ ذمہ داری عورتوں پر بھی لاگو ہوتی ہے۔ ایک ماں اپنے بیٹے کو "سچا اور کھرا مرد" بنانے کی کوشش تو کر سکتی ہی ہے۔ ایک ساس اپنے بیٹے کو اپنی بہو کے خلاف اکسا کر، اسے پٹوانے کی بجائے بیٹے کو درگذر کرنے کی تلقین بھی تو کر سکتی ہے۔ یہ معاشرتی بگاڑ، جو صدیوں سے ایسے ہی چلا آرہا ہے، اسے بدلنے کے لیے کسی کو تو پہل کرنی ہوگی ناں، تو پھر وہ آپ اور میں کیوں نہیں؟؟ ذرا سوچیئے گا ضرور۔

☆☆......☆☆

کنارے دور نہ تھے

اللہ نے مرد کو نرمی سے عورت کے ساتھ پیش آنے کو کہا ہے اور عورت کو باوقار رہنے کا حکم دیا۔ مگر ہم ان دونوں احکامات کو بھلائے وہ کرتے ہیں جو بس ہمیں تسکین دے اسی لیے ہمارے معاشرے میں طلاق کی شرح بڑھ گئی ہے۔ لوگ بس اپنی خواہشات پوری کرنا......

جب شام کے سائے ڈھلتے ہوں
کچھ پنچھی قطار میں اڑتے ہوں
کچھ رستہ کٹھن ہو ویسے بھی
کچھ دور افق پہ منزل ہو
اک پنچھی گھائل ہو جائے
اور بے دم ہو کر گر جائے
تو رشتے ناطے پیارے سب
کب اس کی خاطر رکتے ہیں
اس دنیا کی ہے ریت یہی
جو ساتھ چلو تو ساتھ بہت
جو رک جاؤ تو تنہا ہو......!

رات کے پہر ہر سمت خاموشی کا راج تھا مگر یہ خاموشی بہت پُر اسرار سی تھی، جیسے اپنے اندر ڈھیروں راز سمیٹے بیٹھی ہو۔ سی ویو سے اٹھتا لہروں کا شور کومل با آسانی سن سکتی تھی۔ ٹھنڈا اپنے عروج پر تھی۔ لیکن کومل ہر منظر، ہر احساس سے بے پروا سی گہری سوچ میں ڈوبی تھی جیسے یہاں سے بہت دور کہیں ہو اس کے اندر بھی اسی طرح کا شور برپا تھا جیسا بالکونی سے نظر آتے سمندر کی لہروں کا شور تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے باہر کا کوئی منظر اپنی طرف متوجہ نہیں کر پا رہا تھا۔

زارا اس کے برابر میں پوری طرح اسی پر نظریں جمائے بیٹھی تھی، جیسے اس کے لیے اس سے زیادہ ضروری اور کوئی کام نہ ہو۔

''کبھی کبھی انسان اپنے قریب کے منظر سے بہت دور اور دور کے منظر سے بے حد قریب ہو جاتا ہے۔ کومل بھی رات کے اس پہر سب کچھ بھلائے ارد گرد سے بے خبر پرانی یادوں سے لڑنے میں لگی تھی۔

''کومل کیا ہوا ہے؟ اس طرح خاموش کیوں بیٹھی ہوئی ہو؟'' زارا نے اس کے سامنے ہاتھ ہلا کر کہا۔

''کچھ نہیں زارا، تم یہ بتاؤ تمہاری جاب کا کیا ہوا؟'' کومل نے اس کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

''بات مت بدلو تم اور مجھے شرافت سے بتاؤ، کیا مسئلہ ہے؟'' میں پاکستان سے کیا گئی لوگوں

کے لیے پرائی سی ہوگئی۔ اب مجھ سے کچھ بھی شیئر نہیں کیا جاتا۔'' زارا نے خفگی سے کہا۔

''ارے نہیں یار، ایسی بات نہیں تم چھوڑو، یہ سب، اور مجھے اپنی جاب کا بتاؤ آئی کال فرم سے؟'' اس نے زارا سے پھر وہی سوال پوچھا۔

''ہاں آ گئی ہے کال اور پیر سے جوائن کر رہی ہوں میں، کومل تم ان پانچ سالوں میں بہت بدل گئی ہو جس کومل کو میں چھوڑ کر گئی تھی وہ ایسی ہرگز نہ تھی۔'' اس نے کومل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''وقت کے ساتھ ساتھ انسان بھی بدل جاتا ہے۔'' کومل نے آہستگی سے کہا اور پھر اپنی بالکونی سے نظر آتے سمندر پر نظریں ٹکا دیں۔

''وقت انسان کو نہیں بدلتا، حالات اور واقعات بدل دیتے ہیں انسان کو۔'' زارا نے کہا اور پھر کومل کی تقلید کرتے ہوئے سمندر کی اٹھتی لہروں کو دیکھنے لگی۔

زارا اور کومل فرسٹ کزنز تھیں دونوں میں بچپن سے اچھی دوستی تھی، پانچ سال قبل زارا باہر پڑھنے چلی گئی، کومل پاکستان میں ہی ایم بی بی ایس کرنے لگ گئی۔ دونوں پڑھائی کی وجہ سے مصروف ہوگئی تھیں دونوں کے درمیان رابطہ تو قائم تھا۔ مگر دوسرے ملک میں ہونے کی وجہ سے پہلی سی بات نہ تھی۔ زارا ایک ماہ پہلے اپنی اسٹڈیز مکمل کر کے واپس آ گئی تھی۔ اِدھر کومل کی بھی ہاؤس جاب شروع ہوگئی تھی۔

☆......☆......☆

''کیا پڑھ رہی ہو؟'' زارا نے اس کے پاس بیڈ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''میڈیکل نیوز پیپر۔'' زارا کو جواب دے کر وہ دوبارہ سے پڑھنے لگ گئی۔

''اچھا کچھ انٹرسٹنگ ہے تو مجھے بھی بتاؤ۔'' زارا نے اشتیاق سے کہا۔

''پاگل میں کوئی ناول نہیں پڑھ رہی جو انٹرسٹنگ ہوگا۔ میڈیکل پیپر پڑھ رہی ہوں۔'' کومل نے غصے سے کہا۔

''اچھا بھئی ڈاکٹر صاحبہ جو بھی پڑھ رہی ہو وہی بتا دو، کچھ ہماری معلومات میں بھی اضافہ ہوگا۔'' زارا نے اسے چھیڑا۔

''تم مجھے سکون سے نہیں پڑھنے دو گی۔'' کومل نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔ اسے سخت چڑ ہوتی تھی جب کوئی اسے پڑھتے ہوئے ڈسٹرب کرتا تھا۔

''لو نہیں پڑھ رہی میں، تم یہ بتاؤ کیوں آئی تھیں، کوئی کام تھا کیا؟'' کومل نے نیوز پیپر بند کر کے سائیڈ پر رکھتے ہوئے کہا۔ اسے معلوم تھا اب زارا نے اسے پڑھنے نہیں دینا کچھ۔

''ہاں وہ میں تمہیں بتانے آئی تھی کل ہم شاپنگ پر جا رہے ہیں۔ مجھے جاب کے لیے کچھ نئے کپڑے خریدنے ہیں میں کل گاڑی اور ڈرائیور لے کر تمہارے اسپتال آ جاؤں گی پھر ہم وہاں سے مال چلیں گے۔''

زارا نے اپنا ترتیب کردہ پلان اسے بتایا۔''

ٹھیک ہے مگر 2:30 بجے تک آنا تم اور اب جاؤ مجھے سونا ہے۔'' کومل نے رضامندی ظاہر کرنے کے ساتھ لے جانے کا عندیہ بھی دیا۔

''کتنی بدتمیز ہوگئی ہو تم مجھے جانے کا کہہ رہی ہو۔'' زارا نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

''مجھے صبح جلدی اٹھنا ہے گڈ نائٹ!'' یہ کہہ کر وہ منہ پر تکیہ رکھ کر لیٹ گئی تو مجبوراً زارا کو وہاں سے جانا پڑا۔

☆......☆......☆

''کیا ہے زارا بس بھی کرو اب کیا سارا مال خریدو گی؟'' دونوں ہاتھوں میں شاپنگ بیگ پکڑے کومل نے بے زاریت سے کہا۔
''یار کہاں ایسی قسمت کہ پورا مال خرید لوں؟ ابھی تو ابا کے رحم و کرم پر ہوں، جب میرے وہ آ جائیں گے تب پورا مال خریدا کروں گی۔'' زارا نے مصنوعی افسردگی سے کہا۔
''لڑکیاں اصل میں اپنی زندگی تب ہی جی لیتی ہیں جب ابا کے رحم و کرم پر ہوتی ہیں۔'' کومل نے کسی گہری سوچ میں کہا۔
''تم پھر سیریس ہو گئیں؟ ایک تو پتہ نہیں تمہیں ہر وقت سیریس خالہ بننے کا شوق کیوں ہے؟ اور چلو تم پہ اب رحم کرتی ہوں آج شاپنگ یہیں پہ ختم کرتے ہیں، باقی کل کریں گے۔'' زارا نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔
''اچھا نہ ایسے گھورو مت میں لندن سے واپس آنے کے بعد تمہارے ساتھ پہلی دفعہ باہر آئی ہوں لنچ نہیں کرا سکتی کنجوس تو آئس کریم ہی کھلا دو، مجھ بھوکی کو۔'' زارا نے معصوم سا منہ بنا کر کہا۔
''اچھا ٹھیک ہے۔'' اسے زارا کی بات پر ہنسی آ گئی۔ زارا نے پاکستان واپس آنے کے بعد پہلی بار اسے مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ کتنی بھلی لگتی تھی اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھر وہ دونوں ایلی ویٹری فوڈ کورٹ آ گئیں۔
''دیکھو بیچارا شوہر کتنی منتیں کر رہا ہے بیوی کی، بس نہیں چل رہا بیوی کو منانے کے لیے اٹھک بیٹھک ہی شروع کر دے۔'' زارا نے آئس کریم کھاتے ہوئے اپنے سامنے والی ٹیبل پر بیٹھے کپل پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔
''کومل اس کے روایتی عورتوں کی طرح منہ ٹیڑھا کر کے تبصرہ کرنے پر خوب محظوظ ہوئی تھی، وہ کافی دیر تک زارا کے انداز پہ ہنستی رہی۔
''اب تم ایسے کیوں ہنس رہی ہو؟ بیچارہ مظلوم شوہر اتنی منتیں کر رہا ہے مگر مجال ہے بیگم صاحبہ مان جائیں ہونہہ!'' زارا نے ہلکے سے غصے سے کہا۔
''میں ہنس تمہارے انداز پر رہی ہوں۔ تم پانچ سال لندن میں گزار کر آئی ہو۔ مگر انداز وہی روایتی عورتوں سا ہے۔'' کومل نے اب کی بار زارا کو چھیڑا۔
''کیا مطلب روایتی عورتوں سا؟'' اس نے ناراض ہوتے ہوئے پوچھا۔
''بھئی دوسروں کے معمولات میں سب سے زیادہ دلچسپی پاکستانی لوگ رکھتے ہیں۔ تم نے بھی ابھی خالص پاکستانی عورتوں کی طرح کہا۔'' اس نے ہنس کر وضاحت دی۔
''اور تمہیں پتا ہے یہ شخص اپنی بیوی کی اتنی منتیں کیوں کر رہا ہے؟'' اس نے زارا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوالیہ انداز میں پوچھا۔
''بھئی ناراض ہو گئی ہو گی اس لیے منا رہا ہے۔'' زارا نے منہ میں فرنچ فرائز ڈالتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔
''نہیں وہ اس لیے نہیں منا رہا۔'' اس نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔
''پھر......؟'' زارا نے حیرت سے پوچھا۔
''دیکھو صاف لگ رہا ہے اس کی بیوی امیر کلاس سے ہے اور وہ اپنی بیوی کے ٹکڑوں پہ پل رہا ہے۔ اسی لیے اسے ڈر ہے کہ اس کی بیوی اسی طرح ناراض رہی تو اس کی عیاشی کا کیا ہوگا؟'' کومل نے اپنا تجزیہ پیش کیا۔
''ہیں؟'' حیرت سے زارا نے آنکھیں سکیڑیں۔

''ہاں کیونکہ کوئی بھی مرد یوں سرِعام اپنی اَنا کی فکر کیے بغیر اپنی بیوی کی منت سماجت نہیں کرسکتا۔'' اس نے جوس کا سپ لیتے مسکرا کر زارا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''مگر یار ایسا بھی تو ہوسکتا ہے وہ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا ہو؟'' زارا گویا ابھی تک یہ بات ماننے کو تیار نہ تھی۔ جب ہی اپنی رائے دیتے ہوئے بولی۔

''زارا کوئی بھی مرد چاہے کتنی ہی محبت کرتا ہو مگر وہ اپنے وقار پہ کمپرومائز نہیں کرتا۔'' اس نے ایک اور دلیل دی۔

''اگر ایسا ہے تو پھر لڑکے یوں، لڑکیوں کے پیچھے مارے مارے پھرتے کیوں ہیں؟ اپنی اَنا اور وقار کو نیلام کر کے لڑکیوں کے گرد چکر کیوں لگاتے ہیں؟'' زارا ابھی تک اپنی بات پر قائم تھی۔

''ایسا صرف لڑکے تب کرتے ہیں جب انہیں نیا اور خوبصورت پیس ملتا ہے۔ جس سے وہ اپنا دل بہلاتے ہیں...... بس شادی سے پہلے، چاہے مرد کتنی ہی اپنی محبت کے آگے پیچھے پھرے مگر شادی ہوتے ہیں ان کی مردانگی اچانک جاگ جاتی ہے۔ جن شوہروں کو بیوی کی دولت کی لالچ ہوتی ہے وہی اپنی مردانہ وجاہت اور وقار بھلائے یوں غلام بنے پھرتے ہیں۔'' اس نے سامنے بیٹھے شخص کی طرف آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''مگر یار آجکل تو ایسے لوگ بہت نظر آرہے ہیں۔'' زارا نے پریشانی اور افسردگی کے ملے جلے احساس لیے کہا۔

''ہاں آجکل لڑکے شارٹ کٹ ڈھونڈتے ہیں۔ ان کا مقصد دولت کا حصول ہوتا ہے اگر لڑکی خوبصورت مل جائے تو ڈبل مزے شو پیس ماڈل بھی اور پیسے بھی۔'' کومل نے سختی سے کہا۔

''کیا سب لڑکے ہی ایسے سوچتے ہیں کومل؟'' زارا نے دکھ سے پوچھا۔ سچے جذبات سے گندھی کسی بھی لڑکی کے لیے یہ بات بہت تکلیف دہ ہے۔

''نہیں زارا سب لڑکے ایسا نہیں سوچتے مگر اس دور میں زیادہ تر لڑکوں کی سوچ یہی ہے۔ آج کل وفا، محبت سب نایاب ہے وہ لڑکیاں بہت خوش قسمت ہوتی ہیں جنہیں باوفا ہمسفر ملتے ہیں۔'' کومل نے گہری سوچ میں کہا۔ کچھ دیر بعد شوہر بیوی کا بیگ اٹھائے اس کے پیچھے چل دیا۔ دونوں اس کپل کو گلاس وال سے نیچے پارکنگ تک دیکھتی رہیں ہم لوگ انتہا کے آسماں کو چھوتے ہیں۔'' زارا ایا تو کچھ مرد اپنی مردانگی کی انتہا کو چھوتے ہوئے عورت کو جوتے کی نوک پر رکھتے ہیں۔ یا پھر اپنی عزت نفس کا گلا گھونٹے اس قدر گر جاتے ہیں کہ ان کے مرد ہونے پر ہی شبہ ہوتا ہے۔

اللہ نے مرد کو نرمی سے عورت کے ساتھ پیش آنے کو کہا ہے اور عورت کو باوقار رہنے کا حکم دیا۔ مگر ہم ان دونوں احکامات کو بھلائے وہ کرتے ہیں جو بس ہمیں تسکین دے اسی لیے ہمارے معاشرے میں طلاق کی شرح بڑھ گئی ہے۔ لوگ بس اپنی خواہشات پوری کرنا چاہتے ہیں۔'' کومل نے ایک گہری سانس لی اور پھر خاموش ہوگئی۔

''کومل وہ شخص بہت خوش نصیب ہوگا جس کی قسمت میں تم ہوگی! نہ صرف تم ایک اچھی ڈاکٹر ہو بلکہ ایک بہت اچھی سوچ رکھنے والی انسان بھی ہو جسے اللہ تعالیٰ نے خوبصورت دل اور ذہن دماغ بھی دیا ہے۔'' اس نے کومل کی باتوں سے قائل ہوتے ہوئے کھلے دل سے اس کی تعریف کی۔

مگر وہ اس تعریف سے خوش ہونے کی

بجائے دکھ کی وادی میں جا گری، زارا نے اپنے جملے میں ''جو بھی شخص'' استعمال کیا تھا اس کا مطلب تھا وہ بھی اس کی حقیقت جان گئی تھی۔ زارا نے اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو دیکھا جہاں کچھ دیر پہلے ماحول کی تلخی تھی، وہاں اب تکلیف نمایاں تھی۔ کسی کی ناقدری کی کسی سے بے وفائی کی...... وہ دونوں گھر پہنچنے تک خاموش رہی تھیں۔

بادلوں کی گرج اور بارش کی چھن چھناتی آواز انسان کے اندر ایک عجیب سا احساس پیدا کرتی ہے۔ بارش دل پر جمی گرد کو دھو ڈالتی ہے۔ اور اندر کا منظر صاف کر دیتی ہے جس سے انسان بارش کے برستے قطروں میں اپنا آپ محسوس کرنے لگتا ہے۔ قدرت کی یہ خوبصورت حقیقت انسان کو اپنی حقیقت کے قریب تر کر دیتی ہے۔ اسی لیے انسان بارش میں زیادہ خوش ہوتا ہے یا بہت دکھی۔ وہ بھی آج اپنی زندگی کی حقیقت کو سوچتے ہوئے سامنے سمندر میں بارش کے قطروں کو مدغم ہوتے دیکھ رہی تھی۔

''یار کیا غضب کا موسم ہو رہا ہے چلو ٹیرس پر چلتے ہیں۔'' زارا اچانک سے پتہ نہیں کہاں سے نکل کر آئی تھی۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی ٹیرس پر لے جانے لگی۔

''نہیں زارا، مجھے نہیں جانا۔'' کومل نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

''کیوں نہیں جانا؟'' زارا نے منہ بنا کر کہا۔

''بس میرا دل نہیں ہے۔'' نظریں نیچی کیے اس نے آہستگی سے کہا اور بالکونی سے روم میں آ کر چیئر پر بیٹھ گئی۔

''کیا ہو گیا ہے کومل تمہیں، پہلے تو تم ایسی نہیں تھیں؟'' زارا نے خفگی سے کہا اور اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

''پہلے حالات بھی ایسے نہ تھے۔'' کومل نے زارا کو دیکھتے ہوئے دکھ سے کہا۔

''پتہ نہیں ایسا کیا ہو گیا ہے ایسا جو تم ہر وقت دکھ و افسوس اپنے چہرے پر سجائے بیٹھی ہوتی ہو۔'' اب کی بار زارا نے چڑ کے کہا۔

''کیا تمہیں نہیں پتہ کیا ہوا اور کیا ہو رہا ہے؟'' کومل نے حیرت سے زارا کی آنکھوں میں دیکھا کومل کی بات پہ زارا نظریں چرا گئی۔

''دیکھو کومل! حالات اور وقت ایک سے نہیں رہتے مانا کہ وقت کے ساتھ انسان بدل جاتا ہے مگر تمہاری طرح زندگی سے یوں بے زار بھی نہیں ہوتا۔'' اب کی بار زارا نے نرمی سے کہا اور اس کے سامنے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''زارا وقت کے ساتھ انسان بدل جاتا ہے مگر میرا تو دل ہی مر گیا ہے۔'' اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں موندتے ہوئے کہا۔

''ایک شخص کی خاطر تم نے اپنا دل ہار دیا؟ کومل تم آخر یہ بات کیوں نہیں سمجھتیں کہ ایک شخص پہ زندگی ختم نہیں ہوتی، زندگی بہت خوبصورت ہے تم ان دکھوں کی وادی سے نکل کر تو دیکھو۔ مگر تم خود نکلنا ہی نہیں چاہتیں تم خود جینا نہیں چاہتیں۔'' زارا کے لفظوں اور لہجے سے ناراضگی واضح تھی۔ اسے کومل کا یوں Pause زندگی گزارنا بہت برا لگتا تھا۔

''اتنا آسان نہیں ہوتا زارا ان دکھوں کی وادی سے نکلنا اور نکلوں بھی کیوں؟ ایک اور دکھ سہنے کے لیے؟ نہیں زارا مجھ میں اب اور ہمت نہیں ہے۔ پہلے ہی اپنے کیے کی سزا کاٹ رہی ہوں۔'' اس نے ٹوٹے لہجے میں کہا۔

''کس بات کی سزا کومل؟ تم نے کچھ غلط نہیں کیا تھا کومل؟ تم اس شخص سے دلبرداشتہ ہوئی تھیں

جبھی تم نے کسی اور کے بارے میں سوچا تھا۔''
زارا نے اسے رسانیت سے کہا اور بارش کی تیز ہوتی آواز سن کر بالکونی میں آ کر کھڑی ہوگئی اس نے کچھ دیر بعد مڑ کر دیکھا کومل وہیں چیئر پر بیٹھی تھی۔ سب کچھ بدل گیا تھا پہلے جب بھی بارش ہوتی تھی کومل زارا سے پہلے ٹیرس پر بھاگتی اور بارش میں خوب نہائی تھی۔
مگر اب وہ بارش کی دلفریب آواز پر بھی نہیں آئی تھی۔ زارا نے دکھ سے ایک نظر برستے آسمان کو دیکھا اور واپس کمرے میں آ گئی اور اس کے پاس نیچے کارپٹ پر بیٹھ گئی۔
''ایک دفعہ جب میں نے ماما سے وہاج سے رشتہ ختم کرنے کی بات کی تھی تو مما نے کہا تھا۔ اللہ ایسے رشتے ٹھکرانے سے ناراض ہو جاتا ہے۔ میں نے رشتہ ٹھکرایا بھی نہیں مگر اللہ پھر بھی مجھ سے ناراض ہوگیا۔'' کومل نے نم آنکھوں سے کہا۔ آنسو بندھ توڑ چکے تھے۔ وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بول رہی تھی آنسوؤں میں روانی آ چکی تھی۔ بہت سالوں کا غبار تھا جو اب آنسوؤں میں پھر نکل رہا تھا۔ تم سے اللہ ناراض نہیں ہوا ہے پیاری کزن!'' زارا نے پیار سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔
''اب تو انکل آنٹی بھی اس رشتے کی فیور میں نہیں ہیں۔ تم نے کیوں لٹکا کر رکھا ہوا ہے اس معاملے کو؟ ایک طرف کروا سے یوں روز روز کے درد اور تکلیف سے بہتر ہے ایک دفعہ ہی دکھ سہہ لو۔'' زارا نے اسے سمجھانا چاہا۔
''نہیں زارا میں ایسا نہیں کر سکتی۔ میں اس کی بے اعتنائی تو سہہ سکتی ہوں مگر اس کی دوری نہیں۔'' اس نے تڑپ کر کہا۔
''وہ کون سا تمہارے قریب ہے؟ کومل کب تک سہتی رہو گی یہ سب؟ ایک نہ ایک دن تو اس کا اینڈ ہونا ہی ہے؟''
انکل نے فائنل بات کرنی ہے ان لوگوں سے وہاں سے 'ناں' ہو اس سے بہتر ہے تم خود ہی یہ رشتہ ختم کر دو۔ اسے بھول جاؤ پلیز! یہ میری التجا ہے تم سے۔''
''وہ خود ختم کرے گا تو میرا دل مطمئن ہوگا کہ میں نے محبت سے بے وفائی نہیں کی! میں نے آخری دم تک اپنی محبت کو زندہ رکھنے کی کوشش کی۔ میرے دل پر کوئی بوجھ نہیں ہوگا۔''
''اور جو دکھ ہوگا اس کا کیا؟'' زارا بیچ میں بول پڑی۔
''وہ تو تب بھی ہوگا جب میں رشتہ ختم کروں گی۔'' کومل نے دور سے سمندر کی موجوں کو اٹھتے دیکھ کر کہا۔
''جب وہ کرے گا تب زیادہ ہوگا تب تم ٹھکرائی جاؤ گی۔'' اس نے سمجھانے کی ایک اور کوشش کی۔
''اپنے ہاتھوں سے محبت کو قتل کرنے کا دکھ کم نہیں ہوتا...... زارا...... ویسے بھی مجھے اب اس کی بے اعتنائی سہنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ میں خود سے قدم نہیں اٹھاؤں گی میں اپنی محبت آخری دم تک نبھاؤں...... ؟'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔
''مگر ایسے تمہاری زندگی میں دکھ ہی دکھ ہوں گے۔'' زارا کو اب اس پاگل لڑکی کو سمجھانا بہت مشکل لگ رہا تھا۔
''میں کانٹوں بھری راہ پر چلنے کی عادی ہوں۔'' اس نے تلخ مسکراہٹ سے جواب دیا۔
زارا نے ایک نظر اسے دیکھا اور افسوس سے سر جھٹک کر وہاں سے اٹھ گئی۔
''کومل فہیم مر تو سکتی تھی مگر اپنی محبت کو خود سے

کبھی نہیں چھوڑ سکتی تھی۔"

☆......☆......☆

"کب تک مجھے یوں نظر انداز کرتے رہو گے، تم تھک جاؤ گے مجھ سے بھاگتے بھاگتے مگر میں پیچھے نہیں ہٹوں گی وہاج بیگ۔" اس کے بار بار فون کرنے پر آخر فون اٹینڈ کرلیا گیا تھا۔ وہاج کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ بول پڑی تھی۔

"وہاج آپ......"

"کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟ کیوں تنگ کرتی رہتی ہو مجھے؟ میں تمہاری طرح فارغ نہیں بیٹھا رہتا۔" وہاج نے غصے سے کہا۔ کومل اس کے لفظوں کی بجائے اس کے بدلے ہوئے لہجے میں کھوگئی۔ کیا یہ وہی وہاج بیگ تھا جو اس کی ہلکی سی تکلیف سے بے چین ہو جاتا تھا۔ اسے یاد تھا ایک دن جب مما ہاسپٹلائز تھیں۔ تب وہ دور ہوتے کے باوجود بھی اس کے کتنے پاس تھا۔ کومل ٹینشن میں پوری رات جاگی تھی تو وہ بھی پوری رات جاگ کر اسے دلاسا دیتا رہا تھا۔ کیا یہ وہی وہاج تھا؟ نہیں ہرگز نہیں...... کیا مرد ایک ہی عورت سے جلد اُکتا جاتا ہے؟ اس کے دل نے کہا تھا 'ہاں' جبھی تو وہاج اس سے اُکتا گیا تھا۔

وہ کب سے اپنی سوچوں میں گم تھی۔ اسے اندازہ ہی نہ ہوا کب وہاج نے فون بند کیا تھا۔ وہ اب تک اپنے کان سے موبائل لگائے بیٹھی تھی۔

نمکین پانی کا لبوں پر احساس ہوا وہ چونکی تھی۔ کان سے موبائل ہٹا کر اسے بیڈ پر اچھالا۔ اور بالکونی میں آ کر آسمان کو تکنے لگی۔ جہاں چاند اور ستارے اپنی چمک سے سمندر کو روشن کر رہے تھے۔ نجانے کتنی دیر تک وہ اسی طرح ساکت کھڑی آسمان کو تکتی رہی تھی۔

☆......☆......☆

"کومل تایا سعید اور تائی جی آئے ہیں۔" زارا کی آواز پر اس کا دل تیزی سے دھڑکا تھا۔ گو تو یا وہ لمحہ آن پہنچا تھا جس سے وہ بھاگتی آئی تھی۔

"کومل ہمت کرو۔" زارا نے اس کی حالت غور سے دیکھتے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ اور اس کے سامنے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"کومل ایک نہ ایک دن تو ایسا ہونا ہی تھا۔ میرے خیال میں انکل عباس نے خود بات کرنے کے لیے تمہارے تایا اور تائی کو بلایا ہے۔ شاید خود جا کر بات کرنا مناسب نہیں لگا تھا۔" زارا نے تفصیل بتاتے ہوئے آہستہ سے اس کا ہاتھ دبایا تھا۔

"ز......ز......زارا مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" کومل کانپ رہی تھی زارا نے اسے گلے سے لگالیا۔

اگر کومل کرب سے گزر رہی تھی تو زارا بھی بے کل تھی۔ کومل اس کی بچپن کی دوست تھی اسے اس طرح ٹوٹتے دیکھنا اس کے دل کو بہت تکلیف دے رہا تھا۔ زارا نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا وہ کسی چھوٹے سے بچے کی طرح چھپے اس کے گلے لگی تھی۔

کتنا مشکل ہوتا ہے نا لڑکی ہونا اللہ نے بیٹی کو باپ کے لیے باعث رحمت بنایا، اور شوہر کے لیے خوش بخت مگر اس کے باوجود لڑکی ہونا بھی کبھی جرم لگتا ہے۔ کائنات میں رنگ بھرنے والی عورت کے لیے سانس لینا بھی اکثر دشوار ہو جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں عورت صرف ایک مخالف جنس ہے بس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

جس کا ڈر تھا وہی ہوا تھا سعید بیگ اور عباس بیگ میں خاصی تلخ کلامی ہوئی تھی ایک باپ کے لیے اپنی بیٹی کی ناقدری ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ عباس صاحب کومل کو مزید ٹوٹا بکھرا نہ دیکھ

سکتے تھے۔ بالآخر فیصلہ ہو گیا جس سے بھاگتے بھاگتے کومل اپنی روح تک کو زخمی کر بیٹھی تھی۔ زخموں کا درد اتنا تھا کہ دل پھٹا جا رہا تھا۔

''کیا کر رہی ہو یہ؟'' زارا نے کومل کے ہاتھ سے غصے سے موبائل لیتے ہوئے کہا۔

''مجھے اس سے ایک دفعہ بات کرنی ہے زارا۔'' کیسا ٹوٹا بکھرا لہجہ تھا اس کا۔

''پاگل مت بنو کومل، تم کل رات سے سو بار اسے کال کر چکی ہو۔ اگر اسے تم سے بات کرنی ہوتی تو وہ بہت پہلے تمہاری کال اٹینڈ کر چکا ہوتا۔'' زارا نے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''زارا مجھے اس سے بس آخری بار بات کرنی ہے مجھے وجہ پوچھنی ہے اپنی بے قدری کی اپنی تذلیل کی، وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

''کومل اس کے پاس کوئی وجہ ہے ہی نہیں اگر اس کے پاس وجہ ہوتی تو وہ بہت پہلے تم سے ڈسکس کرتا۔ تم دونوں آپس میں معاملے کو حل کرنے کی کوشش کرتے۔ مگر اس کا یوں خاموش رہنا تمہیں اگنور کرنا ظاہر کرتا ہے وہ انتہائی کمزور انسان ہے جس کے پاس اپنے فیصلے کو جسٹی فائی کرنے کے لیے کوئی سبب نہیں۔'' زارا اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے سمجھا رہی تھی۔ عمر میں وہ کومل سے دو ماہ چھوٹی تھی مگر اس وقت وہ بڑی بہن کا روپ دھارے اس کی دل جمعی کرتے اس کا دکھ بانٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''زارا کیا میری بھٹکنے کی وجہ سے اتنی بڑی سزا مل رہی ہے مجھے؟'' اس نے زارا سے الگ ہو کر نم آنکھوں سے سوال کیا۔ کومل اگر بھولا لوٹ آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے، تمہارے دل میں کچھ عرصے کے لیے بس زوہیر کے لیے فیلنگز پیدا ہوئی تھیں۔ جس کا تمہارے دل کے علاوہ اور کسی کو نہیں پتہ، تم نے اپنی غلطی کا مداوا کیا ہے اتنا عرصہ اسے جھیلتی رہیں۔ اب خود کو مورد الزام نہ ٹھہراؤ...... اسے رب کی رضا جان کر صبر کرو۔ دیکھنا تمہاری زندگی میں ایک نیا سویرا ضرور آئے گا انشاء اللہ......'' زارا نے اس کے ہاتھ تھام کر اسے دل سے دعا دی۔ پھر اس نے کومل کو سکون کی گولی کھلا کر سلا دیا۔ ان حالات میں جس طرح کومل ڈسٹرب تھی۔ اسے اپنوں کی ہی ضرورت تھی جو اسے کٹھن وقت سے نکال سکتے تھے۔

☆......☆......☆

''نائمہ بیڈ نمبر 8 کے پیشنٹ کی تو سب رپورٹس نارمل ہیں پھر کیا مسئلہ ہے اس کے ساتھ؟'' کومل نے اپنی کولیگ ڈاکٹر سے پوچھا۔

آج وہ اپنے اوپر گزرنے والے سانحے کے پانچ دن بعد اسپتال آئی تھی۔ پچھلے پانچ دن وہ سخت بیمار رہی تھی۔ ہلکا ہلکا بخار اسے آج بھی تھا۔ مگر بستر سے اکتا کر وہ آج یہاں چلی آئی تھی۔

''اُسے ڈپریشن ہے۔'' ڈاکٹر نائمہ نے کاؤنٹر سے ایک پیشنٹ کی فائل اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

''اوہ! کون Treat کر رہا ہے اسے؟ ڈاکٹر راحیل کا نام لکھا ہے فائل پر مگر وہ تو آج کل چھٹیوں پر گئے ہیں۔ کومل اپنی غیر حاضری کی وجہ سے بہت سی باتوں سے ناواقف تھی۔

''ہاں ڈاکٹر راحیل ڈیل کر رہے تھے اس پیشنٹ کو مگر اب ان کی غیر موجودگی میں ڈاکٹر ہمدانی کریں گے۔'' نائمہ نے فائل دیکھتے ہوئے مصروف سے انداز میں کہا۔

رات کے پہر کوریڈور سے آتی ہلکی ہلکی سی آوازوں نے اس کی نیند خراب کر دی تھی۔ آج

اس کی نائٹ تھی دل کے زخموں اور دماغی تھکن کی وجہ سے وہ کچھ دیر آرام کرنا چاہتی تھی۔ جو کہ باہر کے آتے شور کی وجہ سے ناممکن ہو رہا تھا۔

کروٹیں بدلتے وہ نیند کی تلاش میں تھی کہ اچانک دروازہ بجنے پر اس کی تمام تر حساسیت جاگ گئی وہ تھکے تھکے قدموں سے دروازے تک گئی۔

اور گھڑی پر نگاہ ڈال کر دروازہ کھول دیا۔

''ڈاکٹر کومل پلیز آ کر روم نمبر 8 کے پیشنٹ کو دیکھ لیں۔'' ہیڈ نرس نے گھبرا کر کہا۔

''او کے آ رہی ہوں۔'' جواد (ہیڈ نرس) کو جواب دے کے پلٹی اور صوفے سے اپنا اوور آل اور اسٹیتھو اسکوپ اُٹھا کر روم نمبر 8 کی طرف بڑھ گئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ کمرے میں تقریباً سارا ہی نرسنگ اسٹاف موجود تھا۔ وہ حیرت و پریشانی کا ملا جلا تاثر لیے دروازے کے ساتھ کھڑی تھی۔ ایک نرس نے پیچھے ہٹتے ہوئے اسے آگے آنے کی جگہ دی تو وہ سب سوچوں کو جھٹکتے ہوئے اپنی پروفیشنل ذمہ داری پوری کرنے کے لیے آگے بڑھی۔

''وہاٹ ہیپنڈ؟'' اس نے نرس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''میم پیشنٹ ٹریٹمنٹ روک کر باہر لان میں جانا چاہ رہے ہیں۔'' نرس نے پریشانی سے بتایا۔

کومل نے ایک نظر مریض کو دیکھا۔ اور ٹھنڈی سانس خارج کی۔

''ٹھیک ہے انہیں نیچے لے جائیں۔'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''مگر میم ......!'' نرس نے کچھ کہنا چاہا......

وہاں موجود سب لوگ ہی ٹریٹمنٹ روک کر رات کے 2:30 بجے اسے لان میں بھیجنے کی اجازت پر حیران تھے۔ سب جانتے تھے ڈاکٹر ہمدانی ذرا سی چوک بھی برداشت نہیں کرتے۔ کومل بھی ٹریٹمنٹ روکنے پر تذبذب کا شکار تھی مگر اسے اس وقت یہی درست لگا۔ اس لیے پیشنٹ کو باہر جانے کی اجازت دے کر سارے اسٹاف کو پیچھے پریشان چھوڑ کر وہ کمرے سے نکل گئی۔

کمرے میں آ کر اس نے اوور آل بیڈ پر رکھا اور اشفاق احمد کی کتاب کھول کر بیٹھ گئی۔ نیند اب کیا آنی تھی۔ دل کی حیرت، پریشانی اور تجسس سے عجیب حالت تھی۔

اُکتا کر اس نے کتاب رکھی اور کمرے کی واحد کھڑکی کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ جو اسپتال کے لان میں کھلتی تھی، سامنے بینچ پر بیٹھے وہ اسے نظر آ گیا تھا۔ کچھ لمحے سوچوں میں گھرے رہنے کے بعد اس نے کھڑکی بند کی اور دوپٹہ درست کر کے وہ خود بھی لان میں آ گئی۔

''کیسے ہو؟'' بینچ پر ذرا فاصلے پر بیٹھتے ہوئے اس نے آہستگی سے پوچھا۔

''کیسا لگ رہا ہوں؟'' جاثم نے زخمی انداز میں مسکراتے ہوئے اُلٹا اس سے سوال کیا۔

''کیا ہوا ہے؟'' کومل نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں بس بے وفائی کا ماتم کر رہا ہوں۔'' جاثم کی آنکھوں میں اس نے چھائی دھند اور نمی دیکھی تھی۔ کیا یہ وہی ہنستا مسکراتا مضبوط اعصاب کا مالک جاثم تھا جو پورے کالج کی رونق تھا۔ یہ تو اس جاثم سے بہت مختلف ہارا ہوا، زخمی دل اور اجڑی آنکھوں والا تھا۔ کومل نے دل میں تاسف سے سوچا۔

اس نے ٹھنڈی سانس خارج کی، وہ بھی محبت کی بے اعتنائی، اور بے وفائی سہہ رہی تھی۔ اس لیے اسے جاثم کا دکھ اپنا دکھ لگ رہا تھا۔

''کومل حرا مجھے بے وفائی کا دکھ دے کر چھوڑ گئی۔'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے ٹوٹے بکھرے لہجے میں اپنی بربادی کی وجہ بتائی۔

اس لمحے اگر وہ خود وہاج کی بے وفائی کا دکھ نہ سہہ رہی ہوتی تو حیران رہ جاتی۔ کیونکہ سب ہی جاثم اور حرا کی طوفانی محبت سے واقف تھے۔

''جاثم! محبت ہمیشہ ہی دکھ دیتی ہے۔'' اس نے نم لہجے میں آسمان کو تکتے ہوئے کہا۔ اذیت اس کے چہرے پر بھی عیاں تھی۔

''تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟ چھوڑ جانے والوں کے لیے اپنی زندگی یوں برباد نہیں کیا کرتے۔'' کومل کی بات پر جاثم زخمی انداز میں مسکرایا۔ کومل بھی یہ حقیقت جانتی تھی کہ اس کے الفاظ کتنے کھوکھلے تھے۔ جاثم سے نظریں چراتے ہوئے اس نے اپنے لبوں کو بھینچ لیا۔ کتنا مشکل وقت تھا۔ وہ اپنے سامنے بیٹھے شخص کو دلاسا بھی نہیں دے سکتی تھی۔

''جاثم! جاؤ جا کر ریسٹ کرو۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔'' ایک نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے سنجیدگی سے کہتی وہ وہاں سے اٹھ گئی۔ کمرے میں آئی تو فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ وضو کر کے اپنے رب کے حضور آنسو بہا کے اسے کچھ سکون ملا تو روٹھی نیند اس پر مہربان ہو گئی۔

گھر آ کر وہ سارا دن ہی جاثم کے بارے میں سوچتی رہی، وہ ایک ہی کالج میں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ کومل کا ایم بی بی ایس کا ادارہ تھا جبکہ جاثم فارمیسی میں دلچسپی رکھتا تھا۔ وہ حرا اور جاثم تینوں بہت اچھے دوست تھے۔ جاثم اور حرا کی جنونی محبت کو پورا کالج جانتا تھا۔ ایف ایس سی کے بعد ایڈمیشن ٹیسٹ اور پھر اپنے اپنے پروفیشنل کالج میں یہ لوگ اتنا مصروف ہو گئے کہ رابطہ پہلے جیسا نہ رہا۔ کل رات اسے یوں اپنے سامنے دیکھ کر وہ حیران تھی۔ دونوں کا دکھ مشترکہ تھا دونوں اپنی محبت کی بے وفائی سہہ رہے تھے۔ دونوں کے دل نارسائی کے غم سے چور تھے۔

☆......☆......☆

''اریب! ڈاکٹر نے جاثم کی کل رات ٹریٹمنٹ روکنے پر کچھ کہا؟'' اس نے مریضوں کی فائلز پڑھتے اپنی ساتھی ڈاکٹر سے پوچھا۔

''اوہ آئی مین روم نمبر 8 کے پیشنٹ کے بارے میں کچھ کہا؟'' کومل بے دھیانی میں اس کا نام لے گئی تھی۔ جبکہ یہ لوگ پیشنٹ کے بارے میں ڈسکس کرتے ہوئے ہمیشہ روم نمبر یا بیڈ نمبر استعمال کرتی تھیں۔

''نہیں کچھ خاص نہیں فائل دیکھ لو شاید کوئی نوٹ لکھا ہو سر نے، اریب نے اسے جواب دیا اور اپنا اوور آل اٹھا کر راؤنڈ کے لیے چلی گئی۔ کومل بھی سب فائلز چیک کرنے کے بعد روم نمبر 8 کی طرف بڑھ گئی۔ نیم تاریک اندھیرے میں ڈرپس میں جکڑا آنکھیں بند کیے وہ سامنے بیڈ پر لیٹا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ کومل جانتی تھی وہ جاگ رہا ہے اس کے پیر ہل رہے تھے۔ دروازہ ناک کرتے وہ بیڈ کے قریب آ گئی۔ جاثم نے ایک نظر آنکھیں کھول کر اسے دیکھا مگر پھر دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

''جاثم یہ سب ایسے نہیں چلے گا تمہیں ہمت کرنی پڑے گی۔ اپنے لیے نہ سہی اپنے پیرنٹس کے لیے ہی اس اندھیرے سے نکلو۔'' کومل نے اسے سمجھانے کی ناکام سی کوشش کی۔

جاثم کے والدین امریکہ شفٹ ہو گئے تھے مگر وہ پاکستان میں ہی رہا۔ بظاہر تو اس نے اپنی پڑھائی کا بہانہ بنایا تھا۔ مگر اصل وجہ حرا کے ساتھ

کی تھی۔ وہ تب تک اسے چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا جب تک اس کا نہ ہو جاتا۔ ایک عجیب سا خوف تھا اسے کہ اس کی ہر دل عزیز ہستی کہیں کھو نہ جائے۔ اس کا خوف درست ثابت ہوا اس کی جان سے عزیز ہستی کھوئی تو نہیں مگر اسے چھوڑ کر کسی اور کی سنگت میں چلی گئی تھی۔

وہ طلال کا جاثم سے ہر انداز میں بہتر ہونا تھا۔ کومل نے دکھ سے سر جھٹکا اور وہاں سے چلی گئی۔ کچھ دنوں بعد اسے ڈسچارج کر دیا گیا تھا مگر ڈاکٹر ہمدانی کے کونسیلنگ میٹنگز جاری تھیں وہ ابھی تک نارمل نہیں ہو پایا تھا دنیا اور لوگوں سے بے خبر وہ تنہائی کی زندگی جی رہا تھا۔

☆......☆......☆

کومل مکمل طور پر سنبھلی تو نہیں تھی مگر اس نے دکھوں کے ساتھ آگے بڑھنا سیکھ لیا تھا۔ ہاؤس جاب مکمل ہونے کے بعد اس نے ایف سی پی ایس کی تیاری کے ساتھ ساتھ اپنا میڈیکل کالج ڈیموشپ کے لیے جوائن کر لیا تھا۔ زندگی خاصی معروف ہو گئی تھی۔ رفتہ رفتہ دن سرک رہے تھے کہ اچانک زندگی نے ایک نیا رخ لیا، ایک صبح وہ کالج کے گیٹ سے اجلت میں داخل ہو رہی تھی۔

''اوہ سوری میم!'' مقابل شخص نے معذرت کی تھی وہ جو اچانک اس افتاد پر اپنا سر تھامے کھڑی تھی۔ آواز پر چونکی۔

اس نے سر سے ہاتھ ہٹا کر دیکھا تو سامنے وہ کھڑا تھا جسے وہ بھولنے کی بارہا کوشش کر چکی تھی۔ مگر کبھی کبھی ہماری لاکھ کوششوں کے باوجود بھی قدرت ہمیں اس شخص کے سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔

''ارے تم یہاں؟'' حیرت و خوشی کے ملے جلے تاثرات لیے اس نے پوچھا کومل اس کی آواز سے ماضی سے حال میں پہنچی تھی۔

''کیسے ہیں آپ؟'' خود پر کافی حد تک قابو پا کر اس نے لبوں پر ہلکی مسکراہٹ سجائے پوچھا۔

میں یہاں کل ہی لیکچرار اپائنٹمنٹ ہوا ہوں۔ اس نے خوشی سے بتایا۔ کومل نے اسے دیکھا مسکراہٹ اس کے حسین لبوں پہ کتنی بجتی تھی۔ اس نے خود کو جھڑکا۔

''ویٹس گریٹ......کانگریٹس......'' کومل نے مسکرا کے اسے وش کیا۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' بے تکلفی سے اس نے آنکھوں کو ذرا سا سکیڑ کر پوچھا۔ ایسا ہی تو تھا وہ، بے تکلف انفارمل، سامنے والا چاہے چھوٹا ہو یا بڑا وہ اپنے ہنستے مسکراتے لب و لہجے سے ہر کسی سے مخاطب ہوتا تھا۔ کومل نے ایک لمبی سانس خارج کی۔

''میں بھی یہیں ہوتی ہوں۔'' اس نے کسی گہری سوچ میں جواب دیا۔

''اوہ، واؤ کانگریٹس ٹو یو!'' اس نے بھی خوشدلی سے مبارکباد دی۔

''تھینکس!'' کومل نے ہلکے سے مسکرا کر کہا۔

''چلو پھر کل ملاقات ہوتی ہے۔'' اللہ حافظ کہتا وہ گیٹ سے نکل گیا۔ جبکہ کومل کالج سے ملحقہ لان میں بینچ پر آ کر بیٹھ گئی۔ یادوں کا ایک ریلہ تھا جس نے اسے آن گھیرا تھا۔ اس نے کبھی نہ سوچا تھا کہ ایک دن وہ اس کے سامنے دوبارہ یوں آ جائے گا۔

☆......☆......☆

زندگی اتفاقات کا نام ہے۔ کومل کا وہی ڈیپارٹمنٹ تھا جو اس کا تھا نہ صرف دونوں کا روزانہ آمنا سامنا ہوتا تھا بلکہ دونوں ایک ساتھ لیکچر تیار کرتے تھے۔ پریکٹیکل کلاس میں بھی کومل

اس کی معاونت کرتی تھی۔ بظاہر خود کو نارمل رکھ کر وہ اپنی جاب کر رہی تھی مگر کہیں کچھ ضرور تھا جو اسے بے چین کیے رکھتا۔

''کومل کیا بات ہے آج کل تم مجھے کچھ پریشان سی لگتی ہے۔ سب ٹھیک تو ہے نا؟'' زارا نے چائے کا کپ اسے تھماتے کھوجتی نظروں سے پوچھا۔ وہ دونوں لان میں بیٹھی شام کی چائے پی رہی تھیں۔

''زارا زوہیر میرے ہی ڈپارٹمنٹ میں لیکچرار اپائنٹمنٹ ہوا ہے۔'' اس نے آسمان کو گھورتے اطلاع دی۔

''کیا؟'' زارا نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''ہاں مجھے ان کا آنا بے چین کیے رکھتا ہے۔ پتہ نہیں کیوں حالانکہ میں سب کچھ بھلا کر آگے بڑھ چکی ہوں۔'' کومل نے اُداس لہجے میں کہا۔ بے چینی اس کی خوبصورت آنکھوں سے عیاں تھی۔ زارا اس کی کیفیت اچھی طرح سمجھ سکتی تھی۔

''زوہیر......کومل کا ٹیوٹر تھا ہنس مکھ، شریر، بے تکلف اور نہایت ہی شریر......

بلاشبہ پہلی ملاقات میں وہ مقابل کو اپنا اسیر بنانے کا ہنر جانتا تھا۔ ڈارک براؤن آنکھوں سے جھلکتی ذہانت، گندمی رنگت' چھ فٹ قد' آنکھوں پر لگے گلاسز اس کی شخصیت کو اور جاذب بنا دیتے تھے۔ یہ ہینڈسم سا ٹیچر اپنی بے پایاں ذہانت کی وجہ سے کومل کو شروع سے ہی اچھا لگتا تھا۔ کومل کب پسندیدگی سے انسیت کے درجے پر پہنچی اسے پتہ ہی نہیں چلا۔ ان دنوں وہ وہاج سے نالاں تھی، وہاج کا نان سیریس ایٹی ٹیوڈ اسے سخت برا لگتا تھا۔ جب ایک طرف انسان کو اپنی خوشیوں کا سامان نہ ملے تو وہ دوسری طرف بھاگتا ہے۔

کومل سے بھی لاشعوری طور پر ہوا تھا وہ وہاج سے عاجز آ کر، زوہیر کو سوچنے لگ گئی تھی۔ مگر سوچنے اور چاہے جانے میں فرق ہوتا ہے۔ کومل کو جلد ہی اس بات کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ زوہیر سے انسپائر ضرور تھی، مگر محبت نہیں کرتی تھی۔ اسی لیے اپنی سب سوچوں کو جھٹکتے ہوئے۔ وہ وہاج کی طرف لوٹ گئی تھی۔ کب وہ اپنی راہ سے بھٹکی اور کب لوٹی، کسی کو علم نہ ہوا۔ بس ایک گواہ تھا اس کا دل جو اُسے احساسِ شرمندگی میں مبتلا کیے رکھتا تھا۔

''جب تم آگے بڑھ گئی ہو تو پریشان کیوں ہو؟ ریلیکس ہو جاؤ جسٹ ٹریٹ ہم ایز اے کولیگ!'' زارا نے چائے کا سپ لیتے ہوئے اسے سمجھایا۔

''امم......آئی ایم ٹرائنگ!'' کومل بھی یہی چاہتی تھی مگر یہ دل تھا کہ عجب کیفیت سے دوچار تھا۔

''تمہارے اس پیشنٹ کا کیا ہوا؟ جس کی منگیتر اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔'' زارا نے دانستہ اس کا دھیان ہٹانے کے لیے سوال کیا تھا۔

''وہ ویسا ہی ہے اندھیروں کی زندگی میں جی کر اپنی زندگی کو دیمک لگا رہا ہے۔ سنا ہے اس کے والدین پاکستان آ چکے ہیں۔ جاؤں گی اس ویک اینڈ پر انکل اور آنٹی سے ملنے۔'' چائے کا خالی کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس نے بتایا، زارا اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی تھی وہ اپنا دکھ بھول کر اسے جاثم کے بارے میں بتانے لگی۔

☆......☆......☆

''آنٹی آپ اسے سمجھائیں نا، ایسے تو یہ پاگل ہو جائے گا۔'' کومل نے ارم خان کو دیکھتے ہوئے کہا وہ جاثم کے بارے میں متفکر تھی۔

''بیٹا میں تو اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئی ہوں مگر

یہ میری مانتا ہی نہیں ہے۔ تم کوشش کرو، تم تو اس کی دوست ہو نا، شاید تمہاری بات سمجھ جائے۔''
ارم خان نے اُس کے ہاتھ تھام کر کہا۔
''آنٹی میں پہلے بھی کوشش کر چکی ہوں، مگر پھر دوبارہ کوشش کروں گی آپ کے کہنے پر۔''
کومل نے ان کے بجھتے چہرے کو دیکھ کر کہا، وہ جانتی تھی، کتنا مشکل تھا کومل کا اِس کو سمجھانا۔
''کیسے وہ اس کو جھوٹی تسلیاں دیتی وہ خود بھی تو اسی کرب سے گزر رہی تھی۔ مگر اس کے بعد وہ جاشم کو کال کر کے اکثر سمجھانے لگی تھی۔ اس کی کوششوں کا اتنا اثر ضرور ہوا تھا وہ زندگی کی طرف تو نہیں لوٹا تھا مگر اب اندھیروں میں بھی نہیں جی رہا تھا۔

☆......☆......☆

ہوا کا جھونکا اس کے آنچل اور آوارہ لٹوں کو ہلا کر دوسری جانب چلا جاتا۔ موجوں کا شور شام ڈھلتے مزید بڑھ رہا تھا۔ موسم نے اچانک انگڑائی لی تھی۔ شدید گرمی کے بعد کراچی کے باسی معمولی سی سردی پر پریشان تھے۔ ٹھنڈ کے باعث ساحل پر کچھ من چلے آئے ہوئے تھے۔ وہ بھی خود کو پانی میں جانے سے باز رکھے ہوئے تھی۔ زارا اور کومل بھی سمندر کے کنارے پر بنے بینچز پر بیٹھی، موجوں اور صباء کی معصوم شرارتیں دیکھ رہی تھیں۔
''تمہارے وہ صاحب بہادر گھر تک پہنچ گئے ہیں۔'' کومل نے شریر مسکراہٹ لیے اطلاع دی۔
''کیا؟ تمہیں کس نے بتایا؟'' زارا نے بھنویں اُچکا کر پوچھا۔
''ممانے، وہ بتا رہی تھیں اس کے گھر والے بہت اصرار کر رہے ہیں۔'' اس کے چہرے پر کچھ کھوجتے اس نے جواب دیا۔
''اچھا......!'' زارا نے لاپرواہی سے کہا۔

اور منہ موڑ کر سڑک پر گزرتی گاڑیوں کو دیکھنے لگی۔
''زارا تم کیوں کر رہی ہو ایسا؟'' کومل نے ٹیبل پر رکھے اس کے ہاتھ کو ہلکے سے ہلا کر پوچھا۔
''میں محبت کا امتحان لے رہی ہوں۔'' زارا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ سوچوں کے گہرے بادل اس کی آنکھوں میں واضح تھے۔
''محبت کو آزمانے کا کوئی پیمانہ نہیں ہے۔'' کومل کا لہجہ خود بخود نم ہو گیا۔
زارا نے چونک کر دیکھا۔ ''یہاں تم غلط ہو، محبت کا پیمانہ تو انسان نے دنیا میں سانس لینے سے پہلے وجود میں آ جاتا ہے۔ محبت کو دل سے یہ کہا جاتا ہے۔ دل کا محبت پر ایمان لے آنا ہی محبت کا پیمانہ ہے۔''
محبت کے دھنک رنگ اس کی آنکھوں میں بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔
''دل اکثر دھوکہ دیتا ہے۔'' آنکھوں میں آئی نمی کو صاف کرتے ہوئے کومل نے جواب دیا۔
''دھوکہ بھی ایک حقیقت ہے مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے جب تک انسان دھوکہ نہ کھائے، سچی محبت کو نہیں پہچان سکتا۔'' زارا نے پُرسوچ انداز میں کہا۔
''چلو ٹھنڈ بڑھ رہی ہے۔'' کومل نے آہستگی سے کہہ کر اپنا موبائل اور گاڑی کی چابی اٹھائی۔ اس کا دل بوجھل ہو گیا تھا۔ سمندر جو اسے پہلے محبت کی علامت لگتا تھا۔ اب اُداسی کا سبب لگنے لگا تھا۔ زارا نے بھی کومل کی تقلید کی اور گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ زارا کا ایک کولیگ اس پر دل ہار بیٹھا تھا۔ بارہا، اسرار کے بعد بھی مثبت رسپانس نہ پا کر اس نے آخرکار گھر والوں کے ساتھ زارا کے گھر کا رخ کیا تھا۔

''محبت کی اصل میراث خوبصورت بندھن نکاح ہے محبت حلال تعلق میں پھلتی پھولتی ہے۔ حرام تعلق ایک سراب ہے۔ جس کے پیچھے آنکھیں بند کیے انسان بھاگتے بھاگتے تھک جاتا ہے۔ زارا فارس کا امتحان لے رہی تھی۔ آج فارس اپنی محبت میں کامیاب ٹھہرا تھا۔ اس نے زارا کو حلال اور جائز راستے سے مانگا تھا۔ اور زارا اس حسین سفر پر فارس کا ساتھ دینے کے لیے دل سے راضی تھی۔ محبت اپنی منزل پا چکی تھی۔

☆......☆......☆

''کومل تم نے وہ والی پریزنٹیشن......!'' کہتے سامنے دیکھ کر وہ ٹھٹکا تھا۔ بوتل گرین لانگ شرٹ پر سلور اسٹونز کے نفیس کام والی شرٹ زیب تن کیے سنہری آنکھوں سے جھلکتی حیا روشن چہرے پر معصومیت لیے، وہ کسی کو بھی لمحے بھر کے لیے مبہوت کر سکتی تھی۔
''جی سر؟'' کومل نے خود کو تکتے پا کر ناسمجھی سے پوچھا۔ وہ پہلے بھی کئی بار نوٹ کر چکی تھی۔ ڈاکٹر زوہیر اکثر اسے خاموشی سے دیکھتے رہتے تھے۔
''پریزنٹیشن تم نے فائنل کر لی؟'' اس نے سنبھل کر پوچھا۔
''جی سر! مگر آپ پھر بھی ایک بار چیک کر لیں۔'' کومل نے لیپ ٹاپ اس کے آگے کر دیا اور خود آج کے لیکچر کے لیے کتاب سے متعلقہ ٹاپک کے بارے میں پڑھنے لگی۔

☆......☆......☆

''میم، سی پی آر کا نو رزلٹ (نرس) نے افسردگی سے کہا۔ اور پھر بیڈ پر لیٹے ٹھنڈے وجود کے چہرے پر سفید چادر ڈال دی۔

"فیملی کو بلاؤ" اس نے ساتھ کھڑی نرس کو ہدایت دی۔
"سوری! ہم اپنی پوری کوشش کے باوجود انہیں نہیں بچا سکے۔" اس کی بات نے سامنے کھڑی لڑکی کے چہرے پر اُداسی کے رنگ بکھیر دیے تھے۔ گھٹی گھٹی آوازیں روتے ہوئے وہ بینچ پر بیٹھ گئی۔ کومل بھی نم آنکھیں لیے اپنے روم میں آ گئی۔ اس کا دل بھی بوجھل ہو رہا تھا۔ کتنی آس سے اس لڑکی نے اپنی ماں کی زندگی بچانے کے لیے کومل سے درخواست کی تھی۔ مگر اللہ کے فیصلوں کے آگے سب بے بس ہیں۔ ابھی وہ ان سوچوں میں ہی گم تھی کہ اس کا موبائل وائبریٹ کرنے لگا۔ اسکرین پر چمکتا اس کا نمبر دیکھ کر اس نے آف موڈ کے باوجود بھی کال اٹینڈ کر لی۔
"کیسی ہو کومل؟" ائیرفون سے زارا کی زندگی کی زندگی سے بھرپور آواز چہکی تھی۔
"ٹھیک..... تم بتاؤ کس لیے یاد کیا؟" کومل نے تھکے تھکے انداز میں پوچھا۔
"تمہارے لیے ایک بگ نیوز ہے! بوجھو تو جانیں!" زارا کی شوخی کومل کے موڈ کے قطع نظر عروج پر تھی۔
"زارا پلیز میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ بتانا ہے تو بتاؤ ورنہ میں فون بند کر رہی ہوں۔" کومل نے بے زاری سے کہا۔
"اچھا اچھا بابا سنو! تمہارے وہ ٹیچر ہیرو کی امی جان آئی ہیں۔ آج تمہارا پرپوزل لے کر! انکل آنٹی تو بہت مطمئن ہیں اس رشتے سے پھر زوہیر تمہاری بھی پسند تھا۔ میں تو بہت خوش ہوں۔" زارا اور بھی پتہ نہیں کیا کہہ رہی تھی مگر وہ اپنا سن دماغ دونوں ہاتھوں سے تھامے اپنے کل رات کیے جانے والے فیصلے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔
"زندگی بھی اکثر بڑی ظالم بن جاتی ہے۔" جب انسان کوئی ارادہ کرتا ہے تو وہ ایک ایسا رخ وا کر دیتی ہے جس سے اپنے فیصلے پر ٹکے رہنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

☆......☆......☆

"کومل! تم نے اچھی طرح سوچ لیا ہے نا؟" زارا نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔
"ہاں......!" کومل نے مسکرا کر کہا۔ اور پھر اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔
"تمہیں پورا یقین ہے تم اسے منالو گی؟" زارا اس کے لیے فکرمند تھی۔
"اپنے دل کے ہاتھوں ہارنے سے بہتر ہے دوسرے کا دل جیتنا ہے دوسروں کا دل جیتنا دشوار ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ اور جب ناممکن نہیں تو اپنے قدم بڑھانے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ زارا مجھے پورا یقین ہے وہ میرے سچے جذبوں سے ایک نہ ایک دن ضرور زندگی کی طرف لوٹے گا۔"
اس کے الفاظ اس کے سچے جذبات کی ترجمانی کر رہے تھے۔
زوہیر! روشنیوں کے دیس کا باسی ہے۔ اسے کوئی اور ہمسفر مل جائے گا۔ مگر جاثم وہ تو اندھیروں کا راہگور ہے اس کے ہم قدم ہو کر کومل جگنو بن کر اسے اندھیروں سے نکالنا چاہتی تھی۔
ڈاکٹر کومل نے ایک مشکل راہ کی طرف اپنے قدم بڑھائے تھے۔ جہاں اسے جاثم کو منانا تھا۔ اس کے ساتھ ایک ہنستا بستا گھر بسانا تھا۔ اگر مضبوط عزائم اور پختہ ارادے ہوں تو کوئی کام ناممکن نہیں۔ کومل کو بھی ایک کٹھن دریا کو پار کر کے کنارے تک پہنچنا تھا۔

☆☆......☆☆

ناولٹ

صرف دنیاوی آسائشوں نے اس کی آنکھ اور کانوں کو بند کر دیا تھا اسے شاید اپنی بیوی کی کسی بھی سرگرمی پر اعتراض اس لیے نہ تھا کہ وہ ایک بھاری رقم گھر لا رہی تھی جس کی بدولت اس کی زندگی میں بہت سی آسانیاں تھیں اور ان ہی آسانیوں نے رضا کے دل میں حلال اور حرام......

ایک ایسا یادگار ناولٹ جو دلوں سے مکالمہ کرے گا **تیسرا حصہ**

وہ تو کبھی اپنے پرس میں موجود رقم گننے کی عادی نہ تھی مگر شرجیل کے گھر کے حالات نے اسے سمجھایا کس طرح قطرہ قطرہ جمع کر کے زندگی کا دشوار ترین سفر طے کیا جاتا ہے ہر گزرتا دن اس کی زندگی میں مایوسیاں بھرتا جا رہا تھا اور ہر روز کوئی نہ کوئی نئی مصیبت اس کے سامنے آن کھڑی

ہوتی اور اب کرایہ کی عدم ادائیگی کے ساتھ ساتھ مالک مکان کے گھر خالی کرنے کی دھمکی نے اسے بے حد پریشان کر دیا ایسے میں اسے بڑی آپا اور اجیہ پر ترس آتا جو سارا دن محنت مزدوری کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی ماں کی ذمہ داری بھی پوری طرح نبھا رہی تھیں بڑی آپا کی تو شاید شادی کی عمر نکل چکی تھی مگر اجیہ تو ابھی صرف چھبیس، ستائیس سال کی تھی، شکل وصورت کی بھی اچھی تھی ایسے میں وہ دل سے چاہتی تھی کہ کسی طرح کر کے اس کی شادی کروا دے مگر کس طرح؟ اور کس کے ساتھ؟ ان کی خیالات کے تانے بانے بنتے ہوئے اُس نے شرجیل کی بات ماننے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے اس فیصلہ پر وہ جلد ہی عمل درآمد کرنے کا ارادہ بھی رکھتی تھی یہ ہی سب سوچ کر اس نے شرجیل کو پکارا۔

تم سو رہے ہو؟ شرجیل متوجہ کرنے کے لیے اس نے بات شروع کی۔

نہیں تو...... وہ اپنی آنکھوں سے بازو ہٹاتے ہوئے بولا۔

اچھا میں سمجھی شاید......

حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ سونے کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔

اصل میں مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی تھی۔

وہ فوراً اپنے اصل مدعا کی جانب آتے ہوئے بولی۔

کیا بات کرنی ہے؟ سب ٹھیک تو ہے نا؟
ٹھیک ہی ہے تم اپنے دوست رضا کی بیوی سے مجھے ملوا دو تاکہ میں اس سے معلومات لے سکوں کہ وہ کس طرح گھروں میں جا کر سروس فراہم کرتی ہے اور اس سلسلے میں میری کتنی مدد کر سکتی ہے۔
اس نے اپنی بات ختم کر کے شرجیل کے چہرے پر ایک نظر ڈالی جہاں پل بھر میں ہی خوشی کے ہزاروں رنگ بکھر گئے۔
ویری گڈ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہیں میری بات سمجھ میں آ گئی ہے اور تم اسے ماننے کا بھی فیصلہ کر چکی ہو واہ یار تم تو کافی عقلمند نکلیں۔
وہ جانتی تھی کہ شرجیل اس کی بات سن کر اتنا ہی خوش ہو گا مگر پھر بھی اسے شرجیل کی یہ خوشی ذرا اچھی نہ لگی اسے آج احساس ہوا بے غیرتی کسی صنف کی محتاج نہیں اس کی زد میں مرد و زن دونوں ہی آ سکتے ہیں بے غیرتی کی اعلیٰ ترین مثال اس کی ماں تھی۔ جس نے صرف اپنی مادی خواہشات کی ہوس پوری کرنے کے لیے سب کچھ داؤ پر لگا دیا اور دوسری زندہ جاوید مثال اس کے سامنے شرجیل کی شکل میں کھڑی تھی، جو غالباً اس وقت فون پر رضا سے ہی بات کر رہا تھا، اس کی ماں کی طرح اس شخص کو بھی اپنی جوان بہنوں اور ان کی برباد ہوتی جوانی کا کوئی احساس نہ تھا جان چکی تھی کہ اس کی سوچ سے بڑھ کر کمینہ اور گھٹیا ترین شخص ہے اور اس بات کا علم اسے جلد ہی ہونے والا تھا باہر سے آنے والے شور بھی معدوم ہو چکا تھا غالباً مالک مکان بک جھک کر چکا تھا۔
☆......☆......☆
غلام حسین کو گرفتار کر لیا گیا اس کے کالے کرتوتوں کو ملک کے ہر اخبار کے فرنٹ پیج پر کوریج دی گئی ہر اخبار اس کی مختلف تصاویر سے بھرا ہوا تھا ماریہ کی ہمدردی میں کئی سماجی تنظیمیں اور این جی اوز میدان عمل میں کود آئیں مختلف سیاسی شخصیات کی طرف سے اُسے امدادی طور پر لاکھوں روپے کے چیک بھی دیے گئے غرض ہر شخص نے اپنی سیاست چمکانے کے لیے اس کار خیر میں حصہ ڈالنا ضروری سمجھا اور یہ قصہ عرصہ دراز تک لوگوں کی زبان پر رہا ماریہ اور فرحین شروع شروع کی ایک دو پیشیوں پر کورٹ بھی گئیں مگر غلام حسین نے خود پر لگایا گیا ہر الزام نہایت خاموشی سے قبول کر لیا اس نے سرکاری وکیل کی مدد لینے سے بھی انکار کر دیا۔ جس کے سبب جلد ہی اسے سزا سنائی دی گئی اور اس وقت جب ساری دنیا غلام حسین پر تھو تھو کر رہی تھی۔ صرف دو لوگ ایسے تھے جنہیں اس کی بے گناہی پر خود سے بھی زیادہ یقین تھا ایک تو اس کی اپنی سگی بیٹی فیما اور دوسرا اس کا عزیز ترین دوست نورالدین۔ فیما چاہتے ہوئے بھی کبھی اپنے باپ سے ملنے نہ جا سکی مگر اخبارات میں شائع ہونے والی اس کی ہر تصویر کا تراشہ وہ ضرور سنبھال کر اپنے پاس رکھ لیتی شاید اسے یقین تھا کہ زندگی کے کسی بھی مقام پر اپنے باپ کی تلاش کے سفر میں یہ اخباری تراشے اس کی ضرور مدد کریں گے۔
جہاں تک نورالدین کا تعلق تھا وہ اپنے دوست سے ملنے کئی بار جیل گیا تھا مگر اوہنی لاکھ کوشش کے باوجود غلام حسین سے نہ مل سکا جس کی سب سے بڑی وجہ خود غلام حسین تھا جس نے نورالدین سے ملنے سے ہی صاف انکار کر دیا تھا شاید اتنی بے عزتی اور ذلت کے بعد وہ خود میں نورالدین کا سامنا کرنے کی ہمت نہ پا رہا تھا بحرحال جو بھی تھا اس کے اس طرح انکار کے باوجود نورالدین بھی

بھی اپنے دل سے مستری غلام حسین کو نہ نکال سکا وہ اپنے سادہ لوح دوست اور اس کی کمی کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ وقت گزرنے کی دھند نے سب کچھ دھندلا دیا لوگ غلام حسین کے ساتھ اس قصہ کو بھی بھول گئے ویسے بھی اب فرحین وہ محلہ چھوڑ کر جا چکی تھی کہاں؟ یہ کوئی نہ جانتا تھا عام طور پر خیال کیا جا رہا تھا کہ شاید اپنی بدنامی او جگ ہنسائی کے خوف سے وہ دنیا کی نظروں سے چھپ گئی ہے، مگر یہ بات کوئی نہیں جانتا تھا جن بلندیوں پر پہنچنے کے لیے اس نے غلام حسین کو اپنے راستہ سے ہٹایا ہے ان کا حصول اس محلے کی کچی پکی گلیوں اور ٹوٹے پھوٹے مکانات سے نجات حاصل کیے بغیر ممکن ہی نہ تھا۔

☆......☆......☆

جوہی نے جلدی ہی شہلا کے توسط سے اپنا کام شروع کر دیا تھا شہلا کی دی ہوئی کلائنٹس کے علاوہ بھی اسے چند ایک بیگمات کا کام مل گیا اور کم از کم اسے اتنی آمدنی ضرور ہوئی کہ تقریباً دو ہی ماہ میں اس نے آپا کے ساتھ مل کر مکان کا کرایہ ادا کر دیا بہت نہ سہی مگر زندگی پہلے کے مقابلے میں کچھ سہل ہو گئی مگر جانے کیوں اس سب کے باوجود وہ جلد ہی اس مشقت سے تھکنے سی لگی بسوں کا سفر بس اسٹاپ سے اندر سوسائٹیوں میں اپنے مطلوبہ بنگلہ تک بھری دوپہر میں سامان کے ساتھ پیدل چلنا۔

اس کے صبر کا امتحان بن گیا ایسے میں جب وہ شہلا کا شاہانہ طرز زندگی دیکھتی تو تھوڑا سا الجھ جاتی جتنی ماہانہ آمدنی اس کی ہو رہی تھی۔ اسے اگر دس گناہ بھی کر دیا جاتا تو بھی شاید آئندہ کئی سالوں تک وہ ایسا طرز زندگی نہ اپنا سکتی جو شہلا نے اختیار کر رکھا تھا۔ بڑی سی گاڑی ڈرائیور سمیت، لگژری فلیٹ، حائی کلاس اسکولوں میں پڑھتے ہوئے اس کے بچے، قیمتی ملبوسات، مہنگی ہوٹلنگ، جبکہ اس کا شوہر رضا ایک معمولی سا سیلز مین تھا پھر وہ کون سا الہ دین کا چراغ تھا جس کی مدد سے شہلا نے یہ سب کچھ حاصل کر لیا تھا اور پھر جلد ہی اس کی یہ الجھن بھی دور ہو گئی اسے پتہ چلا دنیا کی اس بھیڑ میں اس کی ماں جیسی آسائشات کی ماری عورتیں جگہ جگہ موجود ہوتیں ہیں فرق صرف اتنا تھا کہ شہلا کے معاملے میں اس کا شوہر خود اس کا دست راست تھا۔ صرف دنیاوی آسائشوں نے اس کی آنکھ اور کانوں کو بند کر دیا تھا اسے شاید اپنی بیوی کی کسی بھی سرگرمی پر اعتراض اس لیے نہ تھا کہ وہ ایک بھاری رقم گھر لا رہی تھی جس کی بدولت اس کی زندگی میں بہت سی آسانیاں تھیں اور ان ہی آسانیوں نے رضا کے دل میں حلال اور حرام کے فرق کو یکسر ختم کر دیا تھا۔ ان ہی بنگلوں میں سروس فراہم کرتے ہوئے جوہی کو دنیا کی کئی تلخ حقیقتوں کا اندازہ بھی ہو گیا ان سنگلاخ اور بڑی بڑی دیواروں کے پیچھے موجود بھوکے بھیڑیے ہر وقت دانت نکوسے اپنے شکار کے منتظر رہتے تھے۔ جن سے اپنا دامن بچا کر نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا ان بھیڑیوں کا مقصد صرف اور صرف اپنی خوراک کا حصول تھا اس سلسلے میں اس کا کوئی معیار نہ تھا اور وہ جو اپنا آپ دلدل میں گرنے سے بچانے کے لیے اندھا دھند سفر کر رہی تھی راستے میں آنے والی چھوٹی چھوٹی کھائیوں سے خود کو بچا نہ پائی شاید یہ اس کی ماں کے کیے کی سزا تھی جس کا بھگتان باوجود کوشش کے اسے ہی بھرنا تھا شاید اس کی ماں کے کالے کرتوں اور زمانے کی دی ہوئی رسوائیوں نے

اُسے معاشرے میں عزت دار مقام کے قابل ہی نہ چھوڑا تھا۔

☆......☆......☆

سخت گرمی سے اس کی آنکھ کھل گئی، کمرے کا پنکھا بند تھا شاید لائٹ چلی گئی تھی پسینہ سے اس کی قمیض بھیگ کر اس کے جسم سے چپک گئی وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی ایک دم ہی اس کی نگاہ کمرے کے کھلے دروازے پر پڑی، جہاں چاند کی روشنی میں کھڑا دھندلا سا ہیولہ جانے کس کا تھا اس کے قدم قامت کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ وہ کوئی مرد تھا جبکہ اس گھر میں سوائے عورتوں کے کوئی مرد نہ تھا کون ہے وہاں......؟ دل ہی دل میں خوفزدہ ہوتے ہوئے وہ دھیرے سے بولی۔

سامنے کھڑے شخص نے کوئی جواب نہ دیا اس کی خاموشی سے وہ مزید خوف زدہ ہوگئی اسے سمجھ نہ آیا کہ یہ شخص گھر کے اندر داخل کس طرح ہوا؟

کون ہو تم......؟ جواب کیوں نہیں دیتے؟

اب اس کی آواز ہلکی سی چیخ سے مشابہہ تھی۔

ایک دم باہر سے تیز بجلی چمکی جس کی روشنی سے کمرا نہا گیا، اس شخص پر پڑنے والی روشنی نے اس کے خدوخال کو بالکل واضح کر دیا جسے دیکھتے ہی مارے خوف دہشت کے اٹھ کھڑی ہوئی اس کی ٹانگیں بری طرح کپکپا رہی تھیں۔

بابا۔ایک سرسراتی ہوئی ناقابل یقین سی آواز اس کے حلق سے برآمد ہوئی سامنے کھڑے شخص سے اسے کوئی جواب نہ دیا اس شخص کی آنکھوں میں جھلکنے والی واضح نفرت اتنے فاصلے سے بھی محسوس کی جاسکتی تھی۔

پلیز بابا مجھے معاف کر دو باہر ہونے والی تیز بارش اور بادلوں کی گرج میں اس کی آواز کہیں دب سی گئی وہ لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھی اور سامنے کھڑے شخص کے قدموں میں جا بیٹھی۔ مجھے معاف کر دو بابا میں تمہاری گناہ گار ہوں جو سزا چاہے دے دو مگر دل سے معاف کر دو دیکھو بابا تم پر لگائے گئے بہتان کے سبب میں کتنی اذیت و تکلیف میں مبتلا ہوں۔'' روتے روتے اس نے اپنے جزام زدہ ہاتھ سامنے کی طرف پھیلا دیے اس کی آنکھوں میں آئی نمی اور کمرے میں چھائی تاریکی کے سبب سامنے کا منظر بالکل دھندلا گیا۔ مگر وہ مسلسل کرلاتے ہوئے فریاد کر رہی تھی۔

''شاید تمہارے معاف کر دینے سے مجھے میرا اللہ بھی معاف کر دے اور میری یہ تکلیف اور اذیت کس قدر کم ہو جائے جس میں جانے میں کب سے گھری ہوں یا دعا کرو بابا میں مر جاؤں...... گھٹنوں میں سر دیے وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

کیا ہوا ہے تمہیں کیوں اتنی رات گئے اس طرح رو رہی ہو۔

ماسی سکینہ کی آواز سن کر اس نے یک دم اپنا سر اوپر اٹھایا اور سامنے نظر ڈالی دروازے کی چوکھٹ خالی تھی وہاں کوئی نہ تھا۔

ماسی میرا بابا...... وہ ہچکیوں کے ساتھ بمشکل بولی۔

کیا ہوا ہے تمہارے بابا کو؟ ماسی سکینہ وہیں دو زانو ہو کر اس کے قریب بیٹھ گئی میرے بابا سے کہو کہ وہ مجھے معاف کر دے ماسی تاکہ میں آسانی سے مر سکوں کیونکہ جب تک وہ مجھے معاف نہیں کرے گا، میں اس اذیت ناک زندگی سے نجات نہ پاسکوں گی ماسی مجھے پورا یقین ہے اس کے معاف کرتے ہی میرا اللہ بھی مجھے معاف کر دے گا۔

وہ بلک بلک کر رو رہی تھی باہر بارش مزید تیز ہوگئی جس کی ہلکی ہلکی بوندیں ہوا کے ساتھ کمرے کے اندر داخل ہو کر اس کے جسم سے بھی ٹکرا رہی تھی ماسی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی ہے......؟ پھر بھی اس کا دل، اس لڑکی کے دکھ و تکلیف کو دیکھتے ہوئے بھر سا آیا اور اس نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اب جو اس قدر ٹوٹ کر بکھری کہ ماسی سکینہ سے بھی سنبھالنا دشوار ہو گیا۔

☆......☆......☆

فرحین ایک پوش ایریا کے فرنیشڈ فلیٹ میں شفٹ ہوگئی جہاں آتے ہی اس کا طرز زندگی یکسر بدل گیا بالوں کی کٹنگ، رنگین ڈائی، سلیولیس قمیض اور میک اپ سے بھرپور، چہرہ شاید اسے اس بدلے حلیہ کے ساتھ اگر کبھی غلام حسین بھی دیکھ لیتا تو نہ پہچانتا اسے دیکھ کر کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ یہ مستری غلام حسین کی بیوی ہے۔ ماریہ غالباً کسی آفس میں پرسنل سیکریٹری کے طور پر جاب کر رہی تھی۔ دوپہر میں اسے ایک بڑی سی گاڑی ڈرائیور سمیت لینے آتی اور پھر آدھی رات کو فیھا کے سونے کے بعد وہ واپس آتی کبھی کبھی فیھا کو اپنی ماں پر حیرت ہوتی جسے اپنی جوان بیٹی کے آدھی رات تک گھر سے باہر رہنے پر کوئی تشویش نہ ہوتی ماریہ کی شارٹ ٹاپس اور فٹنگ والی جینز دیکھ کر فیھا کو اکثر ہی اپنا باپ یاد آتا پانچ وقت کا نمازی پرہیزگار غلام حسین جس کی اولاد میں ماریہ جیسے لوگ بھی شامل تھے مگر شاید ماریہ غلام حسین سے زیادہ فرحین کی بیٹی تھی اس لیے ہی اس کے رنگ میں رنگی نظر آتی تھی۔ فیھا اور احسن کا داخلہ شہر کے اچھے اسکولوں میں ہوگیا جس کی فیس یقیناً ماریہ ہی بھرتی تھی جواہر نے ایک اچھے پارلر بیوٹیشن کے کورس کے لیے داخلہ لے لیا۔ فرحین کی دوستی آج بھی نشاء سے برقرار تھی جس کے ساتھ اکثر ہی وہ دو تین دن کے لیے گھر سے غائب ہو جاتی اور پھر جب واپس آتی خوب لدی پھندی ہوتی مگر آج بھی جانے کیا بات تھی وہ جب بھی فیھا کے لیے کچھ لے کر آتی فیھا اسے خاموشی سے اٹھا کر اپنی الماری میں لاک کر دیتی فیھا اس گھر میں رہتے ہوئے صرف وہ ہی چیز استعمال کرتی جو اس کے لیے ناگزیر تھی ورنہ وہ ابھی بھی اس طرز زندگی کی عادی نہ ہوئی تھی یا شاید ہونا ہی نہ چاہتی تھی۔ اسے آج بھی اپنا پرانا گھر، محلہ، اپنا باپ اور اس کے ہاتھ کے نوالے جب کبھی یاد آتے وہ بے چین ہو کر اٹھتی اور ہر نماز کے بعد اپنے باپ کی خیریت کی دعا ضرور مانگتی جبکہ اس کے علاوہ گھر میں شاید کسی کو یاد ہی نہ تھا کہ ان کو اس دنیا میں لانے کا سبب غلام حسین ہی کا وجود تھا۔ جس سے وہ سب یکسر بے خبر تھے۔

☆......☆......☆

دیکھو جو بھی میری بات کا برا مت ماننا، مگر جس طرح تم کام کر رہی ہو اس طرح تو یقیناً تمہاری ساری زندگی گزر جائے گی اسی طرح دھکے کھاتے ہوئے۔

شہلا نے اسے نرسان سے سمجھاتے ہوئے بولی۔

تو پھر...... وہ تھوڑا سا تنک کر بولی کیونکہ وہ سمجھ چکی تھی کہ شہلا کی اس ساری تمہید کا مقصد کیا ہے۔

تو پھر یہ کہ ملک صاحب کی بات مان لو، دیکھو جب تم ان کی بیگم کا مساج کر سکتی ہو تو پھر ملک صاحب کا کرنے میں کیا حرج ہے اور پھر تمہیں تو بیگم ملک نے خود کہا ہے اور اس کام کا معاوضہ بھی تمہیں دوگنا ملے گا کیونکہ عورتوں کے مقابلے میں

مرد اپنے مساج کا معاوضہ زیادہ دیتے ہیں اور اگر وہ تم سے خوش ہو گئے تو سمجھو پھر تو تمہارے وارے نیارے ہو جائیں گے۔

شہلا کی بات سنتے ہی جوہی کو کرنٹ سا لگا، اور اس نے بے یقینی سے اس کی جانب تکا آہستہ آہستہ بلی تھیلے سے باہر آ رہی تھی۔ شہلا کے شاہانہ طرز زندگی کا راز کھل کر اس کے سامنے گیا مگر پھر بھی وہ شہلا کے منہ سے سب کچھ سننا چاہتی تھی۔

مطلب تمہارے نزدیک بیگم صاحبہ اور ملک صاحب کے میں کوئی فرق ہی نہیں ہے......؟

وہ استہزائیہ انداز میں بولی۔

تمہیں اندازہ ہے تم کیا کہہ رہی ہو؟ اس طرح کام کرنے سے تو زیادہ اچھا یہ ہے کہ میں کسی پارلر میں جاب کر لوں کم سہی مگر عزت کی زندگی تو نصیب ہو گی۔

بحر حال تمہاری جو مرضی آئے تو تم کرو میں تم پر کوئی زبردستی نہیں کر رہی میرا کام تو صرف تمہیں سمجھانا تھا آگے تمہارا کام ہے جسے تم جیسے بہتر سمجھو میرے پاس ایسی لڑکیوں کی کمی نہیں ہے جو یہ سب کام بخوشی کرنے پر تیار ہیں اور پھر کیوں نہ ہوں انہیں اس کام کا معاوضہ بیگمات کے سروس چارجز کے مقابلے میں کہیں زیادہ ملتا ہے۔"

خیر اپنے ضمیر کی بات ہے اگر مجھے یہ سب کچھ کرنا ہوتا تو یقیناً میں بہت پہلے ہی کر لیتی اس کے لیے مجھے شرجیل جیسے شخص سے شادی کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

جوہی اپنی بات پر برقرار رہتے ہوئے اٹل لہجہ میں بولی۔

دیکھو جوہی میری بات کا برا مت ماننا میں نے جو کچھ تمہیں سمجھایا وہ سب شرجیل کے کہنے پر ہی کیا ورنہ میرا تم سے کوئی ذاتی مفاد وابستہ نہیں ہے، تمہارا شوہر خود یہ چاہتا ہے کہ وہ تم وہ سب کام کرو جس سے زیادہ روپیہ کمایا جا سکے وہ تمہارے ذریعے دنوں میں امیر ترین ہونا چاہتا ہے اب اگر تم یہ سب نہیں کرنا چاہتی تو اپنے میاں کو سختی سے سمجھاؤ تاکہ وہ دوبارہ اس سلسلے میں مجھے تنگ نہ کرے۔

جوہی کی باتوں نے شہلا کو تھوڑا سا غصہ دلا دیا جس کے سبب وہ شرجیل کا نام لے بیٹھی ورنہ تو شرجیل نے تو اسے یہ سب نہایت رازداری سے کرنے کا کہا تھا۔

"واٹ ڈو یو مین۔" شہلا کی بات ختم ہوتے ہی جوہی غصہ سے چلائی۔

تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ شرجیل نے تمہیں کہا تھا کہ میں مردوں کا مساج کروں اور ان کے ساتھ ساتھ ان کے وہ تمام گھٹیا مطالبے پورے کروں جس کی امید وہ مجھ سے کر رہے ہوں۔

بے یقینی، غصہ، تاسف یہ سب جوہی کے اندر سے جھلک رہا تھا۔

آف کورس یقیناً ایسا ہی ہے ورنہ مجھے کیا ضرورت پڑی تھی جو تمہارے ساتھ اس طرح مغز ماری کرتی اینی وے جو جیسے چل رہا ہے اسے اسی طرح چلنے دو بلکہ میرا مشورہ مانو تو اس طرح گھر گھر دھکے کھانے سے اچھا ہے کہ تم کسی پارلر میں جاب کر لو۔

اسے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتی شہلا اٹھ کھڑی ہوئی۔

اچھا اب میں چلتی ہوں۔ ہوں اللہ حافظ۔

جوہی کو ہاتھ ہلاتی وہ تیزی سے باہر نکل گئی جبکہ اس کی باتوں نے جوہی پر کھولتا ہوا تیل ڈال دیا اس کا دل یہ ماننے کو تیار ہی نہ تھا کہ شرجیل اتنے گھٹیا کام کے لیے اسے شہلا کے ذریعے

کھلوائے گا۔
یقیناً شہلا جھوٹ بول رہی ہے تا کہ میرے اور شرجیل کے درمیان اس مسئلے کو لے کر اختلافات جنم لیں۔
اپنے دل کو جھوٹی تسلیوں سے بہلاتے ہوئے اس نے سوچا مگر جلد ہی اس کی یہ غلط فہمی دور ہوگئی شہلا نے جو کچھ شرجیل کے حوالے سے کہا تھا وہ سو فیصد سچائی پر مبنی تھا جس کا اندازہ آنے والے چند دنوں میں ہی اسے ہوگیا ایسے میں اس کا دل چاہا یا تو وہ خودکشی کرلے یا پھر شرجیل کو ہی قتل کردے مگر وہ ان میں سے کوئی بھی کام نہیں کرسکتی تھی کیونکہ وہ فطرتاً ایک بزدل عورت تھی جس کا علم شاید شرجیل کو بھی تھا۔

☆......☆......☆

تمہارے باس نے تو وعدہ کیا تھا تمہیں جلد ہی بنگلہ میں شفٹ کردے گا اور جانے کتنے ماہ ہوگئے اس بات کو وہ تو شاید وعدہ کر کے بھول ہی گیا مگر تمہیں تو یاد ہے نا تم کیوں نہیں اس سے کہتیں کہ تمہیں اپارٹمنٹ کی زندگی بالکل پسند نہیں ہے۔
کھانا کھاتی فیما نے یک دم چونک کر اپنی ماں کی جانب تکا۔ جس کا مخاطب یقیناً ماریہ تھی جو ٹانگ پر ٹانگ دھرے اطمینان سے صوفہ پر بیٹھی اپنی گاڑی اور ڈرائیور کا انتظار کررہی تھی جو اسے آفس کے لیے پک کرنے آتی تھی فیما کو اس کے ہاتھ میں سلگتے سگریٹ کو دیکھ کر بالکل بھی حیرت نہ ہوئی۔
وہ ماریہ کے اس لائف اسٹائل کی اب عادی ہوچکی تھی۔
''خبیث بڈھا کہتا ہے کہ پہلے میں اس کے ساتھ کچھ دنوں کے لیے لندن ہو آؤں پھر وہ واپسی پر مجھے بنگلہ گفٹ کرے گا۔

ماریہ نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے عجیب سا منہ بنایا۔
''ہاں تو چلی جاؤ اب اس میں حرج ہی کیا ہے تم کب سے تو اسے جانتی ہو۔
فرحین کی بات سنتے ہی فیما کا نوالہ حلق میں پھنس گیا۔ اس نے فوراً اپنے سامنے رکھے کھانے کو ہاتھ سے پرے دھکیلا۔ اور کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی اپنی ماں سے شدید ترین نفرت کے اظہار نے اس کے جسم کے رواں کو کھڑا کردیا تھا۔
''جانتی ہوں آپ کا کیا مطلب ہے مما۔''
ماریہ نے ہلکا سے ہنستے ہوئے فرحین کو مخاطب کیا دونوں میں سے کسی کی بھی توجہ فیما کی جانب نہ تھی ایسے جیسے وہ اس کی لاؤنج میں موجودگی سے یکسر لاعلم تھیں۔''
''تمہارا باس اچھا خاصا شریف سا بندہ ہے اب لندن لے جا کر کون سا اس نے تمہیں کھا جانا ہے، جو تم نخرے دکھا رہی ہو اچھا ہے اسی بہانے لندن بھی گھوم آؤ گی۔
اب فیما کے لیے وہاں کھڑے رہنا خاصا دشوار ترین ہوگیا تھا۔ وہ تیزی سے لاؤنج کے باہر کھلنے والی دروازے کی سمت لپکی ہی تھی کہ اس کے قدم پیچھے آنے والی ماریہ کی آواز نے جکڑ لیے۔
تمہارا کالج میں ایڈمیشن ہوگیا ہے ایڈمیشن سلپ تمہارے کمرے میں رکھی ہے۔ شام کو تیار رہنا یونیفارم اور کتابوں کے لیے جانا ہے ڈرائیور تمہیں پک کرلے گا اس نے پلٹ کر ایک نظر اپنی خوبصورت سی بہن پر ڈالی جس کی جوانی کو شاید گہن سا لگ گیا تھا اسے محسوس ہوا ماریہ نے یہ سب اسے محض جتانے کے لیے کہا ہے مگر ماریہ کے چہرے پر ایسے کوئی تاثرات نہ تھے۔

اچھا...... وہ مختصر سا جواب دے کر باہر نکل گئی کبھی کبھی اسے ماریہ پر ترس بھی آتا جو محض اپنی ماں کی نفسانی خواہشوں کی خاطر قربان ہو رہی تھی مگر دوسرے ہی پل اس کا یہ ترس غصہ میں تبدیل ہو جاتا جب اسے ماریہ کا اپنے باپ پر لگایا ہوا الزام یاد آتا جس کی بدولت وہ سب آج ایک ایسی زندگی گزارنے پر مجبور تھے جو اوپر سے تو نہایت خوبصورت تھی مگر اندر سے گندی، بدبودار اور نہایت ہی گھناؤنی۔

☆......☆......☆

دیکھو جوہی آج میں تمہاری یہ غلط فہمی دور کر دوں کہ میں نے تم سے شاید محبت کی تھی جبکہ ایسا کچھ نہ تھا مجھے تم سے کبھی بھی کوئی محبت نہ تھی۔

جوہی سر جھکائے شرجیل کی باتیں سن رہی تھی اس کا دل بھی نہ چاہا کہ وہ سر اٹھا کر سامنے کھڑے اس شخص کے مکروہ چہرے پر ایک نظر بھی ڈالے دراصل میں نے تم سے شادی صرف اس لیے کی کہ تم فرحین اور غلام حسین جیسے لوگوں کی اولاد ہو ظاہر ہے خون کا کچھ نہ کچھ اثر تو تم میں بھی ہوگا۔

شرجیل کے استہزائیہ لہجہ سے زیادہ حیرت انگیز اس کی زبان سے نکلنے والا فرحین کا نام تھا جس نے ساکت بیٹھی جوہی کو چونک اٹھنے پر مجبور کر دیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے اپنا سر اوپر اٹھا کر شرجیل کی جانب تکا اسے سوچنے پر بھی یاد نہ آیا کہ کبھی اس نے شرجیل کے سامنے اپنی ماں کا نام لیا ہو پھر شرجیل اس کی ماں کو کیسے جانتا تھا۔

ایسے حیرت سے مت دیکھو۔ میرا تعلق تمہارے پرانے محلے سے بھی رہا ہے میرا باپ نورالدین تمہارے باپ کا ایک اچھا دوست رہا ہے۔

اور وہ جب تک زندہ رہا ہمیشہ تمہارے باپ کا دکھ سنتا رہا۔

جوہی نے شاید یہ نام کبھی بھی نہ سنا تھا کیونکہ وہ اپنے باپ اور اس کی زندگی سے تعلق رکھنے والی ہر چیز سے ہمیشہ لاعلم رہی تھی۔ وہ نشا کو بچپن سے جانتی تھی مگر نورالدین کا نام اس کے لیے بالکل نیا تھا۔

اگر تم نورالدین کے بیٹے ہو تو یقیناً یہ جانتے ہو گے کہ میرا باپ ایک نہایت شریف انسان تھا اور اس پر لگائے گئے تمام الزامات غلط تھے۔"

جو بھی تھا وہ کم از کم اپنی دفاع کے لیے اپنے باپ کی شرافت کو ضرور استعمال کر سکتی تھی اور اس نے ایسا ہی کیا۔

اپنے باپ کو چھوڑ دو وہ بے چارہ تو تم لوگوں سب کب کا موت کی آغوش میں سو گیا ہوگا۔ ہاں اپنی ماں کی بات کرو جس کے ساتھ رہ کر تم جوان ہوئی ہو اور پھر بھی تمہیں وہ سب باتیں مانتے ہوئے موت آ رہی ہے جو تمہیں شہلا نے سمجھائیں آخر وہ بھی تو یہ سب کرتی ہے نا صرف اپنے گھر کے سکون کے لیے تو پھر تم کیوں نہیں کر سکتیں۔

دیکھو جوہی میرا مقصد صرف ایک اچھی اور پرتعیش زندگی ہے اور اگر اس سلسلے میں تم میرے کسی کام آ نہیں سکتیں تو پھر تم میری طرف سے آج ہی آزاد ہو اپنی ماں کے گھر جا سکتی ہو اور یقیناً وہاں بھی تمہیں وہ سب کرنا پڑے گا جس کی ڈیمانڈ میں تم سے کر رہا ہوں اور پھر کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ تم جو کچھ بھی کرو کم از کم ایک مرد کا نام تو تمہارے نام کے ساتھ ہوگا۔ بغیر مرد کے یہ سب کرنے والی دھندے والی عورتیں کہلاتی ہیں جب کہ مرد کے نام کے ساتھ جو دل میں آئے کرو کوئی تم پر انگلی اٹھانے والا نہ ہوگا اب فیصلہ تمہارے اختیار میں ہے جو بہتر سمجھو کرو اگر میری بات نہیں مانی تو

میرے گھر واپسی سے قبل اپنی ماں کے گھر چلی جانا میں جلد ہی طلاق نامہ بھیج دوں گا۔

یہ سب کہہ کر وہ رکا نہیں دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے موجود جوہی کے پاس فیصلہ کرنے کا کوئی اختیار باقی نہ رہا، اس کے آگے اگر کھائی تھی تو پیچھے بھی خندق تھی گرنا تو دونوں ہی صورتوں میں تھا تو پھر قدم آگے ہی کیوں نہ بڑھائے جائیں شاید کہیں کوئی بہتری کا راستہ نکل آئے یہ سب سوچتے ہوئے اس نے شرجیل کی بات ماننے کا فیصلہ کرلیا ویسے بھی وہ شروع سے اچھے ہی کی امید سے زندگی گزار رہی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ جس دل میں امید نہیں اس دل میں خدا نہیں ہوتا اور اتنے سب کے باوجود وہ بھی بھی خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہوئی تھی اسے یقین تھا وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی رحمتوں سے ضرور فیض یاب ہوگی مگر کب یہ وہ نہ جانتی تھی۔

☆......☆......☆

اسے دو دن سے بخار تھا جس کے باعث وہ آج کالج بھی نہ گئی تھی۔ یہ ہی سبب تھا جو دو پہر ایک بجے تک بے خبر سوتی رہی کسی نے اسے آکر جگانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی ویسے بھی فرحین دو دن قبل ہی نشا کے ساتھ اسلام آباد گئی تھی جواہر بھی غالباً پارلر جا چکی تھی ماریہ کا کمرہ بند تھا اس کے بارے میں کچھ کنفرم نہ تھا کہ وہ گھر میں ہے بھی یا نہیں فیہا نے بمشکل منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور قدم گھسیٹتی لاؤنج سے ہوتی کچن کی جانب آگئی جہاں سکینہ سنک میں کھڑی برتن دھو رہی تھی۔

جی بی بی جی کچھ چاہیے آپ کو؟

فیہا پر نظر پڑتے ہی وہ برتن چھوڑ کر اس کی جانب لپکی ویسے بھی اس سارے گھر میں اسے فیہا ہی سے انسیت تھی جس کا اظہار وہ وقتاً فوقتاً کرتی رہتی تھی۔

ہاں ایک کپ چائے بنا دو۔ نقاہت سے جواب دیتی وہ آہستہ سے واپس پلٹی۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟

سکینہ کے لہجہ میں جھلکتی بے چینی نے فیہا کے دل کو دکھی کر دیا کاش اتنی بے چینی سے یہ سوال مجھ سے کبھی میری ماں نے بھی کیا ہوتا۔

اسے اچھی طرح یاد تھا فرحین نے کبھی بھی ان باتوں پر توجہ نہ دی تھی ان کی بیماری، اسکول کا رزلٹ، عید، شب برات کے حوالے سے ان کی تیاریاں غرض فرحین کو ان تمام باتوں سے کبھی کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔

نہیں شاید مجھے بخار ہے۔ جب وہ بولی تو آواز رندھی ہوئی تھی۔

''اچھا آپ یہیں لاؤنج میں صوفہ پر لیٹ جاؤ ناشتہ کے بعد میں ڈرائیور کے ساتھ آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتی ہوں۔ سکینہ اسے کہہ کر واپس کچن میں چلی گئی۔ جبکہ وہ دھیرے دھیرے سے چلتی لاؤنج میں دھرے صوفہ کے قریب پہنچی نہ تھی کہ فون کی بیل بج اٹھی۔

جانے اس وقت کس کا فون آیا تھا؟ اس نے بے زاری سے سوچا پہلے تو چاہا کہ بیل بجتی رہی اور وہ فون ہی ریسیو نہ کرے مگر اگلے ہی پل جانے کیا سوچ کر اس نے آہستگی سے ریسیور اٹھالیا۔

ہیلو......دھیمی آواز جس میں نقاہت گھلی ہوئی تھی۔

السلام وعلیکم مجھے مسز فرحین سے بات کرنا ہے۔

نہایت ہی شائستہ انگریزی میں دوسری

طرف سے بولنے والی ہستی کا تعلق کسی بھی طرح فرحین یا ماریہ کے حلقہ احباب سے نہ تھا۔اس کا اندازہ صرف ایک ہی جملے سے فیھا کو ہو چکا تھا۔

جی وہ تو گھر نہیں ہے۔ فیھا کا جواب بھی انگریزی میں ہی تھا۔

اوہ آپ کون ہیں؟ دراصل میں احسن کے اسکول سے بات کر رہی ہوں اور شاید یہ میرا تیسرا فون ہے مگر اتفاق کی بات ہے کہ ابھی تک میری ان کی والدہ سے بات نہیں ہو سکی۔

"احسن کے اسکول یہ الفاظ سنتے ہی فیھا کا تمام جسم ہمہ تن گوش ہو گیا اسے احساس ہوا دوسری طرف ضرور ایسا کچھ غلط ہوا ہے جس کے لیے گھر کال کی گئی ہے۔

میں احسن کی بڑی بہن بات کر رہی ہوں آپ کو جو بھی کوئی پرابلم ڈسکس کرنی ہو آپ مجھ سے ڈسکس کر سکتی ہیں۔اس کے لہجے میں نقاہت پل بھر میں ہی غائب ہو گئی۔نہایت ہی اعتماد سے جواب دیتے ہوئے اس کی آواز پہلے سے کچھ بلند تھی۔میم ایسا ہے کہ احسن پچھلے کافی دنوں سے اسکول نہیں آ رہے اس کے علاوہ بھی کچھ اور سیریس قسم کے مسائل ہیں جس کے لیے ان کے گھر والوں سے ہمارا ملنا لازمی ہے۔اس لیے بہتر ہو گا کہ آپ اپنی والدہ سے کہیں کہ وہ جلد از جلد اسکول آ کر انتظامیہ سے ملاقات کریں بلکہ ہو سکے تو کل ہی نو بجے تک آ جائیں۔ہماری ایچ ایم ان کا انتظار کریں گی۔نہایت ہی پروفیشنل انداز میں سب کچھ کہہ کر دوسری طرف سے فون رکھ دیا گیا مگر وہ جو کوئی بھی تھی اس کے الفاظ نے فیھا کو جلتے توے پر بٹھا دیا۔احسن اسکول نہیں جاتا۔ان الفاظ نے فیھا کے سارے جسم سے جان کھینچ لی اپنے باپ کے بعد احسن وہ واحد فرد تھا گھر میں جس سے فیھا بے تحاشہ محبت کرتی تھی۔اسے اچھی طرح یاد تھا احسن روزانہ صبح اس کے ساتھ ہی گھر سے نکلتا تھا اس کا اسکول راستہ میں آتا تھا۔جہاں رش کے سبب ڈرائیور اسے تھوڑا پیچھے ہی اتار کر گاڑی دوسری سڑک پر ڈال دیتا تھا جہاں فیھا کا کالج تھا۔ایسے میں احسن کا سکول نہ جانا ایک حیرت انگیز اور اذیت ناک امر تھا۔جس پر وہ جتنا سوچتی اتنا ہی اس کا سر دکھتا یہاں تک کہ اسے سائیڈ ٹیبل پر موجود ناشتہ کرنے کا بھی خیال نہ تھا۔

احسن اگر اسکول نہیں جاتا تو کہاں جاتا ہے اس بے چینی میں وہ اپنی بیماری اور ڈاکٹر سب بھول گئی تھی۔اسے یاد رہا تو صرف اتنا کہ کل ہر حال میں اسے احسن کے اسکول جانا ہے ظاہر ہے فرحین تو یہاں نہ تھی پھر وہ اپنے ساتھ کسے لے کر جائے گی؟

اور پھر جلد ہی اس کا یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا رات اپنی کالج کی فرینڈ ہدیٰ سے بات کرتے ہوئے جب اس نے اسے یہ سب بتایا تو وہ فوراً ہی اپنی امی کو اس کے ساتھ جانے کے لیے آمادہ کر بیٹھی اور اس طرح اگلے دن فیھا، ہدیٰ کی والدہ کے ساتھ احسن کے اسکول جا بیٹھی احسن کے سلسلے میں ہونے والے انکشافات نے اسے اندر تک ہلا دیا۔

☆......☆......☆

ابھی اس کی آنکھ ہی لگی تھی کہ باہر سے آنے والے تیز ہارن کی آواز پر یک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی بے اختیار ہی سامنے گھڑی پر نظر ڈالی دو بج کر بیس منٹ ہو چکے تھے۔اس وقت باہر کون آیا ہے یہ ہی سوچ کر وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھولتی باہر ٹیرس پر آ گئی جہاں سے بالکل سامنے ہی مین گیٹ دکھائی دیتا تھا۔گیٹ کے عین سامنے بڑی

کالی گاڑی کھڑی تھی ۔ جس کے کالے شیشے مکمل طور پر بند تھے بنا پوچھے ہی وہ جان چکی تھی کہ ماریہ اپنے باس کے ساتھ گھر واپس آئی ہے اکثر و بیشتر ہی رات کے اس پل اس کا باس اسے واپس چھوڑنے آتا ورنہ عام طور پر اس کا پک اینڈ ڈراپ ڈرائیور کی ذمہ داری تھا۔ فیما کو حیرت اس بات پر ہوئی کہ ماریہ سارا دن اپنے باس کے ساتھ گزار کر جب آدھی رات کو واپس آتی تو گاڑی کے اندر ہی پندرہ بیس منٹ تک جانے وہ دونوں کیا راز و نیاز کرتے رہتے جو انہیں روڈ پر چھائی گہری تاریکی سے بھی خوف محسوس نہ ہوتا ابھی بھی ایسا ہی ہوا تقریباً دس منٹ سے گاڑی گیٹ کے سامنے موجود تھی مگر ماریہ ابھی تک باہر نہیں آئی تھی شیرو گیٹ کھول کر ایک سائیڈ پر ہو کر کھڑا ہو گیا جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا فیما کو عجیب سی الجھن اور بے زاری نے گھیر لیا کچھ تو وہ احسن کی وجہ سے پریشان تھی کچھ جانے کیوں باہر پھیلا گہرا سناٹا اسے ہولا رہا تھا ایسے میں اس کا دل چاہا کہ اتر کر فوراً سے بیشتر نیچے جائے اور ماریہ کو کھینچ کر گاڑی سے باہر نکالے جو آدھی رات کو روڈ پر کھڑی گاڑی میں اپنے بڈھے کھوسٹ باس کو داد عیش دے رہی تھی اس سے قبل کہ وہ اپنی اس خواہش پر عمل کرتی یک دم ہی ماریہ گاڑی کا دوازہ کھول کر باہر آئی بے حد مختصر تیز سرخ رنگ کا سیلولیس بڑے سے گلے والا ٹاپ، گھٹنوں تک آئی کیپری اور ہائی ہیل نے اس کے چلنے کو خاصا نازیبا سا بنا دیا تھا جس کا احساس شاید سوائے فیما کے گھر کے کسی دوسرے فرد کو نہ تھا وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی گھر کے اندر داخل ہوئی شیرو گیٹ بند کر کے اپنے کمرے کی جانب چلا گیا جو گیٹ سے چند قدم آگے ہی بنا ہوا تھا اس کی لڑکھڑاتی چال دور سے ہی واضح طور پر دکھائی دے رہی تھی ۔ جس نے فیما کو مزید الجھا دیا اسے محسوس ہوا ماریہ نشے میں ہے وہ سگریٹ پیتی تھی اس بات کا علم تو اسے تھا مگر ماریہ رات کے اس پہر اس طرح نشہ کی حالت میں گھر آتی ہے یہ وہ نہ جانتی تھی اسی سبب بے چینی کے عالم میں وہ ٹیرس کے باہر کی سمت نکلنے والا دروازہ کھولتی ہوئی کاریڈور میں آ گئی ۔ جس کے آخری سرے پر ماریہ کا کمرہ تھا۔ اسی دم آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کرتی ماریہ عین اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

تم ابھی تک سوئی نہیں اپنی لڑکھڑاہٹ پر قابو پاتے ہوئے وہ لہرا کر بولی جس کے ساتھ ہی بدبو کا جھونکا فیما کے نتھنوں سے ٹکرایا۔ اس کے تمام تر بدترین خدشات کی تصدیق ہو گئی ماریہ یقینی طور پر نشہ کی کیفیت میں تھی اس کا دل دکھ رہا تھا۔

تم نے شراب پی ہے؟ وہ تھوڑا سا پیچھے ہوتے ہوئے آہستہ سے بولی۔

ہاں تو؟ ماریہ نے اپنے ابرو اچکاتے ہوئے سوال کیا۔

تم کیا آدھی رات کو میری جاسوسی کرنے کے لیے کھڑی ہو۔

نشہ کی حالت پر قابو کھوتے ہوئے با آواز بلند بولی ورنہ عام طور پر کبھی بھی کسی سے اس لہجہ میں گفتگو نہ کرتی تھی۔

نہیں میں تو...... فیما کی سمجھ میں نہ آیا وہ آدھی رات کو اس طرح کاریڈور میں کھڑے ہو کر ماریہ کے انتظار کرنے کی وضاحت کن لفظوں میں کرے۔

چلو ہٹو آگے سے...... اس کی پوری بات سنے بغیر ہی ماریہ نے بازو سے پکڑ کر اسے اپنے سامنے سے ہٹا دیا اور خود لڑکھڑاتی ہوئی آگے کی جانب

بڑھ گئی۔ اسے اس حال میں دیکھ کر فیھا کا غصہ دکھ اور تکلیف میں تبدیل ہو گیا ہے بے اختیار ہی اس کی آنکھیں آنسو سے بھر گئیں۔ جانے یہ بلندی کی وہ کون سی قسم تھی۔ جس پر اس کی ماں نے ماریہ کو لا کھڑا کیا تھا۔ ماریہ کی برباد ہوتی ہوئی جوانی کے احساس نے فیھا کو خون کے آنسو رلا دیا۔

☆......☆......☆

آج جوہی بہت خوش تھی کیونکہ فیھا اس سے ملنے آ رہی تھی اس نے جب سے یہ سنا تھا کہ جوہی ایک بیٹی کی ماں بن گئی ہے اس سے صبر ہی نہ ہو رہا تھا وہ جلد از جلد اپنی بھانجی کو دیکھنا چاہتی تھی۔ دوسری طرف جوہی کے لیے بھی اس کی آمد بے حد خوشی کا سبب تھی کیونکہ آج پہلی بار اتنے سالوں میں اس کے نام و نہاد میکے سے کوئی اس سے ملنے آ رہا تھا اور ویسے بھی اسے فیھا سے بہت محبت تھی گھر میں ایک فیھا ہی تھی جس سے اس نے ہمیشہ اپنے تمام احساسات و جذبات کو شیئر کیا تھا۔ وہ اس کے اور شرجیل کے تعلقات کے بارے میں سب جانتی تھی اور ہمیشہ سے ہی اس کی ہمدردیاں جوہی کے ساتھ رہیں۔ شرجیل سے شادی کے موقع پر بھی اس نے جوہی کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ اس کی آمد کی خوشی میں جوہی نے آپا کے ساتھ مل کر اس کے لیے بڑے اہتمام سے کھانا تیار کیا اس کی پسندیدہ حیدر آبادی بریانی، فرائی فش، کھٹے بیگن، سیخ کباب اور فروٹ ٹرائفل سب تیار ہو چکا تھا مگر جانے کیوں وہ اب تک نہ آئی تھی۔ گھڑی کے آگے بڑھتی سوئیاں جوہی کی بے چینی میں اضافہ کا سبب بن رہی تھیں۔ وہ دو تین بار اس کے نمبر پر فون کر چکی تھی مگر جانے کیوں اس کا سیل آف جا رہا تھا جانتے ہوئے بھی وہ گھر کے نمبر پر فون نہ کر سکتی تھی۔ کیونکہ آج چار سال گزر جانے کے باوجود اس کی ماں نہ صرف اس کی شکل بلکہ آواز سننے کی بھی روادار نہ تھی اور اس وقت جب وہ مکمل طور پر دلبرداشتہ اور مایوس ہو چکی تھی فیھا کا خود ہی فون آ گیا۔

تم اب تک کیوں نہیں آئیں۔ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔

فون ریسیو کرتے ہی وہ تیز تیز لہجہ میں بولتی چلی گئی۔

سوری جوہی میں آج نہیں آسکوں گی شاید مما کو شک ہو گیا ہے کہ میں تم سے ملنے آ رہی ہوں اسی سبب وہ نیچے لاؤنج میں موجود ہیں اور مجھے اپنے ساتھ کسی پارٹی میں لے جانے پر بضد ہیں اور ان کی اس ضد سے بچنے کا واحد حل یہ ہی ہے کہ میں اپنے کمرے سے باہر ہی نہ نکلوں۔

اوہ اس کی ساری بات کے جواب میں جوہی کے منہ سے صرف یہ ہی لفظ نکلا اور پھر اس نے بنا کچھ کہے فون بند کر دیا اور اس کے ساتھ ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی اور اس کی پل بھر پہلے والی تمام خوشی کافور ہو گئی اس سے اس کا دل چاہا کچن میں موجود تمام کھانا اٹھا کر باہر پھینک دے یہاں تک آج پہلی بار اس کے کانوں میں اس کی روتی ہوئی بچی کی آواز بھی نہ آ رہی تھی۔

☆......☆......☆

کیا تمہیں مکمل طور پر یقین ہے کہ وہ ہی شخص ہے جس کی مجھے تلاش ہے۔

وہ اپنے لہجہ کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے جب بولی تو اس کے اندر کی بے چینی اور اضطراب نوفل سے چھپا نہ رہ سکا اس نے ایک نظر اپنے سامنے موجود اس خوبصورت سی لڑکی کے صبیح چہرے پر ڈالی جہاں معصومیت کے ساتھ ساتھ بے یقینی بھی واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔

''ہاں ایک سو ایک فیصد یقین۔ وہ پر اعتماد لہجہ میں یقین دلاتا ہوا بولا۔

دراصل تم نے جو تصویر مجھے دی تھی اس کی مدد سے ایس پی وجدان نے اس شخص کو ڈھونڈ نکالا ہے۔

مگر مجھے جس شخص کی تلاش تھی وہ تو شاید لاہور کے کسی جیل میں ہونا چاہیے۔

''جب کہ تمہارا بتایا ہوا بندہ تو کسی نفسیاتی ہسپتال میں موجود ہے۔''

اسے ابھی بھی یقین نہ آرہا تھا کہ کئی سال سے جاری اس کی تلاش کا سفر غالباً چند ہی دنوں بعد ختم ہونے والا ہے۔

شاید پولیس کا تشدد یا اپنی بے غیرتی کے احساس نے اس شخص سے اس کا ذہنی توازن چھین لیا ہے جس کے سبب آج وہ پاگل خانہ میں عبرت کی تصویر بنا بیٹھا ہے مگر مجھے سمجھ نہیں آتا تم کیوں اس شخص کو تلاش کر رہی تھیں کیا رشتہ ہے تمہارا اس بے غیرت، گھٹیا اور بے ضمیر شخص سے۔''

نوفل اپنے لہجہ میں دنیا بھر کی حقارت بھرتا ہوا بولا۔

پلیز نوفل بنا کچھ جانے بغیر سوچے سمجھے کسی کے لیے بھی کوئی گھٹیا لفظ اپنے منہ سے مت نکالو۔ اس نے تڑپتے ہوئے نوفل کی بات کاٹی۔

جب تمہیں کسی بات کا کوئی علم نہیں ہے تو بے کار کے تجزیہ پیش مت کرو۔

مگر ایس پی وجدان کا تو کہنا ہے کہ.....

بکواس کرتا ہے ایس پی وجدان اور دوسرے تمام لوگ جو اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ اب وہ اپنے غصہ پر قابو نہ پاسکی اور نوفل کی بات کاٹتے ہی چلا اٹھی کول ڈاؤن یار سب لوگ تمہیں ہی دیکھ رہے ہیں۔

نوفل نے آس پاس موجود لوگوں کو اپنی جانب تکتا پا کر اسے دھیرے سے سمجھانا چاہا، جو جانے کیوں آنکھوں میں آنسو بھرے غصہ سے اس کی جانب تک رہی تھی۔

ویسے تم نے مجھے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ تمہارا اس شخص سے رشتہ کیا ہے؟

نوفل نے اپنی کچھ دیر قبل کہی ہوئی بات کو پھر سے دھرایا۔ میرا رشتہ وہ اچھنبے سے بولی۔ شاید تم نہیں جانتے وہ میرا اس دنیا میں موجود واحد خونی رشتہ ہے جس سے میں اپنے آپ سے بھی زیادہ محبت کرتی ہوں۔ یہ کہتے ہی اس نے سامنے ٹیبل پر موجود اپنا ہینڈ بیگ اٹھا لیا اور تیزی سے کرسی پیچھے کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں اب چلتی ہوں کیونکہ میری آج شام کی فلائیٹ ہے۔ تم میرے نمبر پر ایس پی کا نمبر سینڈ کردو میں اب تین دن بعد سنگا پور سے واپس آکر اس سے ملاقات کروں گی۔'' یہ سب کہہ کر وہ رکی نہیں اور تیزی سے باہر کی جانب چل دی جب کہ اس کے پیچھے موجود نوفل دیر تک وہیں بیٹھا ان الفاظ پر غور کرتا رہا جو جاتے ہوئے اس سے کہہ کر گئی تھی۔ ایک جنونی اور پاگل شخص سے اس لڑکی کا کیا رشتہ تھا؟ وہ جتنا اس بارے میں سوچتا مزید الجھتا جاتا اس کے دماغ میں موجود گرہ کھلنے میں ہی نہ آرہی تھی۔

☆......☆......☆

''یہ باہر کھڑی بلیک کار کس کی ہے؟''

شرجیل نے کمرے میں داخل ہوتے ہی بیڈ پر نیم دراز جوہی کو مخاطب کیا جو کمرے کے دروازے کھلنے کی آواز سن کر جان بوجھ کر سوتی بن گئی تھی کیونکہ اس وقت اسکا دل کسی سے بھی بات کرنے کو نہ چاہ رہا تھا۔

جوہی ...... شرجیل بھی ایک ڈھیٹ شخص تھا، اس کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر اس کے پاؤں کا انگوٹھا ہلا بیٹھا۔

کیا مصیبت ہے......؟ شرجیل کی اس بچکانہ حرکت پر اسے جی بھر کر غصہ آیا کیوں پاگلوں کی طرح چلا رہے ہو؟ کون سی قیامت آ گئی ہے۔

اب وہ پہلے والی جوہی نہ رہی تھی یہ ہی وجہ تھی جو اس کا انداز گفتگو شرجیل سے یکسر تبدیل ہو چکا تھا وہ اپنی بربادی کا ذمہ دار اسے بھی ہی سمجھتی تھی۔ جس کے سبب شرجیل کے لیے اس کے دل میں موجود محبت جانے کب کی نفرت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ مگر نفرت اور محبت کے اس کھیل سے شرجیل کو کوئی دلچسپی نہ تھی اس کا محور صرف اور صرف پیسہ تھا جو جوہی کے ذریعے دل کھول کر حاصل کر رہا تھا یہ ہی سبب تھا جو جوہی کے کہے ہوئے گھٹیا ترین الفاظ اس پر کوئی اثر نہ ڈالتے تھے۔

باہر کھڑی بلیک کرولا کس کی ہے؟

امید و ناامیدی کی کیفیت میں گھرتے ہوئے اس نے پھر سے اپنا سوال دہرایا۔ یہ دیکھے بغیر کے جوہی کے چہرے کے تاثرات میں اس کے لیے کس قدر نفرت موجود ہے۔

میری ہے؟ کیوں؟ جوہی نے چبھتے ہوئے لہجہ میں جواب دیتے ہوئے سوال کیا۔

تمہاری ...... جواب تو شرجیل کی مرضی کے عین مطابق تھا مگر پھر بھی وہ تھوڑا سا حیران ضرور ہوا کیونکہ اس گاڑی کا ذکر جوہی نے آج صبح تک اس سے نہ کیا تھا پھر کس طرح اس نے اتنی قیمتی گاڑی خرید لی۔

تمہارے پاس تو بینک میں بھی شاید اتنے پیسے ابھی نہ تھے کہ تم......

عرفان صاحب نے دی ہے۔ جوہی نے اس کی بات درمیان سے ہی کاٹ دی۔

انہوں نے کل ہی اپنے لیے نئی گاڑی خریدی تھی تو پرانی مجھے دے دی کہنے لگے تھوڑے تھوڑے کر کے پیسے ادا کر دینا۔ جوہی نے اپنے سر کے نیچے تکیہ سیدھا کیا اور لیٹ کر آنکھیں موند لیں جو اس بات کا واضح اشارہ تھا کہ اب وہ مزید کوئی بھی بات کرنے کے موڈ میں نہ تھی۔

"لاؤ ذرا چابی تو دو میں باہر کا ایک چکر لگا آؤں بلکہ ایسا کرو رومیہ کو بھی تیار کر دو اسے بھی تھوڑا گھما لاؤں۔

جوہی نے بمشکل آنکھیں کھولیں وہ ڈھیٹ شخص ابھی بھی اپنی جگہ پر جوں کا توں کھڑا تھا وہ شاید ویسے بھی بے عزتی پروف ہو چکا تھا۔ جوہی نے بنا کوئی جواب دیے خاموشی سے سائیڈ ٹیبل کی دراز کھول کر چابیاں نکالیں اور اس کے پاؤں کی جانب پھینک دیں۔ اس کے بعد تکیہ کے نیچے ہاتھ ڈال کر کچھ ٹٹولا اور چند لمحوں بعد اس کے ہاتھ میں اس کا والٹ موجود تھا جس میں سے دو چار ہرے نوٹ نکال کر اس نے اسی رفتار سے وہ بھی سامنے پھینکے کیونکہ وہ بنا کہے ہی شرجیل کا اگلا مطالبہ جانتی تھی۔ اس تمام عمل سے فارغ ہو کر اس نے کروٹ بدلی جبکہ شرجیل نے چابیاں اور نوٹ دونوں تیزی سے اٹھا کر اپنی جیب میں منتقل کیے۔ سامنے لگے قد آدم آئینہ میں کھڑے ہو کر اپنا تنقیدی جائزہ لیا، پوائزن کی بوتل اٹھا کر اچھی طرح خود پر اسپرے کیا اور سیٹی بجاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اسے پتہ تھا کہ اس وقت رومیہ عام طور پر آپا کے پاس ہوتی تھی وہ رومیہ کو اپنے ساتھ سند باد لے جانا چاہتا تھا۔ اور ایسا اکثر و بیشتر وہ صرف جوہی کو خوش کرنے کے لیے ہی کرتا تھا ورنہ اسے رومیہ سے کوئی خاص انسیت نہ تھی۔

☆......☆......☆

ماریہ پچھلے کئی دنوں سے گھر پر ہی تھی۔ جانے کیوں اس کا بخار ٹھیک نہ ہو رہا تھا شاید بدلتے موسم نے اسے بری طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا بخار کی شدت سے اس کے جسم پر لرزہ طاری جاتا غالباً اسے ملیریا ہو گیا تھا جس کے ٹیسٹ ہو رہے تھے کمزوری کے باعث اس پر غنودگی سی طاری رہتی تھی اور پسینہ بھی کثرت سے آتا اگلے دنوں میں اچھے ڈاکٹر کے علاج سے وہ کافی بہتر ہو گئی مگر کمزوری ابھی بھی تھی اسے ملیریا تو نہ تھا مگر جانے کیوں ٹھیک ہونے کے بعد بھی اس کا بدن ٹوٹا ہوا محسوس ہوتا جسے نظر انداز کر کے وہ مکمل طور پر اپنی زندگی کی روٹین کی جانب واپس پلٹ گئی۔ ایسے میں اچانک ہی اُس کے جسم پر ابھرنے والے ننھے ننھے سیاہی مائل دانوں نے اسے پھر سے پریشان کر دیا تھا یہ دانے بے حد مہین تھے مگر تعداد میں کافی زیادہ تھے اب شاید اسے خسرہ ہو گیا تھا یہ ہی سوچ کر اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

فیھا آج جان بوجھ کر کالج نہ گئی تھی وہ پچھلے دو چار دن سے احسن کی سرگرمیوں پر مکمل طور نظر رکھے ہوئے تھی اسے حیرت تھی کہ احسن اسکول کے لیے گھر سے نکلنے کے تقریباً دو گھنٹہ بعد ہی خاموشی سے واپس آ کر اپنے کمرے میں بند ہو جاتا تھا وہ وہاں کیا کرتا تھا اس تجسس نے آج فیھا کو مجبور کیا کہ وہ اسے کمرے کے اندر جا کر چیک کرے وہ سسٹر میری کی کہی ہوئی تمام باتوں کی تصدیق چاہتی تھی۔ بقول سسٹر میری کے احسن غیر اخلاقی سرگرمیوں میں ملوث تھا شاید اس نے ایک دو بار چھوٹے بچوں کو بھی ہراساں کرنے کی بھی کوشش کی تھی جس کی بنا پر اسے اسکول سے عارضی طور پر سات دن کے لیے نکال دیا گیا اور ایسا محض اسے سزا دینے کے لیے کیا گیا تھا مگر اس سزا سے بھی اس کے اندر کوئی بہتری رونما نہ ہوئی، فیھا جب ان باتوں کو سوچتی اس کا دماغ ماؤف ہو جاتا، ویسے تو احسن اس سے صرف ڈیڑھ سال چھوٹا تھا مگر اسکول میں اس سے دو اسٹینڈرڈ پیچھے تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ پچھلے سال تمام ہی مضامین میں فیل ہو گیا تھا اسی سبب وہ ابھی اسکول میں تھا جبکہ فیھا کالج میں جا چکی تھی، اس کی تعلیم سے لاپرواہی کی وجہ بھی شاید یہ ہی تھی ان سب باتوں کو سوچتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئی جہاں احسن کا کمرہ تھا اس نے آہستہ سے دروازے کے ناب کو گھمایا کمرہ لاکڈ تھا، فیھا کا دل دھڑک اٹھا، احسن اگر کمرے میں اکیلا تھا تو پھر لاک کرنے کا جواز اس کی سمجھ میں نہ آیا دروازہ بجا کر اندر جانے کا مقصد سوائے ناکامی کے کچھ نہ تھا کیونکہ اس صورت میں احسن لازمی طور پر الرٹ ہو جاتا۔ وہ خاموشی سے واپس پلٹ کر سیڑھیاں اتر آئی۔ اچھی طرح یاد تھا کہ فرحین کی ٹیبل کی دراز میں چابیوں کا ایک الگ گچھا رکھا ہے ہوا ہے جس میں یقیناً اس کمرے کی چابی موجود تھی۔ اسی سوچ کے تحت وہ فرحین کے کمرے کی جانب بڑھی ناب گھمائی دروازہ بنا آواز کیے کھل گیا۔ اس نے شکر کیا ورنہ عام طور پر فرحین گھر سے جاتے ہوئے اپنا کمرہ بھی لاکڈ کر کے جاتی تھی وہ تیزی سے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی جانب بڑھی جلدی جلدی دراز کھول کر اندر ہاتھ ڈالا اس کا دل دھک سے رہ گیا اندر چابیوں کا گچھا موجود نہ تھا وہ جو احسن کو رنگے ہاتھوں پکڑ کر اس کی بہتری کی کوئی راہ نکالنا چاہتی تھی یک دم اسے مایوسی ہوئی۔ تھوڑی دیر قبل والا اس کا جوش و خروش

کم ضرور ہوا مگر ختم نہ ہوا وہ کمرے میں ہر ممکنہ جگہ پر چابیاں تلاش کرنے کے بعد باہر نکل آئی اسے یاد آیا صحن میں فریج کے پیچھے بھی ایک کی اسٹینڈ دیوار پر لگا ہوا ہے، جہاں عام طور پر گاڑی اور باہر گیٹ کی چابی ہوتی ہے، ہوسکتا ہے کہ چابی وہاں موجود ہو۔"

"اسی خیال کے تحت وہ کچن کی جانب بڑھ گئی۔ جوں جوں ٹائم آگے کی جانب بڑھ رہا تھا وہ بے چین ہو رہی تھی اسے خدشہ تھا کہیں احسن اپنے کمرے سے باہر نہ نکل جائے وہ ہر حال میں دیکھنا چاہتی تھی کہ اس کے کمرے میں ایسا کیا ہے جو اسے اسکول جانے سے بھی روک رہا ہے۔ کی اسٹینڈ پر اس کی مطلوبہ چابیوں کا گچھا موجود تھا شاید فرحین باہر جاتے ہوئے یہ چابیاں یہاں لگا جاتی بہرحال جو بھی تھا اس نے دل ہی دل میں خدا کا لاکھ شکر ادا کیا اور جلدی جلدی چابیاں لے کر اوپر آ گئی۔ احسن کا کمرہ سیڑھیاں چڑھتے ہی عین سامنے تھا اس نے خاموشی سے چابیوں کے نمبر چیک کر کے احسن کے لاک میں مطلوبہ چابی لگائی لاک کھولتے ہی آہستہ سے ناب پر ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالا دروازہ کو نہایت ہی رازداری سے کھول کر وہ دبے قدموں اندر داخل ہوئی احسن سامنے ہی اپنے بیڈ پر موجود تھا۔ اس کا لیپ ٹاپ اس کی گود میں رکھا تھا۔ جس میں اس قدر محو تھا کہ اسے فیما کے کمرے میں داخل ہونے کا علم بھی نہ ہوا وہ دبے پاؤں چلتی عین اس کے سر پر جا کھڑی ہوئی، احسن کے کندھے سے جھانک کر جو نظر اس کے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر ڈالی تو اس کا پورا وجود ہی زلزلوں کی زد میں آ گیا۔ اس کے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا اور وہ پسینہ پسینہ ہو گئی سسٹر میری کی تمام تر باتوں کے باوجود اس کا دل کبھی بھی یہ تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھا کہ اس کا پندرہ سولہ سال کا بھائی ذہنی طور پر اس قدر پست اور گھٹیا سوچ کا بھی ہو سکتا ہے اس سمے اسے احسن کے ساتھ ساتھ اپنی ماں سے بھی بے انتہا گھن محسوس ہوئی جس کی لاپرواہی کے سبب آج اس کا اکلوتا بیٹا اس قدر گر چکا تھا کہ اسکول کے معصوم بچوں کے علاوہ جانے کون کون اس کی غیر اخلاقی حرکتوں سے متاثر ہو رہا تھا۔ جس کا احساس فرحین کو بالکل نہ تھا۔ وہ تو اپنے آپ میں مگن ہوتی تھی احسن کی لیپ ٹاپ اسکرین پر اسی کے جیسے لڑکوں کی قابل اعتراض تصاویر موجود تھی شاید وہ کسی چیٹ پر تھا یا اس نے کوئی ویب سائٹ کھولی ہوئی تھی جو بھی تھا ان تصاویر کو دیکھ کر فیما کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اتنا دکھ شاید اسے اس وقت نہ ہوتا اگر احسن کسی لڑکی کے ساتھ اس کمرے میں موجود ہوتا جتنا دکھ احسن کی اس سرگرمی نے اس دیا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی اور احسن کی گود میں رکھا لیپ ٹاپ جھپٹ لیا اور حلق کے بل چلائی۔

"یہ وجہ ہے جو تم اسکول سے واپس آ کر کمرہ بند کر لیتے ہو، میں سمجھتی تھی کہ سسٹر میری جو کچھ کہہ رہی یقیناً کسی غلط فہمی کے سبب کہہ رہی ہے۔ مجھے امید نہ تھی کہ اس کے تم پر لگائے گئے الزامات سچ ثابت ہوں گے۔" اس کی آواز رندھ گئی۔ احسن اس غیر متوقع حملہ کے لیے بالکل تیار نہ تھا اسے ذرہ بھر امید نہ تھی کہ اس طرح فیما کمرے میں داخل ہو کر اسے رنگے ہاتھوں پکڑے گی۔ اس کا یہ گھناؤنا شغل کئی عرصہ سے جاری تھا جسے وہ بلاخوف وخطر سرانجام دیتا تھا کیونکہ اس کے دل میں اپنی ماں کا ذرہ بھر بھی خوف نہ تھا، ایسے میں فیما کی بے جا مداخلت اسے بری طرح کھلی۔

مگر پھر بھی وہ تھوڑا سا خفت زدہ ضرور ہوا کہ

اسکرین پر نظر آنے والے مناظر اس کی بہن نے بھی دیکھ لیے ہیں مگر دوسرے ہی پل اپنے گھر کے ماحول کا سوچتے ہی اس کی خفت اڑن چھو ہوگئی۔

''میرا لیپ ٹاپ مجھے واپس کر دو۔'' وہ آہستہ آواز میں فیھا کی جانب ہاتھ بڑھاتا ہوا بولا۔ اس کے پر سکون لہجہ نے فیھا کو آگ لگا دی۔

''نہیں کروں گی واپس بلکہ ماریہ کو دکھاؤں گی کہ تم تنہائی میں کس طرح انٹرنیٹ کا غلط استعمال کر رہے ہو اسی سبب میں نے اسے منع کیا تھا کہ جب تک تم اسکول پاس نہ کرو تمہیں انٹرنیٹ نہ لگوا کر دے مگر یہاں میری سنتا کون ہے؟''

''جو تم نے کہا تھا وہ کہہ لیا اب شاباش میرا لیپ ٹاپ واپس کرو اور جو کرنا ہے وہ جا کر کرو میں کسی سے نہیں ڈرتا۔'' احسن کی ڈھٹائی عروج پر تھی جب کہ فیھا اچھی طرح جانتی تھی کہ گھر میں اگر وہ کسی سے تھوڑا بہت ڈرتا ہے تو وہ یقیناً ماریہ ہی تھی یہ ہی سبب تھا جو اس نے اسے ڈرانے کے لیے ماریہ کا نام لیا استعمال کیا۔'' اور ایک اور بات تم میرے کمرے میں داخل کس طرح ہوئیں تمہیں آج تک یہ تمیز نہیں آئی کہ کسی کے کمرے میں بنا دستک دیے داخل نہیں ہوتے ...... دستک تو ایک طرف تم دوسری چابی استعمال کر کے چوروں کی طرح میرے کمرے میں آئی ہو۔''

بجائے شرمندگی محسوس کرنے کے وہ مزید ڈھٹائی سے دھاڑا۔

بکواس بند کرو اپنی میں تمہارے کمرے میں نستر میری کی باتوں کی تصدیق کے لیے ہی چوروں کی طرح آئی تھی اور شرم کرو جو کچھ تم دیکھ رہے تھے اس سب کو دیکھ کر تو میرے لیے پاؤں پر کھڑا ہونا مشکل ہو گیا ہے جبکہ تم نہایت ہی بے غیرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھ پر الزام لگا رہے ہو۔ میں یہ لے کر جا رہی ہوں۔ اب ماریہ سے لینا۔ وہ لیپ ٹاپ ہاتھ میں لیے کمرے کے باہر کی سمت نکلنے والے دروازے کی جانب بڑھی جب اسے پیچھے سے بھاگ کر احسن نے دبوچ لیا۔

''تم یہ لیپ ٹاپ لے کر کمرے سے باہر نہیں جا سکتیں۔''

اس نے بری طرح فیھا کو دیوار کے ساتھ لگا دیا اس طرح کہ وہ دونوں جانب سے اس کے بازوؤں میں جکڑی ہوئی تھی۔

لیپ ٹاپ چھوڑ دو میرا ورنہ آج میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔

وہ زوردار آواز میں چیختے ہوئے بولا۔ اب جیسے وہ اپنے حواسوں میں نہ تھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے کمرے میں کیوں اس طرح جانوروں کی طرح تم دونوں لڑ رہے ہو؟''

ماریہ کی تیز آواز پر فیھا نے پلٹ کر دروازے کی سمت دیکھا اسی پل احسن نے اس کے ہاتھ میں موجود لیپ ٹاپ چھین لیا۔ فیھا تیزی سے ماریہ کی سمت بڑھی۔

ماریہ......

اس کے ساتھ ہی اس نے جلدی جلدی ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں احسن کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ساتھ ہی ساتھ وہ رو بھی رہی تھی۔

''بکواس کر رہی ہے یہ جھوٹ بول رہی ہے میں صرف انگلش موی کا ٹریلر دکھ رہا تھا یہ جانے کیا سمجھی اس وقت سے مسلسل اس نے میرا جینا حرام کر رکھا ہے۔ وہ غالباً اتنی دیر میں اپنے خلاف تمام ثبوت ختم کر چکا تھا، لیپ ٹاپ کی اسکرین پر ایسا کچھ قابل اعتراض نہ تھا جو ماریہ اس سے باز

پرس کرتی۔ مگر پھر بھی وہ جان چکی تھی فیھا جو کچھ کہہ رہی ہے یقیناً وہ سچ ہوگا کیونکہ فیھا کبھی کسی پر الزام تراشی نہ کرتی تھی یہ تو پھر احسن تھا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو میں ان دنوں کتنی پریشان ہوں ابھی بھی ڈاکٹر ہی کے پاس جانے کے لیے کمرے سے نکلی تھی جو اچانک بچوں کی طرح تمہاری لڑائی کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی، مجھے امید نہ تھی کہ تم دونوں اپنا اسکول اور کالج چھوڑ کر اس طرح اپنے کمرے میں گھتم گھتا ہوگے، شرم آنی چاہیے تم لوگوں کو۔

ماریہ کی بات ختم ہوتے ہی فیھا نے اس کی جانب تکا۔ جینز ٹی شرٹ پر آج پہلی بار اس نے گلے میں اسکارف لپیٹا ہوا تھا جو یقیناً فیھا کے لیے حیرت انگیز ہوتا اگر وہ اس کی حقیقت نہ جانتی اصل میں ماریہ کے ہاتھ پر کچھ دن قبل چھوٹے چھوٹے سفید داغ نمودار ہوگئے تھے جن کا سبب شاید کیلشیم کی کمی تھا مگر باوجود کیلشیم کی مہنگی دواؤں کے استعمال کے وہ سفید دھبے ختم تو نہ ہوئے، البتہ رُک ضرور گئے۔ مگر اچانک ہی ایک ہفتہ قبل اس کا ایک دھبہ ماریہ کی گردن پر بھی آ گیا۔ جس نے اپنی خوبصورتی کے زعم میں مبتلا ماریہ کو تھوڑا سا خوفزدہ کر دیا وہ ڈر گئی کہ کہیں ایسا ہی کوئی دھبہ اس کے چہرے پر نہ آ جائے اسی سبب اس نے کسی بڑے اسکن کے ڈاکٹر سے ٹائم لیا تھا اور آج شاید وہ وہیں جا رہی تھی گلے میں اسکارف بھی غالباً اسی سفید دھبے کو چھپانے کے لیے لپیٹ رکھا تھا۔ جس کا سائز بڑھ کر دو روپے کے سکے جتنا ہو گیا تھا۔ خوف نے ماریہ کے چہرے کو پیلاہٹ دے دی تھی۔

چلو تم باہر آؤ میرے ساتھ۔ احسن کو مکمل نظر انداز کر کے وہ فیھا کا بازو تھامے اسے کمرے سے باہر لے آئی۔ ''میری بات کا یقین کرو ماریہ میں جو کہہ رہی ہوں وہ بالکل سچ ہے۔''

وہ ماریہ کو یقین دلاتے ہوئے پرزور انداز سے بولی۔

مجھے تمہاری بات کا پورا یقین ہے۔ ماریہ نے اس کے ہاتھ تھپتھپائے۔

مگر اس طرح شور شرابا اس مسئلہ کا حل نہیں ہے میں ذرا ڈاکٹر کے پاس سے ہو آؤں، پھر آ کر اس مسئلہ پر تم سے بات کرتی ہوں اور ہاں۔

''وہ سیڑھیاں اترتے اترتے رک گئی اور کچھ سوچ کر واپس پلٹ آئی۔ میرے لیے دعا ضرور کرنا۔ یہ دھبے کسی اور بیماری کا شاخسانہ نہ ہوں صرف اسکن کا ہی مسئلہ ہو مجھے امید ہے تمہاری دعا اللہ تعالیٰ ضرور سنے گا۔''

فیھا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر وہ ہولے سے بولی۔ اس کے ہاتھ کی لرزش اس کے کسی اندرونی خوف کو ظاہر کر رہی تھی جانے کیوں فیھا کو اس پر ترس سا آ گیا۔

''ہاں انشاء اللہ ضرور اللہ تعالیٰ تمہیں ضرور شفا دے گا۔''

فیھا نے دھیمے سے جواب دیا ماریہ اس کا جواب سنتے ہی تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی۔ ان دھبوں نے ماریہ کو اتنا پریشان کیوں کر رکھا تھا؟ فیھا کی سمجھ میں نہ آیا شاید وہ اپنے حسین چہرے کے خراب ہو جانے کے تصور سے خوفزدہ ہے مگر اس کی سرجری اس کے اس مسئلے کو بھی جلد حل کر دے گی پھر وہ کیوں اتنی ڈری ہوئی ہے اور اس کے ڈر کا سبب جلد ہی سامنے آ گیا۔

☆......☆......☆

میری سمجھ میں نہیں آتا آخر آپ اپنی جان کی دشمن کیوں بنی ہوئی ہیں؟

ڈاکٹر صمد نے اپنے سامنے موجود اس خوبصورت سی لڑکی کے چہرے پر ایک بھرپور نظر ڈالی جہاں پریشانی واضح طور پر نظر آرہی تھی۔ ڈاکٹر صمد اس لڑکی سے تقریباً ایک سال قبل کسی غیر ملکی ریسٹورنٹ میں سرسری سی ملاقات کر چکا تھا اس پہلی ملاقات نے ہی اسے اس قدر متاثر کیا تھا جو وہ آج تک اس لڑکی کو نہ بھولا تھا مگر شاید وہ لڑکی اتنی بار ملنے کے باوجود ابھی تک اسے پہچان نہ پائی۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی......وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اپنے ابرو اچکاتے ہوئے بولی۔

مطلب یہ کہ پچھلے دو ماہ سے جانے آپ کتنی بار یہاں آچکی ہیں اور ہر دفعہ میرے علاوہ بھی تقریباً یہاں موجود تمام لوگ آپ کو بار بار یہ باور کرا چکے ہیں کہ سکیورٹی خدشہ کے پیش نظر آپ کو اس پاگل شخص کے بیرک میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، مگر آپ پھر آ موجود ہوتی ہیں اور ہر بار بضد ہوتی ہیں کہ آپ کو اندر جانے دیا جائے جب کہ باہر سے تو آپ خود بھی جانے کتنی بار کوشش کر چکی ہیں اس کے ساتھ آپ کا یہ دعوی ہے کہ وہ آپ کی آواز سن کر ضرور آپ کی جانب متوجہ ہوگا اور یہ ثابت ہو گیا بار بار پکارنے پر بھی اس شخص نے آج تک آپ کو کوئی جواب نہیں دیا آپ پھر بھی اس کے قریب جانے کی ضد کر رہی ہیں مجھے نہیں سمجھ آتا کہ اس شخص سے آپ کا کیا رشتہ ہے جو آپ اس طرح ہر دوسرے دن یہاں آ موجود ہوتی ہیں ورنہ آج کی اتنی معروف زندگی میں کسی کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ کسی انجان پاگل، جنونی شخص کی خاطر اس طرح اسپتالوں کے چکر لگائے۔''

ڈاکٹر صمد کی تمام باتیں سچائی پر مبنی تھیں۔ جنہیں وہ چاہ کر بھی جھٹلا نہ سکی۔

''ڈاکٹر صاحب آپ کی تمام باتیں سو فیصد درست ہیں مگر میں پھر بھی آپ سے یہ ضرور کہوں گی کہ صرف ایک بار مجھے اس شخص کو چھو لینے دیں۔ یقیناً میرے ہاتھوں کا لمس اسے ہوش کی دنیا میں واپس لے آئے گا کیونکہ مجھے پورا یقین ہے وہ ان ہاتھوں کے لمس کو آج تک بھولے نہ ہوں گے۔'' وہ اپنے ہاتھوں کو تکتے ہوئے انتہائی دکھ اور جذب کے عالم میں بولی۔ دراصل آپ شاید نہیں جانتیں اس شخص نے اپنی سگی بیٹی پر مجرمانہ حملہ کیا تھا جو غالباً آپ ہی کی ایج کی تھی پھر شاید گزرتے وقت نے اسے احساس ندامت شرمندگی اور پشیمانی میں مبتلا کر دیا جس کے سبب یہ ذہنی طور پر اس قدر مفلوج ہو چکا ہے کہ آپ کی عمر کی ہر لڑکی کو اپنی بیٹی سمجھ کر اس پر حملہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ مکمل طور پر جھوٹ کا پلندہ ہے، یہ شخص بالکل بے گناہ ہے ورنہ احساس شرمندگی اور ندامت سے پاگل ہونے والا انسان دوبارہ کسی نوجوان لڑکی پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس بات کو اگر آپ دوسرے پہلو سے سوچیں تو یہ بھی ہو سکتا ہے اپنے اوپر لگائے گئے گھناؤنے اور غلیظ ترین الزامات نے اس شخص سے اس کے حواس چھین لیے ہوں یہ ہی سبب ہے کہ وہ اپنی بیٹی کی عمر کی ہر لڑکی کو دیکھ کر اپنے ہاتھوں قتل کر دینے کی خواہش دل میں رکھتا ہو تاکہ اپنے اوپر لگائے جانے والے الزامات کا حساب برابر کر سکے۔

مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کہ کوئی سگی بیٹی اپنے باپ پر اس قدر گھناؤنا اور گھٹیا الزام کیوں لگائے گی اور الزام بھی ایسا جسے سن کر ہی رونگٹے

کھڑے ہو جائیں جانے کیوں ڈاکٹر صمد کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ لڑکی اس جنونی اور پاگل شخص کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہے یہ ہی سبب تھا جو وہ کرید کرید کر اس سے وہ سب جاننے کی کوشش کر رہا تھا جو شاید آج تک کسی کو معلوم نہ تھا۔

اگر آپ سمجھتے ہیں کہ کوئی سگی بیٹی اپنے باپ پر اس قدر گھناؤنا الزام نہیں لگا سکتی تو کیا آپ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ کوئی سگا باپ اپنی نوجوان بیٹی کے حوالے سے کسی غلط حرکت کا مرتکب ہو سکتا ہے؟

وہ اپنی کہنیاں ٹیبل پر ٹکاتے ہوئے تھوڑا سا آگے کی جانب جھکی اور سید حاصمد کی نگاہوں میں دیکھتے ہوئے ایک ایسا سوال کیا جس کا جواب یقیناً کسی بھی باشعور شخص کے پاس نہ تھا۔

میرا خیال ہے کہ نہیں...... بنا سوچ سمجھے ہی اس کے منہ بے ساختہ نکلا۔ اور آپ کا یہ خیال بالکل درست ہے۔" وہ پھر سے سیدھے ہوتے ہوئے بولی۔

اور یقین جانیں مجھے آپ کے اس جواب سے کس قدر خوشی ہوئی ہے میرا خیال ہے کہ میرے بعد یقیناً آپ دوسرے شخص ہیں جو اس کی بے گناہی پر یقین رکھتے ہوں گے اسی بنا پر میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ وہ شخص ہوش کی دنیا میں واپس آ سکتا ہے اگر آپ لوگ مجھے اس شخص سے ملنے دیں بات کرنے دیں تو یقین جانیں جلد ہی اس کا مثبت نتیجہ آپ کے سامنے آ جائے گا۔

ہو سکتا ہے آپ کا کہا کسی حد تک درست ہو مگر پھر بھی ہم کسی بھی ممکنہ خطرے سے بچے رہنے کے لیے یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ آپ کو بیرک میں داخل نہ ہونے دیا جائے ورنہ باہر سے تو آپ تقریباً ہر

دوسرے دن اس شخص سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی ہیں اور ہو سکتا ہے کہ دیر یا سویر آپ کو اس میں کامیابی بھی ہو جائے۔ ڈاکٹر عبدالصمد نے اپنی پر سوچ نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑتے ہوئے کہا۔

یقیناً ڈاکٹر صاحب مجھے ضرور کامیابی ہو گی اور اس سلسلے میں، میں بالکل بھی مایوس نہیں ہوں ہاں البتہ یہ کامیابی آپ کی احتیاط کے پیش نظر مجھے دیر سے ضرور ملے گی۔" وہ تھوڑا سا رُکی اور ہلکا سا مسکرادی مگر انشاء اللہ ملے گی ضرور کیونکہ مجھے اپنے خدا پر پورا یقین ہے وہ کسی کو بھی اپنی رحمت سے مایوس نہیں کرتا۔ جب اس نے مجھے یہاں تک پہنچا دیا ہے تو یقیناً میرے لیے آگے بھی آسانیاں پیدا کرے گا مگر اپنے وقت پر جب اسے منظور ہو گا کہ میں بابا کو چھو سکوں، ان کے ہاتھ تھام سکوں ان کی آواز سن سکوں اور ہاں ان کے ہاتھ سے ایک بار پھر چھوٹے چھوٹے لقمے کھاؤں، جانتے ہیں ان ہاتھوں کے بنے نوالے کی لذت آج بھی میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی رہی ہے اور میں اپنی اس خوشی کو انشاء اللہ جلد ہی پاؤں گی۔ بولتے بولتے اس کی آواز رندھ گئی۔

ڈاکٹر عبدالصمد کو ایک عجیب سے احساس نے اپنے حصار میں لے لیا۔

آپ کون ہیں؟ اور اس شخص سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟

ڈاکٹر عبدالصمد نے غور سے اس کے چہرے کو تکتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔

میں کون ہوں؟ اس کا جواب بھی انشاء اللہ آپ کو جلد مل جائے گا، فی الحال میں کوشش کروں گی جب نیکسٹ ٹائم آؤں تو ضرور بابا کے قریب

جا کر انہیں چھو کر اپنے ہونے کا احساس دلاؤں اور اس کے بعد میں تمام دنیا کے سامنے بھی سچائی ضرور لاؤں گی تا کہ لوگوں کو معلوم ہو سکے کہ غلام حسین ایک شریف شخص تھا جسے محض پھنسانے کے لیے اس کے اپنوں نے اس پر الزامات لگائے اور ہاں ہو سکا تو میں کوشش کروں گی کہ جب اگلی دفعہ آؤں تو میرے ساتھ فیہا ضرور ہو کیونکہ مجھے یقین ہے کہ اسے دیکھ کر اس شخص کے حواس پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور پڑے گا۔''

اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی کندھے پر ہینڈ بیگ ڈالا گلاسز آنکھوں پر لگائے اور کمرے کے دروازے کا گلاس ڈور دھکیلتی باہر نکل گئی۔ ڈاکٹر عبدالصمد اس وقت تک اسے دیکھتا رہا جب تک وہ اس کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ سنگا پور کے ایک ہوٹل میں ملنے والی یہ لڑکی آج بھی اس کے حواسوں پر اس طرح سوار تھی کہ جب بھی وہ اسپتال آتی اسے مدہوش سا کر جاتی اور اس کے جانے کے بعد بھی وہ اگلے کئی دن تک اسی کے تصور میں کھویا سا اسے لگتا شاید وہ اس انجان لڑکی سے محبت کرنے لگا ہے جس کے بارے میں ابھی تک وہ کچھ جانتا بھی نہ تھا۔

☆......☆......☆

تم......اور یہاں۔

اس آواز پر یک دم اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر جوہی نے اپنی مخاطب پر نگاہ ڈالی جس کی آنکھوں میں نظر آنے والے واضح تمسخر اور حقارت نے اسے پل بھر کے لیے شرمندہ سا کر دیا اس کا دل چاہا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے اسے بھی امید نہ تھی کہ اس کی ملاقات ان حالات میں اپنی ماں سے ہوگی جب وہ اس محفل میں شیخ حیات خان کی گرل فرینڈ دوسرے الفاظ میں داشتہ کے طور پر موجود ہوگی اسے اپنے منی اسکرٹ پر موجود چھوٹے سے ٹاپ نے بھی جی بھر کر خوار کیا حالانکہ اس کے سامنے موجود اس کی ماں کا حلیہ اس سے بھی زیادہ قابل اعتراض تھا بلیک شیفون کی ساڑھی اور سلیولیس مختصر سے ٹاپ میں بے تحاشا میک اپ کے ساتھ ہاتھ میں ام التجائث کا گلاس تھامے فرحین کو دیکھ کر کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ یہ جوہی کی ماں ہو سکتی ہے اس کے باوجود جوہی کو اس کی یہاں موجودگی سے زیادہ اپنی موجودگی نے پشیمان کیا۔

اگر یہ ہی سب کچھ کرنا تھا تو کیا میرا گھر برا تھا؟ اور معاف کرنا تم تو وہاں سے جس طرح نکلیں تھیں مجھے تو پوری امید تھی کہ زندگی میں جب بھی بھی تم سے ملاقات ہوگی سر تا پا کسی کالے برقعہ میں لپٹی ہوگی مگر ویل ڈن تم نے تو آج اپنی ماں کا سر فخر سے بلند کر دیا۔ تمہیں دیکھ کر میں کہہ سکتی ہوں کہ تمہاری رگوں میں بھی صرف میرا خون تھا ورنہ تم یہاں نہ ہوتیں شاید کسی مدرسے میں ہوتیں، وہ سمجھ نہ پائی فرحین کے ان الفاظ میں طنز تھا یا کچھ اور مگر جو بھی تھا وہ شرم سے زمین میں گڑھ گئی اس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔

ارے تم دونوں کیا ایک دوسرے کو جانتی ہو؟

جانے کب شیخ صاحب نے آ کر جوہی کے کندھوں پر اپنے بازو رکھتے ہوئے اسے خود سے قریب کیا، اس کے منہ سے اٹھتی بو نے جوہی کی طبیعت کو یک دم ہی مکدر سا کر دیا۔ اسے متلی محسوس سی ہوئی۔

''ایکسیوزمی شیخ صاحب میری طبیعت شاید کچھ خراب ہو رہی ہے۔''

فرحین شیخ حیات کی کسی بھی بات کا جواب دیئے بنا وہاں سے جا چکی تھی جوہی میں اتنی ہمت

ہی نہ تھی کہ دیکھتی وہ کہاں گئی۔
''اوہ کیا ہوا تمہیں ابھی تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھیں۔''
شیخ کے لہجہ کی بے چینی اور ہوس اس سے چھپی نہ رہ سکی۔
''پتہ نہیں بہرحال ابھی آپ ڈرائیور سے کہہ کر مجھے گھر بھجوادیں۔''
نہ چاہتے ہوئے بھی بے زاری اس کے لہجہ میں اتر آئی۔
ٹھیک ہے مگر......
شیخ کیا کہنا چاہتا تھا وہ بنا کہے ہی سمجھ گئی۔
''شیخ صاحب میں ٹھیک ہوتے ہی آپ سے خود رابطہ کرلوں گی آپ فکر مند نہ ہوں۔'' وہ کہہ کر وہ وہاں رکی نہیں ہال کا بڑا سا شیشے کا دروازہ دھکیل کر باہر آ گئی۔ جہاں سامنے ہی سوئمنگ پول پر موجود کچھ من چلے اپنی موج مستیوں میں اس طرح غرق تھے کہ انہیں آس پاس کی کچھ ہوش نہ تھی مگر آج جوہی کو بھی اچھا نہ لگ رہا تھا اسے یہ سب دیکھ کر خود سے بھی گھن محسوس ہو رہی تھی سچ ہے آگہی کا ایک لمحہ ہمیں کسی بھی وسیلے سے مل سکتا ہے ضروری نہیں ہے ہمیں شعور آگہی اور خودشناسی کا درس دینے والا کوئی عالم فاضل استاد ہو بلکہ یہ تو کبھی کبھی فرحین جیسے ناسمجھ لوگوں کے ذریعے بھی اس طرح مل جاتا ہے کہ دینے والے کو خود بھی علم نہیں ہوتا، فرحین کا اس قدر یقین سے جوہی کے بارے میں کیے گئے تجزیہ نے جوہی کو جیتے جی مار دیا اسے لگا اب شاید وہ کبھی بھی زندہ ہو کر زندہ لوگوں کی طرح ہنس بول نہ سکے گی وہ تو شاید آج مر چکی تھی ہاں یقیناً آج جوہی شرجیل کی موت واقع ہو گئی تھی اب جو نئی جوہی جنم لینے والی تھی وہ یقیناً صرف اور صرف غلام حسین کی بیٹی جواہر میں ہی ہو سکتی تھی۔

☆......☆......☆

پل بھر میں ہی ڈاکٹر عبدالمالک کے چہرے پر چھائی سنجیدگی نے ماریہ کو کچھ خوفزدہ کر دیا اسے سمجھ ہی نہ آیا کہ اس کی رپورٹس میں ایسا کیا تھا جس نے ڈاکٹر عبدالمالک جیسے ہنس مکھ شخص کو ایک دم پریشان سا کر دیا۔
ڈاکٹر صاحب سب کچھ ٹھیک تو ہے نا......؟ کسی بھی خدشہ کے پیش نظر وہ تھوڑا سا ڈرتے ہوئے بولی۔
''آں ہاں ......سب کچھ ٹھیک ہے آپ پلیز اپنے دونوں ہاتھ ایک بار پھر اس ٹیبل پر پھیلائیں۔ڈاکٹر صاحب نے اپنے سامنے رکھے ہوئے بڑے سے ٹیبل کی سمت اشارہ کیا، ماریہ نے خاموشی سے اپنے دونوں ہاتھ الٹے کر کے اس ٹیبل پر رکھ دیے، اس کے خوبصورت گورے گورے نرم و نازک ہاتھوں پر ہلکے ہلکے سے گلابی رنگ کے دھبے کچھ عجیب سے دکھائی دے رہے تھے۔ڈاکٹر صاحب نے اپنی دراز کھول کر ایک چھوٹا سا اوزار نکالا اور ذرا سا آگے کی جانب جھک کر اس کے ہاتھوں پر دکھائی دینے والے دھبوں پر ہلکے ہلکے انداز میں ضرب لگانا شروع کی حیرت انگیز بات یہ تھی اسے ان ضربات سے کسی بھی قسم کی تکلیف کا احساس نہ ہو رہا تھا اور یہ ہی بات شاید ڈاکٹر کے لیے بھی حیرت انگیز تھی جس کا اندازہ دوسرے ہی پل ماریہ کو ہو گیا۔
''کیا آپ کو اس جگہ کوئی تکلیف محسوس نہیں ہو رہی؟''
ڈاکٹر صاحب نے ایک نسبتاً بڑے دھبے پر ضرب لگاتے ہوئے اس کی جانب تکا۔
''نہیں ڈاکٹر صاحب دراصل جانے کیوں

مجھے پچھلے دنوں سے محسوس ہو رہا ہے جہاں جہاں میری اسکن پر یہ دھبے موجود ہیں وہاں سے شاید اسکن سن ہو چکی ہے۔ اس نے نہایت آہستہ سے اپنی پچھلے کچھ دن کی کیفیات ڈاکٹر کے سامنے بیان کیں۔"

اوہ...... اس کا مطلب ہے کہ......

"ڈاکٹر نے اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اپنی بات کو جان بوجھ کر ادھورا چھوڑ دیا۔" آپ نے ان دھبوں کے علاوہ اپنے جسم میں اور کیا تبدیلی محسوس کی ہے؟ میرا مطلب ہے کہ کچھ اور ایسا جو آپ کی روزمرہ کی روٹین سے ہٹ کر ہو جیسے جسمانی تھکن، متلی یا آنکھوں میں کوئی تکلیف وغیرہ۔

ڈاکٹر صاحب یہ سب تو نہیں ہے البتہ مجھے اپنے پاؤں میں کچھ سوجن سی ضرور محسوس ہو رہی ہے، اس کے ساتھ ہی میرے ٹانگوں کی جلد بھی از حد خشک ہو چکی ہے یہاں تک کہ بے تحاشہ آئل اور میڈیکیٹڈ لوشن کے استعمال سے بھی اس میں کوئی خاطر خواہ فرق نہیں آ رہا۔"

"بیٹا آپ کو ایک عدد ٹیسٹ اور لکھ کر دے رہا ہوں کوشش کریں جتنی جلد ممکن ہو سکے کروالیں تاکہ فوراً آپ کا علاج شروع کیا جا سکے جہاں تک میں سمجھتا ہوں اب آپ کو مزید دیر نہیں کرنا چاہیے۔"

"ڈاکٹر صاحب سب کچھ ٹھیک تو ہے نا۔"

ڈاکٹر عبدالمالک کا انداز گفتگو اسے کسی انہونی کا احساس دلا رہا تھا۔

آپ بھی دعا کریں اور میں بھی دعا کروں گا انشاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہے مگر پھر بھی جب تک آپ کی یہ رپورٹ نہ آجائے میں آپ کو مزید کوئی تسلی نہیں دے سکتا ہو سکتا ہے جو میں سوچ رہا ہوں ویسا نہ ہو مگر پھر بھی آپ کی بیماری کی علامت مجھے کچھ پریشان کر رہی ہیں اس کے ساتھ ہی میں آپ کو ایک مشورہ اور دوں گا اپنے سوشل سرکل میں زیادہ لوگوں سے میل بول رکھنے سے گریز کریں بلکہ ہو سکے تو گھر سے ہی کم باہر نکلیں اسی وقت جب تک میں آپ کو اگلی ہدایت نہ دوں، اپنی میڈیسن کا استعمال باقاعدگی سے کریں میں نے کارڈ پر آپ کے نیکسٹ وزٹ کی تاریخ ڈال دی ہے۔ اب جب آپ آئیں اپنے اس ٹیسٹ کی رپورٹ ضرور لائیں تاکہ اس کی روشنی میں آپ کا باقاعدہ علاج شروع کیا جا سکے اور ہاں اس حوالے سے کسی بھی قسم کی ٹینشن مت لیجیے گا اللہ تعالیٰ جو بھی کرے گا انشاءاللہ آپ کے حق میں بہتر ہی ہوگا۔

اللہ تعالیٰ میرے حق میں اب شاید مزید کچھ بہتر نہیں کر سکتا۔

اس کے دل کے اندر سے ایک آواز ابھری مگر وہ بولی کچھ نہ اور خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی اسے محسوس ہوا شاید مکافات عمل شروع ہو چکا ہے اور جو کچھ اس نے بویا تھا اب کاٹنے کا وقت آنے والا ہے اس کے ہاتھوں کی لرزش اس کے اندرونی خوف کو واضح طور پر ظاہر کر رہی تھی ڈاکٹر کی ٹیبل پر موجود اپنی فائل تھام کر وہ خاموشی سے کلینک سے باہر نکل آئی اپنے پاؤں پر آئی سوجن اور انگلیوں کے درمیان موجود ہلکے ہلکے زخموں کے باعث اس کے لیے کس قدر تیز تیز چلنا دشوار ثابت ہو رہا تھا اسی سبب وہ آہستہ آہستہ قدم گھسیٹتی اسپتال کی عمارت سے باہر نکل آئی اس نے اپنا سر اچھی طرح دوپٹے سے ڈھانپ رکھا تھا آج کل ٹی وی پر اس کے دو تین کمرشل چل رہے تھے اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس حوالے سے کوئی اسے اس پریشانی میں دیکھ کر پہچان لے جانے کیوں وہ خوف زدہ سی

تھی جس کا سبب اپنے حسن کو کھونے کا احساس تھا کیونکہ اس کا حسن ہی تو تھا جس کی بدولت اس نے ایک دنیا کو اپنی انگلیوں پر نچا رکھا تھا۔ جو یہ نہ ہوتا تو ماریہ حسین جیسی گم نام لڑکی کو کوئی نہ جانتا سامنے ہی اس کا ڈرائیور گاڑی کے ساتھ موجود تھا وہ دروازہ کھول کر پچھلی سیٹ پر ڈھے سی گئی ڈاکٹر کی گفتگو اور اس کے کہے ہو الفاظ اسے باور کرا رہے تھے کہ اس کے ساتھ یقیناً کچھ غلط ہونے والا ہے مگر بہت غلط ہونے والا ہے اس کا فی الحال اسے اندازہ نہ تھا۔

☆......☆......☆

میرا خیال ہے اپ مسز حرم شیخ کے بارے میں جاننا چاہ رہی ہیں جو روم نمبر 305 کی مریضہ تھیں اور غالباً انہیں ہڈیوں کی ٹی بی تھی۔

ریسپشن پر موجود کمپیوٹر آپریٹر نے اپنا ڈیٹا مکمل طور پر چیک کرتے ہوئے اس سے سوال کیا جو لفظ "مسز" سن کر کچھ شاک سی ہو گئی۔

"مسز نہیں مس حرم شیخ۔" اس نے جلدی سے تصحیح کی۔

"سوری میم یہاں تو روم نمبر 305 کی مریضہ کا اندراج مسز حرم شیخ زوجہ نوفل حسین شیخ کے نام سے ہے۔"

"زوجہ نوفل حسین شیخ کمپیوٹر آپریٹر کی بات سنتے ہی اس نے بے ساختہ زیر لب دھرایا۔"

یہ جانے کس حرم کی بات کر رہی ہے اسے کچھ سمجھ ہی نہ آیا وہ پچھلے ہفتہ ہی تقریباً دو ماہ بعد کراچی آئی تھی۔ ان دو ماہ میں وہ کئی بار نوفل سے بات کر چکی تھی اور اسے حیرت تھی کہ نوفل نے حرم کے ڈسچارج ہونے کے حوالے سے اس سے کوئی بھی ذکر نہ کیا تھا۔ کراچی آتے ہی جب اسے نوفل ایئرپورٹ پر نہ ملا تو وہ بنا کسی اطلاع کے پہلے سیدھی اس کے گھر گئی جہاں موجود بڑے سے تالے نے اسے خاصا پریشان کیا کیونکہ بہت کم ایسا ہوتا تھا جب نوفل کی والدہ گھر کو تالا ڈال کر کہیں جاتیں مسلسل دو تین چکر لگانے پر بھی جب گھر بند ہی ملا تو وہ کچھ ٹھٹھک سی گئی نوفل کا فون بھی مسلسل آف جا رہا تھا یہ ہی سبب تھا جو وہ حرم سے ملنے اسپتال چلی آئی جہاں حرم کے روم میں موجود کسی نئی مریضہ کو دیکھ کر اسے احساس ہوا کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے ورنہ یہ سب کچھ ایک ساتھ تبدیل نہ ہوتا اور اسی سوچ کے زیر اثر وہ ریسپشن پر حرم کے بارے میں معلومات حاصل کرنے جا پہنچی جہاں اسے حرم کے مکمل طور پر صحت یاب ہو کر ڈسچارج ہونے کا سن کر حیرت ہوئی کیونکہ نوفل نے اسے ایسا کچھ نہ بتایا وہاں ہی وہ اس حوالے سے مزید انکشافات سن کر گھبرا سی گئی۔

ریسپشن پر موجود لڑکی غالباً نئی تھی، جو اس سے قطعی ناواقف تھی جبکہ سابقہ ریسپشنسٹ اُسے جانتی تھی حرم سے اس کا تعارف پچھلے تین چار سالوں سے نوفل کی بہن کے حوالے سے ہی تھا ایسے میں اس لڑکی کی باتوں نے اسے بے چین کر دیا۔

"میرا خیال ہے اگر آپ اس حوالے سے مزید کچھ جاننا چاہتی ہین تو ڈاکٹر سمیعہ حیدر سے ملاقات کر لیں وہ اس وقت اپنے کلینک پر موجود تھی۔"

ڈاکٹر سمیعہ حرم کی ڈاکٹر تھی اس لیے وہ بھی اسے جانتی تھی ہاں میرا خیال ہے کہ یہ زیادہ بہتر ہے اس لڑکی کو جواب دے کر وہ ڈاکٹر سمیعہ کے کلینک آ گئی جہاں وہ کچھ مصروف تھیں تقریباً آدھ گھنٹہ انتظار کے بعد انہوں نے اسے اپنے کیبن میں بلوایا۔

(اس دلچسپ ناولٹ کی اگلی قسط آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

محلے کے ڈاکٹر ہی کو لے لیجیے کتنا نرم دل ہوتا ہے۔ ماں' بچے کی دوائی لینے جاتی ہے تو بچے کو تو دیکھتا ہی ہے دوائی بھی دیتا ہے۔ فیس بھی لیتا ہے لیکن ساتھ ہی بچے کی ماں کا بھی معائنہ کرتا ہے، بالکل مفت، کوئی فیس نہیں لیتا۔ یہ ہمدردی اور سخاوت نہیں تو اور کیا ہے؟ البتہ ماں ذرا......

غلط فہمیاں تو ہوتی رہتی ہیں۔ ایک عام سی غلط فہمی یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر حضرات بے حد سخت دل ہوتے ہیں۔ مریض کی چیرا پھاڑی تو کرتے ہی ہیں، ساتھ ہی اس کی جیب بھی کاٹ لیتے ہیں۔ آپریشن کی فیس ادا کرتے ہوئے مریض اکثر سوچتا ہے کہ اس سے کہیں بہتر تو یہ تھا کہ پتے کی پتھری یا اپنڈکس کے ساتھ ہی گزارا کر لیتا۔

ڈاکٹر جب کسی بچے کو انجکشن لگاتا ہے تو سوئی کی تکلیف کی وجہ سے بچہ رو دیتا ہے دل ہی دل میں سوچتا ہے کہ ڈاکٹر کتنا ظالم ہے۔ ڈاکٹر جب کسی ناسور پر چیرا لگاتا ہے تو بڑے سے بڑے پہلوان کی چیخ نکل جاتی ہے اور وہ دل ہی دل میں کہتا ہے۔

''ہائے ظالم مار دیا۔''

اکثر لوگ اسی غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ ڈاکٹر لوگ ظالم اور سخت دل ہوتے ہیں۔ اکثر کہتے بھی ہیں کہ ڈاکٹر اور قصائی میں بھلا کیا فرق ہے۔ دونوں ہی تو چھری پھیرتے ہیں۔ قصائی تو پھر بھی بہتر ہے کہ جانور ذبح کرتا ہے۔ پہلے کی بات اور ہے کہ قصائی زندہ جانور کاٹا کرتے تھے۔ آج کل کے قصائی اتنے ظالم نہیں ہیں۔ جانور کاٹتے ہیں، مگر زندہ نہیں۔ پھر بھی کاٹتے ہوئے بسم اللہ ضرور پڑھتے ہیں۔ ڈاکٹر یہ بھی نہیں پڑھتا کیونکہ میرا تعلق بھی اسی برادری سے ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ڈاکٹر برادری سے ہے۔ اس لیے یہ میرا معاشی اور تجارتی حق ہے کہ میں ڈاکٹروں کے بارے میں پھیلی اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کروں۔ بقول ابن انشاء یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں۔ یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں۔

سچی بات تو یہ ہے کہ ڈاکٹر بڑا دیالو ہوتا ہے۔ رحم دل اور سخی گو ہوتا ہے۔ محلے کے ڈاکٹر ہی کو لے لیجیے کتنا نرم دل ہوتا ہے۔ ماں' بچے کی دوائی لینے جاتی ہے تو بچے کو تو دیکھتا ہی ہے دوائی بھی دیتا ہے۔ فیس بھی لیتا ہے لیکن ساتھ ہی بچے کی ماں کا بھی معائنہ کرتا ہے۔ بالکل مفت، کوئی فیس نہیں لیتا۔ یہ ہمدردی اور سخاوت نہیں تو اور کیا ہے؟

البتہ ماں ذرا بڑی عمر کی ہو تو محض احترام کے پیش نظر صرف بچے کو دیکھنے پر اکتفا کرتا ہے۔

دانت کے ڈاکٹر بھی رحم دلی اور سخاوت میں جواب نہیں رکھتے۔ اگر کوئی دانت کے درد میں بلبلاتا مریض ان کے پاس جاتا ہے تو یہ رحم دل ڈاکٹر محض انسانی ہمدردی کے جذبے کے تحت دوسرا دانت نکال دیتے ہیں۔ احتیاط علاج سے بہتر ہے۔ آج ایک دانت خراب ہوا ہے۔ کل دوسرا بھی ہو سکتا ہے۔ مریض کو پھر درد اٹھے گا، پھر بلبلائے گا۔ پھر ڈاکٹر کے پاس جانا پڑے گا۔ پھر فیس دینی پڑے گی۔ رحم دل ڈاکٹر صرف مریض کی سہولت کی خاطر دوسرا دانت بھی نکال دیتا ہے تو یہ اس کے اناڑی پن کی نہیں بلکہ رحم دلی کی دلیل ہے۔

اصل سخاوت تو آنکھوں کے ڈاکٹر کی ہوتی ہے کہ آنکھیں صرف دو ہوتی ہیں۔ اور اسے اسی میں سخاوت، رحم دلی دکھانی ہوتی ہے۔ یعنی وقت کم اور مقابلہ سخت والی صورتِ حال ہوتی ہے۔ اس لیے جب کوئی مریض ڈاکٹر صاحب کے پاس نظر کم آنے کی شکایت لے کر آتا ہے تو ڈاکٹر صاحب اس کا معائنہ فرما کر اسے بتاتے ہیں کہ نظر کم ہو گئی ہے چشمہ لگانا پڑے گا۔ ڈاکٹر صاحب چونکہ مریض سے بے حد ہمدردی رکھتے ہیں۔ اس لیے اسے حفظ ماتقدم کے طور پر یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ مستقبل قریب میں موتیا اتر آنے کے امکانات ہیں۔ اگر موتیا نہ اترا تو کالا پانی اتر آئے گا۔ اور اگر یہ بھی نہیں ہوا تو آنکھوں کے پردے پر چربی آ سکتی ہے۔ اس لیے ہر دو تین مہینے پر آنکھوں کا چیک اپ ضروری ہے۔ دو چار بار کے معائنوں کے بعد ڈاکٹر صاحب مریض کو یہ بتا کر خوش کر دیتے ہیں کہ دیکھا وہی ہوا ناں جس کا اندیشہ تھا۔ آنکھوں میں موتیا کے آثار شروع ہو گئے ہیں۔ مریض ڈاکٹر صاحب کی مہارت اور دور اندیشی کا معترف ہو جاتا ہے۔

ہمارے ایک قریبی دوست لیزر کے ذریعے بینائی ٹھیک کر کے مریض کو عینک کی مصیبت سے چھٹکارا دلاتے ہیں۔ یعنی یوں کہیں کہ بیچارے عینک ساز کے پیٹ پر لات مارتے ہیں۔ جو کوئی چشمہ لگائے شناسا نظر آتا ہے، اسے عینک سے نجات حاصل کرنے کا بیش قیمت مشورہ بالکل فری دیتے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ خود ان کے چہرے پر موٹے فریم کا چشمہ اب تک لگا ہوا ہے۔ کسی دل جلے نے جب ان سے یہ کہا کہ ڈاکٹر صاحب پہلے آپ تو اپنا چشمہ اتروائیں اور لیزر کی بابرکت شعاعوں سے فائدہ اٹھائیں تو مسکرا کر بولے۔

''ساڑی بیچنے والا کیا خود کبھی ساڑی پہنتا ہے؟''

یہ تو خیر کچھ نہیں، سرجن حضرات تو ان سب سے زیادہ دیالو ہوتے ہیں۔ ہمدردی اور خدمتِ انسانیت کا جذبہ دیکھیے کہ بندہ اگر پتہ نکلوانے جائے تو ہاتھ کے ہاتھ گردہ بھی نکال لیتے ہیں کہ نہ جانے کب غریب کے گردے میں پتھریاں ہو جائیں۔ ناحق درد سے تڑپے اور بعد میں گردہ نکلوانے کی مشقت اٹھائے۔

کل کرے سو آج، آج کرے سو اب، والے مقولے پر عمل کرتے ہیں۔ یہ فری میں نکالا گیا گردہ بھی ضائع نہیں جاتا۔ مریض تو ہر حال میں مریض ہے۔ دولت مند ہے تو کیا ہے۔ کیا اس بے چارے کو جینے کا حق نہیں۔ کتنے ثواب کا کام ہے اگر کسی کو گردہ لگا کر اس کی جان بچائی جائے۔ پیسہ تو ہاتھ کا میل ہے۔ اس گردے کے

معاوضے کے طور پر اگر اس بے چارے دولت مند مریض نے خوش ہو کر سرجن صاحب کو چند لاکھ روپے مٹھائی کے طور پر دیے بھی ہیں تو یہ سرجن صاحب کا حق ہے۔ ثواب کا پھل اگر اسی دنیا میں مل رہا ہے تو اس میں بھلا کیا برائی ہے؟

ڈگری یافتہ ڈاکٹر تو پھر بھی اتنا دیالو نہیں ہوتا۔ مریض سے فیس کی مد میں ٹھیک ٹھاک رقم لیتا ہے۔ آخر اس کا بھی کچھ حق ہے کہ میڈیکل کی پڑھائی پر خاصہ خرچہ جو اٹھا ہے۔ پڑھائی کے دوران بے چارے نے کتنے پاپڑ بیلے تھے۔

اتائی ڈاکٹر تعلیم یافتہ نہیں ہوتا۔ مگر وہ یہ راز جان گیا ہے کہ بڑھاپا سو بیماریوں کی ایک بیماری ہے۔ اس لیے وہ سر توڑ کوشش کرتا ہے کہ اس کا مریض بڑھاپے تک نہیں پہنچ پائے۔ بھلا دوسروں کا محتاج ہو کر جینا بھی کوئی جینا ہے۔ ویسے بھی اتائی ڈاکٹروں کا نعرہ ہے کہ یا غرض نہیں یا مریض نہیں، تخت یا تختہ، اس لیے مریض کا جوانی ہی میں دھڑن تختہ کر دیتا ہے۔

بڑھاپا آنے سے پہلے مریض کو اوپر پارسل کر دیتا ہے۔ قول مشہور بھی یہی ہے کہ ہیرو ہمیشہ جوانی میں مرجاتے ہیں۔ اتائی ڈاکٹر کتنے دیالو ہوتے ہیں کہ صرف چند دنوں کے علاج میں ہی مریض کو ہیرو بنا دیتے ہیں۔ کبھی کبھار دل میں تمنا جاگتی ہے کہ ہماری حکومت کوئی ایسا انتظام کرے کہ تمام سیاست دان لازماً ان اتائی ڈاکٹروں سے علاج معالجہ کرائیں اور جلد از جلد ہیرو کے منصب جلیلہ پر فائز ہو کر قوم کے لیے خوش خبری بن جائیں۔

کان کے ایک ڈاکٹر صاحب ہر مریض کے کان میں پچکاری مار کر اس کے کان کی مکمل صفائی کر دیتے ہیں۔ مریض کی جیب کی بھی صفائی ہو جاتی ہے۔ مریض دل کو تسلی دے لیتا ہے کہ روپیہ تو ہاتھ کا میل ہے، گیا سو گیا، کان کا میل تو صاف ہوا۔

لیکن اسے کیا خبر کہ یہ میل بعد میں جیل بن جائے گا۔ ہفتہ پندرہ دن کے بعد مریض کے کان میں Fungus ہو جاتی ہے۔ پھر درد اٹھتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس کا بھی علاج کرتے ہیں۔ فنگس ٹھیک ہو جاتی ہے۔ آخر میں محض اپنے دیالو پن کی وجہ سے ڈاکٹر ایک ایک پچکاری دونوں کانوں میں بالکل مفت لگا دیتا ہے۔ مریض خوش ہو جاتا ہے۔ لیکن اس بے چارے کو کیا خبر کہ اس گندے پانی کی پچکاری سے اگلے چند دنوں میں اس کے دونوں کانوں میں فنگس ہونے کے قوی امکانات ہیں۔

ایک اور ڈاکٹر صاحب ہیں کہ جو غریبوں کے ہمدرد اور بہی خواہ ہیں۔ ایک فلاحی اسپتال میں ہفتے میں ایک بار مریضوں کو مفت دیکھتے رہیں۔ وہیں سے تگڑی آسامیاں ڈھونڈ کر اپنے ذاتی اسپتال میں بلواتے ہیں اور خوب فیس وصول کرتے ہیں۔

سماجی کام کرنے کا بھی شوق رکھتے ہیں۔ اکثر اخباروں میں تصاویر شائع کرواتے رہتے ہیں۔ اس ضمن میں اخباری نمائندوں کو بھی انوازتے ہیں اور کبھی جوش آتا ہے تو اپنے اسپتال پر پورا فیچر شائع کروا دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بڑے دیالو ہیں اس لیے اکثر اخباری نمائندوں کی دعوت بھی کر دیتے ہیں۔ اس تقریب کی تصاویر بھی شائع ہوتی ہیں۔ بھئی شہرت کا بھوکا کون نہیں ہوتا۔ لیکن صاحب ماننا پڑے گا کہ ڈاکٹر بابو ہے بڑا دیالو......!

☆☆......☆☆

اسماء اعوان

یارب

میں نے کہا: تیری مدد کیسے ملے گی یارب؟
جواب ملا: صبر اور نماز سے مدد لیا کرو (البقرہ 45)
میں نے کہا: میں بہت گناہ گار ہوں؟
جواب ملا: اللہ کو رحمت سے مایوس نہ ہو اللہ سب گناہ بخش دے گا (ترمذی 53)
میں نے کہا: بہت اکیلا ہوں؟
جواب ملا: بے شک ہم تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں (ق 16)
میں نے کہا: میرے دل کو سکون نہیں ہے؟
جواب ملا: بے شک اللہ کی یاد میں ہی دلوں کو سکون اور اطمینان ملتا ہے (الرعد 28)
میں نے کہا: کوئی مجھے یاد نہیں کرتا؟
جواب ملا: تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا (البقرہ 152)

مرسلہ: رازِ عدن۔ بحرین

جنت میں محل

حضور ﷺ شب معراج میں بیت المقدس کی طرف جاتے ہوئے مصر کے قریب ایک مقام سے گزرے تو انہیں نہایت ہی اعلیٰ اور زبردست خوشبو آنے لگی۔ آپ ﷺ نے حضرت جبرائیلؑ سے اس کی وجہ پوچھی تو بتایا گیا کہ فرعون کی بیٹی کی باندی مشاطہ اور اس کی اولاد کی قبر سے آرہی ہے۔ پھر حضرت جبرائیلؑ نے قصہ بیان کیا کہ..... مشاطہ فرعون کی بیٹی کی باندی تھی اور خفیہ طور پر اللہ کو مان چکی تھی۔ ایک دن شہزادی نے اُس کے منہ سے 'بسم اللہ' سن لیا۔ تب اس نے مشاطہ سے کہا ہم سب کا رب تو فرعون ہے پھر تُو کسے یاد کر رہی ہے؟ باندی نے جواب دیا کہ ہم سب کا رب فرعون نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہے۔'' یہ سُن کر فرعون بہت غضب ناک ہوا اور تانبے کی گائے کو خوب گرم کیا اور پہلے باندی کی دو بچیوں کو اس میں ڈالا۔ اس بے بس عورت نے صبر کیا۔ پھر اس کے دودھ پیتے بچے کو سپاہیوں نے جھپٹ لیا تب باندی کی سانس رکنے لگی۔ ایسے میں وہ تو مولود بول پڑا۔
''ماں صبر کر حق پر جان دینا نیکی ہے۔'' چنانچہ وہ اپنی بات پر قائم رہی کہ اُس کا رب اللہ تعالیٰ ہے۔'' فرعون نے اُس کے بیٹے کو، پھر اُس کو آگ میں ڈال دیا اور وہ سب جل کر راکھ ہو گئے۔ یہ خوشبو اس کے جنتی محل سے آرہی ہے۔'' (سبحان اللہ)

حسنِ انتخاب: زین شمسی۔ کراچی

''تہمت لگانا''

حضرت معاذ بن انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ''جس نے کسی مومن کو منافق کے شر سے بچایا اور اس کی حمایت کی تو اللہ روزِ قیامت ایک فرشتہ بھیجے گا جو اس کے گوشت کو جہنم کی آگ سے بچائے گا اور جس نے کسی مسلمان پر کسی غلط کام کی

تہمت لگائی بس اس کا مقصد اس مسلمان کی برائی ہو تو اللہ تعالیٰ اسے جہنم کے پل پر روک دیں گے۔ یہاں تک کہ وہ اس تہمت کے گناہ سے پاک ہو کر نکل جائے۔

مرسلہ: سدرہ۔ بہاولپور

بغاوت نہیں ہوتی

اس دیس میں لگتا ہے عدالت نہیں ہوتی
جس دیس میں انسان کی حفاظت نہیں ہوتی
مخلوق خدا جب کسی مشکل میں پھنسی ہو
سجدے میں پڑے رہنا عبادت نہیں ہوتی
ہر شخص سر پر کفن باندھ کے نکلے
حق کے لیے لڑنا تو بغاوت نہیں ہوتی

پسند: پروین شروانی۔ کراچی

اُف یہ میک اپ

ایک صاحب کی شادی ہوئی رات کو انہوں نے اپنی دلہن کو دیکھا جو میک اپ کی وجہ سے بہت حسین معلوم ہو رہی تھیں۔ رات کے پچھلے پہر دلہن منہ دھو کر سو گئی۔ صبح جب شوہر نامدار اٹھے تو اپنی بیوی کو دیکھ کر بولے۔

''سنیے ذرا اپنی لڑکی کو بھیج دیجیے۔''

مرسلہ: زرقا۔ لاہور

کمزوریاں

انسان کی دو بڑی کمزوریاں
پہلی بنا سوچے عمل کرنا
دوسرا سوچتے رہنا اور عمل نہ کرنا

مرسلہ: شاہد اللہ۔ پشاور

نصیحت

خوش رہنے کا سب سے اچھا اصول یہ بھی ہے کہ ''جہاں آپ کو لگے آپ کی ضرورت نہیں وہاں سے خاموشی سے اٹھ جانا بہتر ہے۔''

مرسلہ: زیبا۔ کراچی

ایک قطعہ

طلسم دل، دل جاں، طلسم رات باقی ہے
ابھی شاید محبت کی کوئی سوغات باقی ہے
جسے کہنے کی خواہش ہے جسے کہنے سے ڈرتی ہوں
ابھی وہ بات کہنی ہے ابھی وہ بات باقی ہے

پسند: راحیل۔ ملتان

پاک آرمی

پاکستان آرمی وہ واحد ادارہ ہے جہاں بروز جمعہ بعد نماز فجر قرآن خوانی ہوتی ہے اور صدقہ دیا جاتا ہے اور یہ عمل ہر یونٹ میں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے پاک آرمی کو بے حساب عزت عطا فرمائی ہے۔

مرسلہ: ریما نور۔ کراچی

لطیفہ

ایک کنجوس شاعر نے اپنے ملازم سے کہا تمہیں تو شاعری سے بڑی دلچسپی ہے اس شعر کا دوسرا مصرعہ بتاؤ۔

''آئی ہے عید روز مسرت لیے ہوئے''
ملازم نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔
''بیٹھے ہیں تنخواہ کی حسرت لیے ہوئے''

مرسلہ: افشاں۔ U.K

خوشی

خوشی چاہتے ہو تو اپنے ارد گرد اچھے لوگوں کا مجمع لگاؤ۔''

مرسلہ: فضا علی۔ سرگودھا

ایک سجدہ

حضرت موسیٰ کے پاس ایک عورت آئی اور عرض کی حضرت دعا کے لیے آئی ہوں۔ بچپن یا لڑکپن میں میرے بچے فوت ہو جاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ نے

پوچھا۔ "کتنی عمر میں فوت ہوتے ہیں۔" کہنے لگی۔ "کوئی سو سال کا کوئی دو سو سال اور کوئی تین سو سال کا ہو کر......" حضرت موسیٰؑ مسکرائے اور فرمایا۔ "اللہ کی بندی قربِ قیامت ایک ایسا وقت بھی آئے گا جب لوگوں کی عمریں سو سال سے بھی کم ہوں گی۔ عورت بولی۔" اے اللہ کے نبی کیا وہ لوگ اتنی کم عمری میں رہنے کے لیے مکان بنائیں گے۔" فرمایا۔ "وہ مکان بھی بنائیں گے شادی بیاہ بھی کریں گے اور کام کاروبار بھی کریں گے۔" یہ سن کر اس عورت نے ٹھنڈی سانس لی۔ حضرت موسیٰؑ نے دریافت کیا کہ "ٹھنڈی سانس کیوں لی؟" وہ بولی۔ "اے اللہ کے نبی اگر میں اس دور میں ہوتی تو اتنی کم عمری میں تو میں ایک سجدے ہی میں زندگی گزار جاتی۔"

مرسلہ: رومین الماس۔ ملتان

قطعہ

گو نہ سمجھوں اس کی باتیں گو نہ پاؤں اس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا
ہے خیال حسن میں حسن عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے، میری گور کے اندر کھلا

شاعر: جہاں زیب۔ کرک

اضافہ

ٹیچر نے بچوں سے پوچھا بتاؤ وہ کون سا جانور ہے جو بہت تیزی سے بڑھتا ہے؟ ایک بچے نے کھڑے ہو کر جواب دیا۔ "ٹیچر مچھلی......!"

ٹیچر نے اس کو شاباش دی اور پوچھا۔ "کیا تم مجھے مچھلی کے بڑھنے کی رفتار بتا سکتے ہو؟"

بچے نے جواب دیا۔ "جی ہاں پچھلے ہفتہ ابو جان نے ایک مچھلی پکڑی تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ روزانہ اس میں 2'3 انچ کا اضافہ کر دیتے ہیں اور ابھی اس میں اسی رفتار سے اضافہ جاری ہے۔"

مرسلہ: رمشا۔ کراچی

کام کی باتیں

مشکلات کا مقابلہ کرنے کا نام زندگی ہے اور ان پر قابو پانے کا نام کامیابی ہے۔

ایسی دولت قبول مت کرو جو اپنوں سے دور کر دے۔

مسکراہٹ خوبصورتی کی علامت ہے اور خوبصورتی زندگی کی۔

بولنے میں ایسی تاثیر پیدا کرو کہ بات دل میں اتر جائے، ورنہ چپ رہو۔

مرسلہ: ثمینہ۔ اٹک

بھروسہ

اپنے رب پر ہمیشہ بھروسہ رکھو کیونکہ اللہ تعالیٰ وہ نہیں دیتا جو ہمیں اچھا لگتا ہے بلکہ وہ دیتا ہے جو ہمارے لیے اچھا ہوتا ہے۔

مرسلہ: عمرانہ۔ کراچی

اس عہد کے بچے

ایک بچے نے اپنی ماں سے کہا۔ "امی ابو کتنے کمزور اور بوڑھے نظر آتے ہیں بالکل دادا ابو کی طرح مگر آپ اتنی ینگ اور خوبصورت ہیں کیوں؟" ماں نے خوش ہو کر پرس میں ہاتھ ڈالا اور پچاس روپے نکال کر بیٹے کو دیے۔

بیٹے نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "صرف پچاس روپے ابو تو مجھے جھوٹی تعریف کے لیے سو روپے دیتے ہیں۔"

مرسلہ: ظل ہما۔ چکوال

ایمان کی تجدید

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "اپنے ایمان کی تجدید کرتے رہا کرو۔" کسی نے پوچھا۔ "یا رسول اللہ ﷺ ہم اپنے ایمان کی تجدید کیسے کر سکتے ہیں۔

آپ ﷺ نے فرمایا: "لا الہ الا اللہ کی کثرت کیا کرو۔"

مرسلہ: کنزیٰ علی۔ سیالکوٹ

کم عقل

ایک چھپکلی نے دوسری چھپکلی سے کہا۔ "یہ انسان بھی کتنا کم عقل ہے۔ لاکھوں روپے خرچ کر کے چھت بنواتا ہے اور رہتا زمین پر ہے۔"

مرسلہ: ہاشم احمد۔ جہانیاں

خوبصورت شعر

قتل طفلاں کی منادی ہو رہی ہے شہر میں
ماں ! مجھے مثل موسیٰ تو بہادے نہر میں

مرسلہ: فائزہ شمس۔ گجر خان

طاقت ور الفاظ

بعض اوقات سب سے طاقت ور الفاظ آپ کی خاموشی ہوتی ہے کیونکہ جو آپ سے محبت کرتا ہے وہ آپ سے وضاحت چاہے گا نہیں اور جو آپ سے محبت نہیں کرتا وہ آپ کی وضاحت مانے گا نہیں۔

مرسلہ: سلمیٰ۔ بحرین

احتیاط

"کل بازار میں تم جس خوبصورت اور اسمارٹ خاتون کے ساتھ گھوم رہے تھے وہ کون تھی؟"
"اگر تم وعدہ کرو کہ یہ الفاظ میری بیوی کے سامنے نہیں دہراؤ گے تو بتا دیتا ہوں۔"
"ٹھیک ہے وعدہ رہا!"
"وہ میری بیوی ہی تھی۔"

مرسلہ: مسز عقیل۔ لاہور

پردہ

وہ چیزیں جن کا پردہ رکھنا بہت ضروری ہے۔
کسی کا عیب' دل کا بھید' سفر کرنے کی سمت' اپنی تجارت کا فائدہ اور نقصان' امانت کی بات' پوری طاقت' زیادہ ضرورت۔

مرسلہ: فاخرہ۔ پنڈی گھیپ

کشش

شریر طالب علم نے استاد سے پوچھا۔ "جناب عورت کی کشش اور زمین کی کشش میں کیا فرق ہے؟"
"کچھ خاص نہیں دونوں ہی آدمی کو خاک میں ملا دیتی ہیں۔" استاد نے سنجیدگی سے جواب دیا

مرسلہ: شمسہ خان۔ کوئٹہ

بچپن

سب سے خوبصورت دور بچپن کا ہوتا ہے جب تتلیوں کے پیچھے بھاگنا، بارش میں کھیلنا، مٹی کے گروندے بنانا، پڑوسیوں کے دروازے پر لگی گھنٹی بجا کر بھاگنا اور مٹی سے اٹے ہاتھ کپڑوں سے پونچھنا بہت اچھا لگتا ہے۔

مرسلہ: تنزیلہ شاہ۔ حیدر آباد

سوا سیر

"اللہ کے نام پر چائے پینے کے لیے پچاس روپے دیتے جائیں۔"
"لیکن چائے پچاس روپے کی تو نہیں آتی؟"
"یہ تو مجھے بھی معلوم ہے، لیکن میرا آج دوستوں کے ساتھ پینے کا ارادہ ہے۔"

مرسلہ: محمد احسن نوید۔ کراچی

دو جہاں......

اک یہ جہاں، اک وہ جہاں
ان دو جہاں کے درمیاں
بس فاصلہ اک سانس کا
جو چل رہی تو یہ جہاں......
جو رک گئی تو وہ جہاں......

پسند: تمنا شیخ۔ لاہور

نئے لہجے، نئی آوازیں

"مائی"

ٹھنڈے میٹھے پانی کی اک نہر بہا کرتی ہے
میرے گاؤں کی جس گلی میں مائی، ماں سی رہا کرتی ہے
کل کے بچے اِک اِک کر کے تنہا اُس کو کر گئے
کوئی گیا بدیس تو باقی شہر میں جا کے بس گئے
ہر ماہ ایڑی پیسے سے روپے اُسے مل جاتے ہیں
اُن روپوں کی گرمی سے دل کے زخم کھل جاتے ہیں
موبائل کی اک گھنٹی کی آس روز اُسے جگاتی ہے
دو چار کر کے باتیں بیٹی پہروں اُسے رُلاتی ہے
رات گئے وہ بوڑھی مائی ابدی نیند سو گئی
بیٹے پہنچے بروقت نہ بدیس سے بیٹی لوٹی
اب بھی ٹھنڈے میٹھے پانی کی اک نہر بہا کرتی ہے
وہ مائی، ماں سی قبر میں سویا کرتی ہے

شاعرہ: مومینہ بتول۔ کراچی

تُو ہی تُو

بیکراں خیالوں کے سمندروں پہ شب
دھیرے سے اُترتی ہے
آنکھ بند کرتے ہی
یاد کی سبھی شمعیں آپ جلنے لگتی ہیں
میں ساحلوں کی اور چپکے چپکے بڑھتی ہوں
ننگے پاؤں ساحل کے پانیوں پہ چلتی ہوں
ایسا لگتا ہے مجھ کو...... جیسے کھل رہی ہوں میں
نیند کی مسافت ہے جس پہ چل رہی ہوں میں
نیند گہری ہونے تک پہلے پاؤں گھلتے ہیں
پھر دھیرے دھیرے سب اعضاء
پانیوں میں ڈھلتے ہیں
بہہ کہاں میں جاتی ہوں کچھ خبر نہیں رہتی
چہار سو جدھر دیکھوں
ہر طرف بس تُو ہی تُو!
ہے خیال کی صورت بہتے خواب کی صورت

شاعرہ: خولہ عرفان۔ کراچی

رشتے

اُلجھتے جا رہے ہیں رشتے آپس میں
رنگین کچے دھاگے ہوں جیسے!
ایک سِرا تو ڈھونڈو تو دوسرا ہو گم
اک ندی کا دوسری ندی سے فاصلہ جیسے
رشتے کانچ کی طرح صاف شفاف کیوں نہیں
نمی کے موسم میں آئینے پر داغ ہوں جیسے
میرے دل کو چیر کر کوئی دیکھے نسیم
رشتے ایسے سمندر کی گہرائی میں موتی جیسے
ہوتی گرد رشتوں کی کوئی قیمت بھاری
لوگ انہیں خزانے کی طرح چھپاتے جیسے
کاش یہ زندگی کسی کے کام آجائے
بن جاؤں میں امن کی فاختہ ہو جیسے
بغیر اپنوں کے زندگی تو ہماری ایسی
لق و دق صحرا میں پانی کی تلاش ہو جیسے

شاعرہ: شبانہ نسیم۔ کراچی

اِس طرح نہیں کرتے

جب سے تمہیں دیکھا ہے، جب سے تمہیں جانا ہے
چاہتوں کے رستے پہ بے اختیار چلتے ہیں
تیرا ذکر جو کر دے، وہ بھی اچھا لگتا ہے
پھر اُس سے تیرے بارے میں

ڈھیروں باتیں کرتے ہیں
جس راہ پر تُو چلے وہ رہگزر مہکتی ہے
تیرے نقش پا پہ پھر دیوانہ وار چلتے ہیں
پھر بھی تیرے ماتھے کے بل کیوں کم نہیں ہوتے
تیری اک نظرِ محبت کی پانے کو ہم ترستے ہیں
جو دل میں تجھے رکھتے ہیں جو تیری راہ تکتے ہیں
جو تیرا درد سہتے ہیں
اُن چاہنے والوں سے یوں
منہ پھیر کر نہیں چلتے
اُن کے ساتھ اے جانِ وفا
اس طرح نہیں کرتے

شاعرہ: راحت وفا راجپوت۔ لاہور

ارمان مرے......

ربا میرے
تیرے در پر
عمر کی نقدی پاٹ دی میں نے
مجھ پر کسی نے ترس نہ کھایا
دل کے میرے ارمانوں کا
کیسے سب نے لہو بہایا
ربا میرے! دیکھ لے اب تُو
بیچ صحن بس کھاٹ پڑی ہے
جس پر ساون رُت میں بھی اب
ارمانوں کی لاش بچی ہے
کاش اے ربا! میں نہ ہوتی
ہوتی تو بیٹی نہ ہوتی ......
کاش کہ میں بیٹی نہ ہوتی ......

شاعرہ: شازلی سعید مغل۔ کراچی

ہمارا پیار

ہماری محبت کی بس اتنی ہے کہانی
جیسے جھیل کنول میں بہتا پانی
نین سے جب ملے نین
بے قرار دل کو آ گیا چین
آنکھ ملی، دل ملے اور ہم ملے
یوں ہی چلتے رہے پیار کے سلسلے
عہد و پیماں ہوئے جینے مرنے کے وعدے ہوئے
ہم اڑتے رہے اُفق کے پار
بادلوں کے ٹکڑے چلے بن کر قطار
یہ نیلا گگن پیاری سی دھرتی
ہمارے پیار کی ہے گواہ

شاعرہ: مسز نگہت غفار۔ کراچی

مجھے تم سے محبت ہے

مجھے تم سے یہ کہنا ہے، مجھے تم سے محبت ہے
بھلے انجان تم مجھ سے' بھلے انجان میں تم سے
مگر یہ عشق سچا ہے
تمہارے عشق کا مجھ کو...... لگا یہ روگ پکا ہے
بھلا تم روز آ کر کیوں
میری نیندیں چراتے ہو، جو نیندیں نہ چرا پاؤ
تو کیوں' چپکے سے خوابوں میں
تم آ کر یوں ستاتے ہو
مگر...... سچ تو یہی ہے کہ
تمہارا یوں میری نیندیں چرانا
اچھا لگتا ہے
تمہاری ہر ادا سے اب تو مجھ کو عشق ہے جاناں
چلو...... خاموش ہوتی ہوں
لبوں کو سی ہی لیتی ہوں
مگر اک بات کہنی ہے
مجھے تم سے محبت ہے، مجھے تم سے محبت ہے

شاعرہ: عائشہ شفقت۔ ساہیوال

اے آر وائی کے خوبصورت پروگرام

م ش خ

قارئین گرامی حقیقی کامیابی بہت زیادہ محنت کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ ARY ڈیجیٹل نیٹ ورک کے پروگرام اب ایک خوبصورت تاریخ کو جنم دے رہے ہیں۔ ARY ڈیجیٹل' ARY زندگی' دی میوزک' کیو ٹی وی' نک اور H.B.O کے پروگراموں نے جو منفرد مقام حاصل کیا ہے اُن میں بے شمار پروگرام ہمارے ناظرین اور قارئین کے ذہن کی دہلیز پر موجود ہوں گے اور یہی معیاری چینلز ہونے کی دلیل ہے۔ اگر چینل کے پرورگرام اپنی مثال آپ ہوں گے تو وہ یقیناً کامیابی اور کامرانی کا ثبوت ہیں۔ جب جیت کی وسعت اپنے زینے عبور کرتی ہے تو کام کرنے والوں کے جذبے چاند کی طرح روشن ہوجاتے ہیں۔ ناظرین اور قارئین ARY نیٹ ورک کے پروگرام دلوں کی روایتوں سے جڑے ہوتے ہیں۔ مانا کہ آپ کے دیئے ہوئے حوصلے کی وجہ سے ہمارے پروگراموں میں فکری پختگی کے آثار نظر آتے ہیں اور ہم نئے نئے پروگرام اچھے موضوعات پر تشکیل دیتے ہیں جس کی زندہ مثال ہمارے خوبصورت سوپ اور سریل ہیں۔ غرض ARY ڈیجیٹل نیٹ ورک کے پروگراموں اور فن پاروں پر کہاں کہاں روشنی ڈالیں بس یہ سمجھ لیں کہ ناظرین نے ہمارے جذبے اور حوصلے بلند و بالا کر رکھے ہیں اگر ناظرین ہمیں اپنی محبت کے چھاؤں تلے نہ رکھتے تو نہ جانے ہم کیسے اپنے حوصلے بلند کر پاتے آیئے ناظرین گرامی اب چلتے ہیں ARY کے پروگراموں کی طرف جو آپ کے منتظر ہیں۔ پہلے چلتے ہیں ڈراموں کی طرف ARY کے ڈراموں کی قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس کے ڈرامے ہمارے خاندان کے طور طریقے اور معاشرے کی اونچ نیچ پر بھرپور روشنی ڈالتے ہیں۔ ہماری آن ایئر ہونے والی سیریل ''انابیہ'' کا مرکزی خیال کچھ یوں ہے کہ پتہ نہیں اس بات میں کتنا سچ ہے کہ خوبصورت لڑکیاں اکثر بدقسمتی کا شکار ہوجاتی ہیں۔

انابیہ ایک خوبصورت لڑکی ہے جس کا تعلق ایک متوسط طبقے سے ہے اور ایسے گھرانوں میں شادیوں کے فیصلے عقل سے نہیں جذبات سے کیے جاتے ہیں۔ انابیہ کی شادی اُس کے علاقے کے قرب وجوار میں رہنے والی راشدہ کے بیٹے عبید سے ہوتی ہے۔ راشدہ نے اپنی بیٹی فرح اور بیٹے عبید کی تربیت سخت اور بے جا پابندیوں کے درمیان کی ہے اور انابیہ کے لیے یہ بہت مشکل مقام ہوتا ہے کیونکہ گھر کا ماحول بتا رہا تھا کہ عبید کی ماں راشدہ کا کنٹرول پورے گھرانے پر مکمل طور پر ہے جبکہ دوسرا احساس اُس کے لیے دل دہلانے والا تھا کہ بظاہر انتہائی بے ضرر اور معصوم دکھائی دینے والا اس کا شوہر عبید شکی مزاج' کینہ پرور انسان ہے۔ جو دنیا بھر میں سوائے اپنی ماں اور بہن کے کسی کو معصوم نہیں سمجھتا بس یہی سے انابیہ

کی پریشانیوں کا آغاز ہوتا ہے اور یہ مشکلات انابیہ کی کب ختم ہوں گی اس کے لیے ARY ڈیجیٹل کی سیریل 'انابیہ' جو ہر ہفتہ کی رات 9 بجے دکھائی جارہی ہے۔جس کے مصنف عاطف علی اور ہدایت افتخار راضی کی ہیں جبکہ فنکاروں میں نیلم منیر' کامران جیلانی' ذکیہ دانیال' خالد انعم' سیمی پاشا' وسیم عباسی اور دیگر شامل ہیں۔مصنف عمران نذیر اور ہدایت کار امین اقبال کی سیریل 'کھوٹ' کی کہانی جاوید اور مائرہ کی ہے جو یونیورسٹی میں ساتھ پڑھتے ہیں۔جاوید ایک سلف میڈ انسان ہے کیونکہ اُس کا خاندان زیادہ تعلیم یافتہ نہیں ہے اور پھر جاوید پر اپنی بہنوں کی ذمہ داریاں بھی ہیں جبکہ

ARY ڈیجیٹل کی سیریل 'کھوٹ' میں ژالے سرحدی' جبران خان اور ندا خان

مائرہ ایک بہت ہی امیر خاندان سے تعلق رکھتی ہے دو بھائیوں کی اکلوتی بہن ہونے کے ناطے والدین کی بہت لاڈلی ہے اور اسی محبت نے اُسے ماڈرن اور اسٹائلش بنادیا ہے۔جاوید کی پھوپو کی لڑکی فائزہ بھی جاوید کو بہت پسند کرتی ہے جبکہ اس کی پھوپو ساجدہ اکثر جاوید کے گھرانے کی مالی مدد کرتی ہیں جس کی وجہ سے جاوید اور اُس کا خاندان پھوپو ساجدہ کا احسان مند ہے ۔ساجدہ نے اس امید پر جاوید کو اپنا ایک گھر اکیڈمی کے لیے دے رکھا ہے کہ جاوید کے ساتھ اس کی بیٹی فائزہ کی شادی ہوجائے گی جبکہ جاوید کا خرچ اسی اکیڈمی سے چل رہا ہے اور اس کی آمدنی جاوید اپنے گھر والوں کو بھی دے رہا ہے۔اب جاوید کے لیے فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے ایک جگہ اُس کی پھوپو ساجدہ کے جاوید پر نہ ختم ہونے والے احسانات ہیں جبکہ دوسری طرف مائرہ کی چاہت کی وجہ سے جاوید امتحانوں میں گھر گیا ہے۔اب اس کہانی کا انجام کیا ہوگا یہ تو سیریل 'کھوٹ' دیکھنے کے بعد ہی چلے گا سیریل کے فنکاروں میں میران خان' فردوس جمال' رابعہ نورین' نادیہ خان' ژالے سرحدی' حمیرا اظہر' ماریہ واسطی' اسلم شیخ اور جاوید شیخ قابل ذکر ہیں یہ سیریل ہر پیر کی رات 9 بجے ڈیجیٹل سے دکھائی جائے گی۔اور اب کچھ تذکرہ ہوجائے ARY زندگی سے آن ایئر ہونے والا خوبصورت شو 'سلام زندگی' کا ناظرین ARY زندگی نے شک وشبہ سے بالاتر ہوکر معتبر انداز میں سُر سنگیت اور راگنیاں کے خوبصورت رنگ اودھم مچاتے ہوئے پروگرام 'سلام زندگی' کی کامیابی کی جھولی میں ڈال کر صبح کے ہونے والے مارننگ شو میں اُسے اعلیٰ مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔پروڈیوسر

کامران یوسف اور سینئر کونٹینٹ پروڈیوسر منزہ فراز نے مارننگ شو 'سلام زندگی' کے حوالے سے بتایا کہ اب تک

ARY زندگی کے پروگرام 'سلام زندگی' میں فیصل قریشی اور سوہا ابڑو

اس تحریر تک ہمارے پروگرام میں بدر خلیل، پروین اکبر، روبینہ اشرف، نادیہ حسین، سعود، میرا، گلوکار فاخر نے 'سلام زندگی' میں شرکت کی اس پروگرام میں بدر خلیل اور روبینہ اشرف نے زندگی کے تجربات کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا جبکہ نوجوان نسل نے ریمبو صاحبہ سعود، نادیہ حسین، پروین اکبر فاخر اور میرا کی گفتگو کو بہت انجوائے کیا۔ اس پروگرام کی خاص خوبی یہ ہے کہ زیادہ تر گلوکار پاکستانی گیت پر بھرپور طریقے سے حصہ لیتے ہیں اور ایدھی کی خواتین نے اس شو میں خصوصی شرکت کی اور مزے کی بات دیکھیں کہ پانچ سال سے لاپتہ فیصل آباد کی لڑکی 'سلام زندگی' مارننگ شو کے توسط سے والدین کو ملی جو ہمارے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں جبکہ ہمایوں سعید اور نعمان مصور نے بڑی گہری اور خوبصورت باتیں ARY زندگی سے کیں جسے ناظرین نے بہت سراہا۔ سینئر کانٹینٹ پروڈیوسر منزہ فراز نے سلام زندگی کے بارے میں بتایا کہ اس پروگرام کے ہوسٹ فیصل قریشی ہیں اس پروگرام میں ان کی فیملی نے بھی شرکت کی یہاں میں نے محسوس کیا کہ ماں کس طرح اپنی اولاد سے پیار کرتی ہے۔ افشاں جو فیصل قریشی کی والدہ ہیں نے کائنات کے حقیقی رنگ کس طرح ممتا بھرے چہرے کے ساتھ فیصل قریشی پر نچھاور کر دیے اس لیے کہ ماں کی چاہت مقدس روح کی طرح ہوتی ہے پھر فیصل کی بیٹی آیت اپنی دادی ماں اور باپ کو دیکھ کر کتنے عزم واستقلال سے خوش ہو رہی تھی اور اُن کی بیگم ثنا بھی پروگرام کی خوبصورتی کو دیکھ کر کافی خوش نظر آ رہی تھیں۔ ناظرین گرامی صبح کے اوقات میں آن ایئر ہونے والے مارننگ شوز میں ''زندگی'' سے آن ایئر ہونے والے شو 'سلام زندگی' نے اسے تہذیب اور شائستگی کے ساتھ برقرار رکھا ہے اس شو کے سینئر پروڈیوسر مصور ہیں۔ مارننگ شو 'سلام زندگی' پیر سے لے کر جمعہ تک صبح 9 بجے سے لے کر 11:30 تک ARY زندگی سے دکھایا جا رہا ہے جبکہ ARY زندگی سے دیکھائے جانے والے سوپ 'خوشحال سسرال' نے لوگوں کے دلوں میں بسرا کر لیا ہے۔ ناظرین کی ایک بڑی تعداد اسے دیکھ رہی ہے یہ سوپ پیر سے لے کر جمعرات تک ARY زندگی سے رات 7 بجے دکھایا جا رہا ہے اس کے فنکاروں میں فرقان قریشی، فضیلہ لاشاری، شائستہ جبیں، سعدیہ غفار، روبینہ اشرف انور اقبال، اسعد، افراز اور رض کمالی قابل ذکر ہیں ادھر ARY نیوز کے خوبصورت پروگرام 'کریمنلز موسٹ وانٹڈ' ڈائریکٹر پروڈیوسر کرلمیالوجسٹ مصنف اور ہوسٹ علی رضا رات 11 بجے اتوار کو ARY نیوز سے پیش کر رہے ہیں جسے ناظرین کی ایک بڑی تعداد دیکھ رہی ہے۔

☆☆......☆☆

"چٹ پٹی خبریں"

وہ خبریں جو آپ کا موڈ بدل ڈالیں......

میں پاکستان کا مالک ہوں

عاشر عظیم کی فلم مالک پردہ اسکرین پر جلوہ افروز ہوگئی ۔ ملک سے محبت کے جذبے سے سرشار اور جرائم اور کرپشن سے بے زار انتہائی

مضبوط اسکرپٹ کے ساتھ اس فلم نے آتے ہی دھوم مچادی۔ فلم میں موجود ہر فنکار نے اپنے کرداروں کے ساتھ مکمل انصاف کیا ہے۔ مالک ایک لاجواب تخلیق ہے۔جس کو ہر پاکستانی کو ایک بارضرور دیکھنا چاہیے۔

فین

شاہ رخ خان کی فلم 'فین' زور وشور کے ساتھ ریلیز ہوگئی۔اس فلم میں لوگوں نے فین کے کردار میں کنگ خان کی اداکاری کو بہت سراہا۔ مختلف موضوع پر بنائی جانے والی فلم میں گانوں کی بالکل

بھرمار نہیں ہے۔شاہ رخ خان کا کہنا ہے کہ مجھے بھی 'فین' کے کردار کو کرنے میں خاصی دشواری پیش آئی۔ نوعمر لڑکے کا اس عمر میں کردار کرنا مشکل کام ہے۔ پھر روزانہ پانچ گھنٹے میک اپ آرٹسٹ کے ساتھ گزارنا بہت صبر آزما کام تھا۔ بہرحال کنگ خان کی محنت لگتا ہے وصول ہوگئی

کیونکہ شاہ رخ خان کے مداح فلم کو بہت پسند کر رہے ہیں۔

میں نے معاف کیا

سینئر اداکارہ بدر خلیل جو فواد خان کے رویے سے نالاں ہو کر ملک ہی چھوڑ گئی تھیں۔ انہوں نے

وضاحت کی ہے کہ دوران ایوارڈز ان کے ساتھ جو غیر مناسب رویہ رکھا گیا تھا۔ اس کی ذمہ داری فواد خان پر نہیں آتی بلکہ ہم ٹی وی اس نامناسب رویے کا ذمہ دار ہے۔ چینل کی ذمہ داری ہے کہ سینئر اداکاروں کو پوری عزت اور احترام کے ساتھ مدعو کیا جائے اور جونیئر اداکاروں کو بھی بڑوں کی عزت اور احترام کی ترغیب دی جائے۔

عائزہ خان کا اعزاز

ڈرامہ انڈسٹری کا ایک اور روشن ستارہ عائزہ خان جنہوں نے ثابت کیا کہ پاکستانی خواتین کسی سے بھی کم نہیں۔ خوبصورت خواتین کی فہرست میں عائزہ کا نمبر ستائیسواں ہے جبکہ کل پچاس خواتین اس فہرست میں شامل ہیں۔ یہ سروے انڈیا کے ایک مشہور جریدے کے زیر اہتمام کیا

گیا۔ حالانکہ عائزہ کو ایسے کسی سروے کی ضرورت نہیں پاکستانی ڈرامے کے شوقین جانتے ہیں کہ عائزہ خوشکل ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت باصلاحیت اداکارہ بھی ہیں۔

مبارکاں

ARY فلم ایوارڈز جو اپریل میں دبئی میں

منعقد کیے گئے اس میں جاوید شیخ صاحب کو لائف

ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازہ گیا۔ اس موقع پر شوبزنس سے وابستہ تمام بڑے نام موجود تھے۔ اس رنگا رنگ محفل میں فلم انڈسٹری سے جڑے کئی فنکاروں کو اُن کی کاوشوں پر اعزازات سے نوازہ گیا۔ جاوید شیخ صاحب کی فنی صلاحیتوں کا تو ایک زمانہ معترف ہے۔ ان کی خدمات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں لہٰذا لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ کے سب سے صحیح حقدار بھی وہی تھے۔

لوٹ کے بدھو

خبریں گرم ہیں کہ وینا ملک جو شادی کے بعد بیرون ملک مقیم تھیں اب واپس وطن لوٹ آئیں

ہیں اور لاہور میں شوہر اور بچوں کے ساتھ مقیم ہیں۔ وہ سیریل کی تیاری میں مشغول ہیں اور جلد بڑی دھماکے دار انٹری دینے والی ہیں۔

فوج سے محبت ہے

مشہور اداکار فرحان علی آغا کہتے ہیں کہ فوج سے محبت مجھے ورثے میں ملی ہے۔ میرے والد ایئر فورس پائلٹ تھے۔ اس لیے بچپن سے ہی فوج کے ڈسپلن اور مہارت کے قصے سُنے اور پھر وہ محبت بن کر خون میں شامل ہوگئے۔ ہمارے پڑھنے والوں کو یاد رہے کہ فرحان علی آغا نے

عاشر عظیم کی فلم میں فوجی کا کردار ادا کیا ہے جو اُن کی محبت اور مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

نئی فلمیں

ہمایوں سعید شوبزنس انڈسٹری کا بڑا اور جانا پہچانا نام، کہتے ہیں کہ جلد مزاحیہ فلم ''میں پنجاب

نہیں جاؤں گی'' بنانے کا ارادہ ہے۔ یہ فلم پنجاب کے کلچر پر بنائی جائے گی۔ فلم میں مرکزی کردار ہمایوں سعید اور ایمان علی ادا کر رہے ہیں۔

☆☆......☆☆

دوشیزہ قارئین کی فرمائش پر اب سے انتہائی سہل کھانے کی تراکیب پیش کی جارہی ہیں وہ تراکیب جو عام زندگی میں سہولت کے ساتھ استعمال کی جاسکیں۔

پسندے

اجزاء

چکن	1 کلو (پارچے بنوالیں)
دہی	1 پاؤ
گرم مسالا	1 چائے کا چمچہ
پیاز	2 سے 3 عدد (درمیانہ)
ثابت دھنیا، زیرہ	1,1 چائے کا چمچہ
نمک	حسبِ ذائقہ
لہسن، ادرک (پسا ہوا)	1,1 چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا، ہری مرچ	حسبِ پسند
سبز الائچی	چار عدد
گھی	حسبِ ضرورت

ترکیب:

ثابت زیرہ، سوکھا دھنیا اور ثابت سرخ مرچ ان تینوں کو ہلکی آنچ پر بھونیں۔ جب خوشبو آجائے تو ان کو موٹا کوٹ لیں، اب دہی کو پھینٹ لیں پھر اس میں کُٹا ہوا مسالا اور نمک ڈال کر مکس کریں اور اس میں گوشت ڈال کر اچھی طرح مکس کریں اور ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پیاز لچھے دار کاٹ کر گھی میں براؤن کرلیں۔ لہسن، ادرک ڈال کر بھونیں۔ جب لہسن کی خوشبو ختم ہوجائے تو دہی ملا گوشت ڈال کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ ساتھ ہی سبز الائچی ثابت بھی ڈال دیں، جب گوشت گل جائے اور گھی علیحدہ نظر آنے لگے تو اتاریں اور گارنش کے لیے سبز دھنیا اور سبز مرچ باریک کاٹ کر ڈالیں اور پیش کریں، ٹرائی کریں انشاء اللہ مجھے ضرور یاد کریں گی۔

مزیدار تکے

اجزاء

گوشت (گائے کا)	ڈھائی سو گرام
کالی مرچ	نصف چمچہ
پیاز	پچاس گرام
گرم مسالا	ایک چائے کا چمچ
لیموں کا رس	ایک عدد
گھی	پچیس گرام
ٹماٹر	چار عدد
نمک، سرخ مرچ	حسبِ ضرورت

ترکیب:

گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرلیں۔ پیاز چھیل کر گول گول ٹکڑوں میں کاٹ لیں اور ٹماٹر گول قتلوں کی طرح کاٹ لیں۔ گرم مسالا، لیموں، کالی مرچ، نمک، سرخ مرچ، مکس کرلیں

اب ان مسالہ جات کو گھی میں ہلکی آنچ پر بھون لیں اور گوشت کے ٹکڑے اس مسالے میں اچھی طرح مکس کر لیں۔ سلاخ میں اس طرح پروئیں کہ ایک ٹکڑا گوشت کا اور ایک ٹکڑا ٹماٹر اور پیاز کا لگائیں اور کوئلوں کی دہکی آگ پر سرخ کر کے پکائیں۔ زبردست مزیدار تکے تیار ہیں خود بھی کھائیں اور گھر والوں کو بھی کھلائیں اور داد وصول کریں۔

چائنیز رائس جھینگوں کے ساتھ

اجزاء

چاول	آدھا کلو
جھینگا	ایک پاؤ
انڈے	تین عدد
پیاز موٹی کٹی ہوئی	دو عدد
چائنیز ساس	آدھا چمچ

ترکیب:

چاول میں ذرا سا نمک ملا کر دو کنی ابال لیں اور پانی نتھار کر چاول کو کسی صاف اور خشک کپڑے پر پھیلائیں تاکہ وہ بالکل خشک ہو جائیں۔ جھینگے میں نمک ملا کر آدھا گھنٹہ پہلے رکھ دیں اس کو تیل میں تل لیں۔ جھینگا تلنے کے بعد اسے کڑاہی سے نکالیے نہیں بلکہ انڈا پھینٹ کر اس میں شامل کر لیں اور انڈے کو چمچے سے اچھی طرح چلائیں تاکہ جمنے نہ پائے اب چاول میں انڈا اور جھینگا ڈال دیں۔ آدھا چمچ چائنیز ساس بھی ڈال دیں۔ چاول کو پانچ منٹ دم کے بعد اُتار لیں۔

چکن فرائیڈ کٹلس

اجزاء

چکن کا قیمہ	ایک پاؤ (بغیر ہڈی)
سبز مرچ	تین سے چار عدد (کٹی ہوئی)
کالی مرچ	آدھا چمچ
گرم مسالا (پسا ہوا)	آدھا چمچ
لیموں کا رس	ایک چمچ
گارلک پیسٹ	ایک چمچ
تیل	تلنے کے لیے
انڈا	ایک عدد
نمک	حسب ذائقہ
پیاز (پسی ہوئی)	دو عدد

ترکیب:

قیمے کو ایک باؤل میں ڈال کر نمک، ہری مرچ پیاز گارلک پیسٹ گرم مسالا، کالی مرچیں، لیموں کا رس اور پھینٹا ہوا انڈا لیں، ان تمام اشیاء کو قیمے میں مکس کر لیں اور ایک گھنٹے تک میری نیٹ کریں اس کے بعد ان کے کٹلس بنا لیں، ایک پین میں تیل گرم کریں پھر ان کٹلس کو بریڈ کرم میں اچھی طرح لت پت کر کے تل لیں۔ جب یہ دونوں طرف سے سرخ ہو جائیں تو ایک پلیٹ میں نکال لیں، اور چٹنی کے ساتھ پیش کریں اور داد وصول کریں کیونکہ میں بھی داد وصول کر چکی ہوں۔ اور ڈھیر ساری دعاؤں سے نوازیں۔

میٹھی چٹنی

اجزاء

کیریاں (چھلکا اتری ہوئی)	ایک پاؤ
چینی	آدھا کلو
ثابت لال مرچ	سات عدد
کلونجی	ایک چمچہ
تیل	آدھی پیالی

ترکیب:

ایک برتن میں تیل گرم کر کے کلونجی کو

کڑکڑائیں، مرچ بھی موٹی موٹی کوٹ کر ڈال دیں پھر اس کے ساتھ ہی چینی اور کیریاں شامل کر کے ہلکی آنچ پر پکنے دیں۔ اوپر ڈھکنا ڈھک دیں تا کہ کیریاں گل جائیں۔ گل جانے پر ڈش آؤٹ کر کے کھانے کے ساتھ پیش کریں۔ مزیدار چٹنی تیار ہے۔

نان خطائی

اجزاء

گھی	ایک کپ
چینی	ایک کپ
الائچی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
بیسن (بھنا ہوا)	2 کھانے کے چمچے
سوجی	2 کھانے کے چمچے
میدہ	2 کپ
نمک	ایک چٹکی
بیکنگ پاؤڈر	2 چائے کے چمچے
کھانے کا سوڈا	1/4 چائے کا چمچہ
ونیلا ایسنس	1 کھانے کا چمچہ
سوکھا دودھ	2 کھانے کے چمچے
بادام (کٹے ہوئے)	ایک کھانے کا چمچہ
پستہ (کٹے ہوئے)	ایک کھانے کا چمچہ
انڈہ	ایک عدد

ترکیب:

میدے کو چھان لیں اور بادام، پستہ اور میدہ کے علاوہ تمام اشیاء کو اچھی طرح پھینٹ لیں پھر آہستہ آہستہ میدہ ملائیں اور نرم سا آٹے کی طرح گوندھ لیں۔ چھوٹے چھوٹے چپٹے سے پیڑے بنائیں اور اس پر برش سے انڈا لگا دیں بیکنگ ٹرے میں رکھ کر 150 پر بیک کر لیں۔

ڈبل روٹی کا حلوہ

اجزاء

ڈبل روٹی	چھ ٹکڑے
دودھ	ایک کلو
چینی	حسب ذائقہ
گھی	حسب ضرورت
بادام	دس سے بارہ عدد (باریک کٹے ہوئے)
کیوڑہ	چند قطرے
الائچی	چھ عدد

ترکیب:

ایک پتیلی میں دودھ چڑھا دیں۔ اُبال آنے کے بعد اتنا پکائیں کہ دودھ گاڑھا ہو جائے۔ ڈبل روٹی کے سخت کناروں کو کاٹ لیں۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیں۔ اب ان ٹکڑوں کو دودھ میں شامل کر دیں۔ چمچ سے برابر چلاتی رہیں۔ جب دودھ خشک ہو جائے تو گھی ڈال کر بھونیں۔ اس کے بعد اس میں چینی شامل کر دیں اور دوبارہ سے بھونیں، پھر بادام اور کیوڑہ ڈال کر چولہے سے اتار لیں۔ لذیذ ڈبل روٹی کا حلوہ تیار ہے۔

کوکونٹ کھیر

اجزاء

ناریل	پچاس گرام (کدوکش کیا ہوا)
چاول	دو کھانے کے چمچ (ایک گھنٹہ پہلے بھگو دیں)
چینی	دو کھانے کے چمچ
شہد	دو کھانے کے چمچ
الائچی پاؤڈر	آدھا کھانے کا چمچ
دودھ	تین کپ
ناریل	سجاوٹ کے لیے (باریک کٹا ہوا)

ترکیب:

ایک پتیلی میں دودھ ابال لیں۔ اب دودھ میں چاول اور الائچی ڈال دیں اور چاول گلنے تک پکائیں۔ اس کے بعد چینی، شہد اور ناریل شامل کر کے مزید پکائیں۔ گاڑھا ہو جانے پر کھیر کو چولہے سے اتار لیں۔ باؤل میں نکال کر ناریل اور الائچی دانے سے گارنش کریں۔ ☆☆☆